انسان شناسی

محمود رجبی

مترجم: سید محمد عباس رضوی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

15006
ACC No. 10645 Date 12/11/08
Section ..... Status .....
D.D. Class .....
KASAFI BOOK LIBRARY

بسم اللہ الرحمن الرحیم

”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے“

قال رسول اللهﷺ: "إنی تارک فیکم الثقلین، کتاب اللہ، وعترتی أهل بیتی ما إن تمسکتم بهما لن تضلّوا أبداً وإنّهما لن یفترقا حتّیٰ یردا علیَّ الحوض".

حضرت رسول اکرمﷺ نے فرمایا: "میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں: (ایک) کتاب خدا اور (دوسری) میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں اگر تم ان سے متمسک رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہونچیں گے"۔

(صحیح مسلم: ۱۲۲/۷، سنن دارمی: ۴۳۲/۲، مسند احمد: ج ۳، ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹/۴، ۳۶۶ و ۳۷۱، ۱۸۲/۵، اور ۱۸۹، مستدرک حاکم: ۱۰۹/۳، ۱۴۸، ۵۳۳. وغیرہ.)

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

انسان شناسی

انسان شناسی

محمود رجبی

مترجم: سید محمد عباس رضوی اعظمی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

رجبی، محمود، ۱۳۳۰ -
انسان‌شناسی / محمود رجبی؛ مترجم محمد عباس رضوی؛ مصحح مرغوب عالم عسکری، -- قم: مجمع جهانی اهل بیت (ع)، ۱۳۸۵.
۳۱۰ ص .
ISBN 964-529-071-6

فهرست‌نویسی بر اساس اطلاعات فیپا .
عنوان اصلی: انسان‌شناسی،
اردو.
۱. انسان (اسلام). ۲. انسان (دین). ۳. انسان‌شناسی فلسفی،
الف. رضوی اعظمی، محمد عباس، مترجم، ب. عسکری، مرغوب عالم،
مصحح. ج. عنوان.
BP ۲۲۶/۲/ر۲الف۸،۴۶ ۲۹۷/۴۶۶
۱۳۸۵
کتابخانه ملی ایران ۸۵-۳۳۰۶م

نام کتاب: انسان شناسی
مولف: حجۃ الاسلام والمسلمین محمود رجبی
مترجم: سید محمد عباس رضوی اعظمی
مصحح: مرغوب عالم عسکری
نظر ثانی: سید شجاعت حسین رضوی
پیشکش: معاونت فرہنگی، ادارۂ ترجمہ
کمپوزنگ: smohdabbasrizvi@yahoo.com
ناشر: مجمع جہانی اہل بیت (ع)
طبع اول: سنہ ۱۴۲۷ھ سنہ ۲۰۰۶ء
تعداد: ۳۰۰۰
مطبع: اعتماد
ISBN:964-529-071-6
WWW.ahl-ul-bayt.org
info@ahl-ul-bayt.org

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت وظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ وکلیاں رنگ ونکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ وراہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت وقابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ ومؤسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفیؐ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق وحقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران وروم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت وعمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل وآگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھو دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان ومذاہب اور تہذیب وروایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگر چہ رسول اسلامؐ کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت وپاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے سے پیچیدگیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردی گئی تھی، پھر بھی حکومت وسیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء ودانشور دنیائے اسلام کو پیش کئے جنھوں نے بیرونی افکار ونظریات سے متاثر، اسلام وقرآن مخالف فکری ونظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام وقرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام

کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب وکامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر واشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل وشعور کو جذب کرنے والے افکار ونظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیتؑ کونسل) مجمع جہانی بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تا کہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن وعترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق ومعنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان وولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل وخرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیتؑ عصمت وطہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ ورسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدوخال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب وثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن ونجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی وتحقیقی کوششوں کے لئے محققین ومصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج واشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، حجۃ الاسلام والمسلمین عالیجناب مولانا محمود رجبی صاحب کی گرانقدر کتاب ''انسان شناسی'' کو فاضل جلیل مولانا سید محمد عباس رضوی اعظمی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، نیز ہم اپنے ان تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست مطالب

حرف اول.....۷

فہرست.....۹

مقدمہ.....۱۸

پہلی فصل: مفہوم انسان شناسی

۱۔انسان شناسی کی تعریف.....۲۷

۲۔انسان شناسی کے اقسام.....۲۸

تجربی، عرفانی، فلسفی اور دینی انسان شناسی.....۲۸

انسان شناسی خرد و کلاں.....۳۰

۳.انسان شناسی کی ضرورت و اہمیت.....۳۱

الف) انسان شناسی، بشری تفکر کے دائرہ میں.....۳۲

باہدف زندگی کی تلاش.....۳۲

اجتماعی نظام کا عقلی ہونا.....۳۳

علوم انسانی کی اہمیت اور پیدائش.....۳۳

اجتماعی تحقیقات اور علوم انسانی کی تحصیل.....۳۴

ب) انسان شناسی، معارف دینی کے آئینہ میں.....۳۵

خداشناسی اور انسان شناسی.....۳۵

نبوت اور انسان شناسی.....۳۷

معاداورانسان شناسی.....۳۸

اُنسان شناسی اوراحکام اجتماعی کی وضاحت.....۳۹

۴.دورحاضرمیں انسان شناسی کا بحران اوراس کے مختلف پہلو.....۴۰

الف)علوم نظری کی آپس میں ناہماہنگی اوردرونی نظم وضبط کانہ ہونا.....۴۲

ب)فائدہ منداورقابل قبول دلیل کانہ ہونا.....۴۳

ج)انسان کے ماضی اور مستقبل کا خیال نہ کرنا.....۴۳

د)انسان کے اہم ترین حوادث کی وضاحت سے عاجز ہونا.....۴۴

۵۔دینی انسان شناسی کی خصوصیات.....۴۵

جامعیت.....۴۵

استواراورمحکم.....۴۵

مبدااورمعادکاتصور.....۴۶

بنیادی فکر.....۴۶

خلاصہ فصل.....۴۷

تمرین.....۴۸

مزیدمطالعہ کے لئے.....۴۹

دوسری فصل: اومانیزم یاعقیدۂ انسان

اومانیزم کامفہوم ومعنی.....۵۳

اومانیزم کی پیدائش کے اسباب.....۵۵

اومانیزم کے اجزاءترکیبی اورنتائج.....۵۶

عقل پرستی اورتجربہ گرائی.....۵۷

استقلال.....۵۸
تساہل وتسامح.....۵۹
سکولریزم.....۶۰
امانیزم کے نظریہ پر تنقید و تحقیق.....۶۳
فکر وعمل میں تناقض.....۶۳
فکری حمایت کا فقدان.....۶۴
فطرت اور مادہ پرستی.....۶۶
اومانیزم اور دینی تفکر.....۶۷
بے قید وشرط آزادی.....۶۹
تسامح وتساہل.....۷۱
خلاصہ فصل.....۷۳
تمرین.....۷۴
مزید مطالعہ کے لئے.....۷۴
ملحقات.....۷۶

تیسری فصل: خود فراموشی

مفہوم بے توجہی.....۸۰
قرآن اور خود فراموشی کا مسئلہ.....۸۴
خود فراموشی کے نتائج.....۸۷
غیر کو اصل قرار دینا.....۸۷
روحی تعادل کا درہم برہم ہونا.....۸۹

ہدف اور معیار کا نہ ہونا.....۹۱
حالات کی تبدیلی کے لئے آمادگی اور قدرت کا نہ ہونا.....۹۱
مادہ اور مادیات کی حقیقت.....۹۳
خودفراموشی اور توحید حقیقی.....۹۶
اجتماعی اور سماجی بے توجہی (اجتماعی حقیقت کا فقدان).....۹۷
خودفراموشی کا علاج.....۹۹
خلاصہ فصل.....۱۰۳
تمرین.....۱۰۴
مزید مطالعہ کے لئے.....۱۰۶
ملحقات.....۱۰۷

چوتھی فصل: انسان کی خلقت

انسان، دوبعدی مخلوق.....۱۱۳
اولین انسان کی خلقت.....۱۱۳
قرآن کے بیانات اور ڈارون کا نظریہ.....۱۱۷
تمام انسانوں کی خلقت.....۱۲۱
روح کا وجود اور استقلال.....۱۲۶
روح کے اثبات میں بشری معرفت اور دینی نظریہ میں ہماہنگی.....۱۳۱
الف) عقلی دلائل.....۱۳۲
شخصیت کی حقیقت.....۱۳۲
روح کا ناقابل تقسیم ہونا اور اس کے حوادث.....۱۳۳

مکان سے بے نیاز ہونا..... ۱۳۳
کبیر کا صغیر پر انطباق..... ۱۳۴
ب) تجربی شواہد..... ۱۳۴
روح مجرد اور انسان کی واقعی حقیقت..... ۱۳۷
خلاصہ فصل..... ۱۳۸
تمرین..... ۱۳۹
مزید مطالعہ کے لئے..... ۱۴۰

پانچویں فصل: انسان کی فطرت

انسان کی مشترکہ فطرت..... ۱۴۵
مشترکہ فطرت سے مراد..... ۱۴۶
مشترکہ فطرت کی خصوصیات..... ۱۴۸
ماحول اور اجتماعی اسباب کا کردار..... ۱۴۹
انسانی مشترکہ فطرت پر دلائل..... ۱۴۹
فطرت..... ۱۵۳
بعض مشترکہ فطری عناصر کا پوشیدہ ہونا..... ۱۵۴
انسان کی فطرت کا اچھا یا برا ہونا..... ۱۵۶
انسان کی الٰہی فطرت سے مراد..... ۱۵۹
فطرت کا زوال ناپذیر ہونا..... ۱۶۲
فطرت اور حقیقت..... ۱۶۳
خلاصہ فصل..... ۱۶۶

تمرین.....۱۶۷
مزید مطالعہ کے لئے.....۱۶۸
ملحقات.....۱۷۰

چھٹی فصل: نظام خلقت میں انسان کا مقام

خلافت الٰہی.....۱۸۱
خلافت کے لئے حضرت آدمؑ کے شائستہ ہونے کا معیار.....۱۸۳
حضرت آدمؑ کے فرزندوں کی خلافت.....۱۸۴
کرامت انسان.....۱۸۵
کرامت ذاتی.....۱۸۷
کرامت اکتسابی.....۱۸۸
الف) کرامت اکتسابی کی نفی کرنے والی آیات.....۱۸۸
ب) کرامت اکتسابی کو ثابت کرنے والی آیات.....۱۹۰
خلاصہ فصل.....۱۹۳
تمرین.....۱۹۵
مزید مطالعہ.....۱۹۶

ساتویں فصل: آزادی واختیار

انسان کی آزادی کے سلسلہ میں تین مہم نظریات.....۱۹۹
مفہوم اختیار.....۲۰۳
انسان کے مختار ہونے پر قرآنی دلیلیں.....۲۰۶

عقیدۂ جبر کے شبہات ۲۰۸
الف) جبر الٰہی ۲۰۸
جبر الٰہی کی تجزیہ و تحلیل ۲۱۰
خدا کے فعال ہونے کا راز ۲۱۳
ب) اجتماعی اور تاریخی جبر ۲۱۵
اجتماعی اور تاریخی جبر کی تجزیہ و تحلیل ۲۱۷
ج) فطری اور طبیعی جبر ۲۱۷
فطری اور طبیعی جبر کی تجزیہ و تحلیل ۲۲۰
خلاصہ فصل ۲۲۱
تمرین ۲۲۳
مزید مطالعہ کے لئے ۲۲۵
ملحقات ۲۲۷

آٹھویں فصل: مقدمات اختیار

اختیار کو مہیا کرنے والے عناصر ۲۳۷
معرفت ۲۳۷
انسان کے امکانات اور ضروری معرفت ۲۳۸
خواہش اور ارادہ ۲۴۶
خواہشات کی تقسیم بندی ۲۴۷
غرائز ۲۴۷
عواطف ۲۴۷

انفعالات.....۲۴۷
احساسات.....۲۴۸
خواہشات کا انتخاب.....۲۴۹
خواہشات کے انتخاب کا معیار.....۲۵۵
آخرت کی لذتوں کی خصوصیات.....۲۵۷
۱۔ پایداری اور ہمیشگی.....۲۵۸
۲۔ اخلاص اور رنج والم سے نجات.....۲۵۸
۳۔ وسعت وفراوانی.....۲۵۹
۴۔ مخصوص کمالات اور لذتیں.....۲۵۹
قدرت.....۲۶۰
خلاصہ فصل.....۲۶۲
تمرین.....۲۶۳
مزید مطالعہ کے لئے.....۲۶۴

نویں فصل: کمال نہائی

مفہوم کمال اور انسانی معیار کمال.....۲۶۷
انسان کا کمال نہائی.....۲۶۸
قرب الٰہی.....۲۷۰
قربت کی حقیقت.....۲۷۱
قرب الٰہی کے حصول کا راستہ.....۲۷۲
تقرب خدا کے درجات.....۲۷۴

ایمان ومقام قرب کا رابطہ.....۲۷۵
خلاصہ فصل.....۲۷۶
تمرین.....۲۷۸
مزید مطالعہ کے لئے.....۲۷۸
ملحقات.....۲۸۰

دسویں فصل: دنیا وآخرت کا رابطہ

قرآن مجید میں کلمۂ دنیا کے مختلف استعمالات.....۲۸۴
دنیا وآخرت کے روابط کے بارے میں پائے جانے والے نظریات کا تجزیہ.....۲۸۵
رابطۂ دنیا اور آخرت کی حقیقت.....۲۹۰
خلاصہ فصل.....۲۹۵
تمرین.....۲۹۶
مزید مطالعہ کے لئے.....۲۹۷
ملحقات.....۲۹۸
۱۔شفاعت.....۲۹۸
۲۔شفاعت کے بارے میں اعتراضات وشبہات.....۲۹۹
فہرست منابع.....۳۰۴
خود آزمائی.....۳۰۹

بسم الله الرحمٰن الرحیم

مقدمہ:

﴿... ثُمَّ أنشأناهُ خَلقاً آخَرَ فتبارک اللّهُ أحسَنُ الخَالِقِينَ﴾(۱)

پھر ہم نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا پس بابرکت ہے وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔

انسان بہت سے انتخابی عمل کا سامنا کرتا ہے جس میں سے فقط بعض کو انتخاب کرتا ہے، بعض کو دیکھتا ہے، بعض کے بارے میں سنتا ہے اور اپنے ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضاء کو بعض کاموں کی انجام دہی میں استعمال کرتا ہے، قوت جسمانی کی رشد کے ساتھ ساتھ فکری، عاطفی اور بہت سے مخلوط و مختلف اجتماعی روابط، علمی ذخائر اور عملی مہارتوں میں اضافہ کی وجہ سے انتخابی دائرے صعودی شکل میں اس طرح وسیع ہو جاتے ہیں کہ ہر لمحہ ہزاروں امور کا انجام دینا ممکن ہوتا ہے لہٰذا انتخاب کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

.....

(۱) سورۂ مومنون/۱۴

طریقہ کار کی تعین وترجیح کے لئے مختلف ذرائع موجود ہیں مثلاً فطری رشد، خواہشات کی شدت، نا امنی کا احساس، عادات واطوار، پیروی کرنا، سمجھانا اور دوسرے روحی واجتماعی اسباب کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے لیکن سب سے مہم عقلی اسباب ہیں جو سبھی طریقۂ کار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک کی معراج کمال اور انسانی سعادت کے لئے موثر اور مہم طریقۂ کار کی تعیین وترجیح اور سب سے بہتر واہم انتخاب کے لئے درکار ہیں جو انسانی ارادہ کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان کی حقیقی اشرفیت اور برتری کے راز کو انہیں اسباب وعلل اور طریقۂ کار کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیئے۔

اعمال کی اہمیت اور ان کا صحیح انتخاب اس طرح کہ انسان کی دنیا وآخرت کی خوشبختی کا ذمہ دار ہو، معیار اہمیت کی شناخت پر موقوف ہے، ان معیار کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے حقیقت انسان، کیفیت وجود، آغاز و انجام اور کمال و سعادت اخروی کو سمجھا جائے۔ یہ موضوع ایک دوسرے زاویۂ فکر کا محتاج ہے جس کو انسان شناسی کہا جاتا ہے۔

لہٰذا انسان شناسی کو معارف انسانی کی سب سے بنیادی چیز سمجھنا چاہیئے اور اس کا مطالعہ خاص کر ان افراد کے لئے جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی درست و بے نقص اور عقلی معیار پر استوار ہو ضروری ہے۔

اس کتاب میں انسان شناسی کے بنیادی مسائل کی تحقیق پیش کی جائے گی۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ انسان کی حقیقی شخصیت کی شناخت، اس کی پیدائش کا ہدف اور اس ہدف تک رسائی کی کیفیت، قرآنی تعلیمات، اسلامی دستورات اور عقلی تجزیہ وتحلیل پر موقوف ہے، لہٰذا کتاب کے اکثر مباحث میں انسان شناسی کے نظریات کو قرآن کریم اور دین اسلام کے تعلیمات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلے تو یہ کتاب بالمشافہہ تدریس کیلئے مرتب کی گئی تھی لیکن ان افراد کی بہت سی درخواستوں کی وجہ سے جو معارف اسلامی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ''موسسۂ (اکیڈمی) آموزش وپژوہش امام خمینی''

کے پروگرام میں شرائط ومشکلات کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا ان کے لئے ایک خصوصی پروگرام ''تدریس از راہ دور'' (۱) تصویب کیا گیا جس میں نقش ونگار سے استفادہ کرتے ہوئے اس کے معانی ومفاہیم کو غیر حضوری شکل میں اور نہایت ہی مناسب انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

آپ ابتداء مطالعہ ہی سے ایک تعلیمی پروگرام کے شروع ہو جانے کا احساس کریں گے اور رہنمائیوں کو اپنے لئے رہنما وراہبر محسوس کریں گے، یہ راہنمائیاں مؤلف اور قاری کے درمیان گفتگو اور مکالمہ کی شکل میں ڈھالی گئی ہیں جو کتاب کے مطالب کو درست ودقیق اور مؤثر انداز میں حاصل کرنے کی ہدایت کرتی ہیں، البتہ بہتر نتیجہ آپ کے مطالعہ پر موقوف ہے۔ ابتدا ہی میں پوری کتاب کے مطالب کو نموداری شکل میں پیش کیا گیا ہے تا کہ کتاب کے بنیادی مطالب کا خاکہ اور ہر بحث کی جایگاہ مشخص ہو جائے اور کتاب کے مطالعہ میں رہنمائی کے فرائض انجام دے۔ ہر فصل کے مطالب خود اس فصل سے مربوط تعلیمی اہداف سے آغاز ہوتے ہیں، ہر فصل کے مطالعہ کے بعد اتنی فہم وتوانائی کی ہمیں امید ہے کہ جس سے ان اہداف کو حاصل کیا جا سکے نیز ان رہنمائیوں کے ساتھ ساتھ یاد گیری کے عنوان سے ہر فصل کے مطالب کو بیان کرنے کے بعد بطور آزمائش سوالات بھی درج کئے گئے ہیں جن کے جوابات سے آپ اپنی توانائی کی مشق اور آزمائش کریں گے، سوالات بنانے میں جان بوجھ کر ایسے مسائل پیش کئے گئے ہیں جو کتاب کے مطالب پر تسلط کے علاوہ آپ کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور حافظہ پر اعتماد کے ساتھ ساتھ مزید غور وفکر کے لئے برانگیختہ کرتے ہیں۔

اسی طرح ہر فصل کے آخر میں اس کا خلاصہ اور مزید مطالعہ کے لئے منابع ذکر کئے گئے ہیں، ہر فصل کے خلاصہ میں مختلف فصلوں کے مطالب کے درمیان ہماہنگی برقرار رکھنے کے لئے آنے والی

.....

(۱) راہ دور سے تعلیمی پروگرام کی تدوین اور اس کے انجام دہی میں ہم ماہرانہ تحقیقات ومطالعات نیز اکیڈمی کے داخلی وبیرونی معاونین ومحققین کی ایک کثیر تعداد کی شب وروز کوشش وتلاش، ہمت اور لگن سے بہرہ مند تھے اور ہم ان تمام دوستوں کے خصوصاً ''پیام نور'' یونیورسٹی کے جن دوستوں نے ہماری معاونت کی ہے شکر گذار ہیں۔

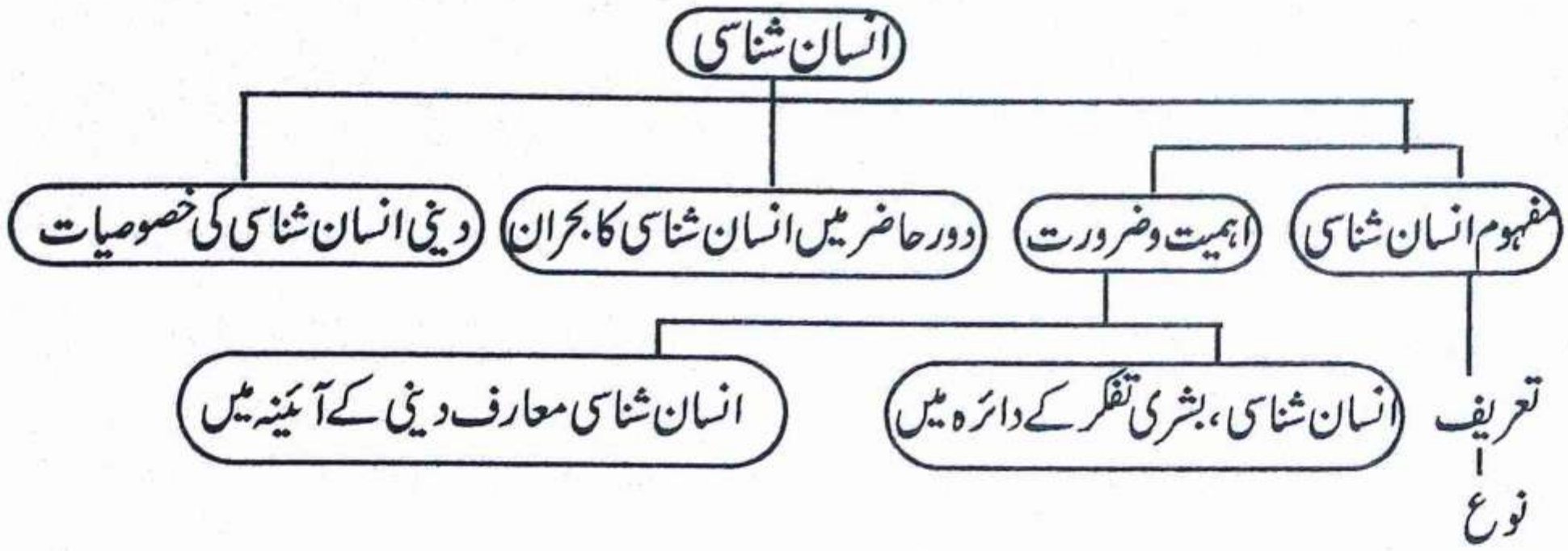
فصل کے بعض مباحث کو کتاب کے کلی مطالب سے ربط دیا گیا ہے۔کتاب کے آخر میں ایک ''آزمائش'' بھی ہے جس میں کلی مطالب ذکر کئے گئے ہیں تا کہ متن کتاب سے کئے گئے سوالات کے جوابات سے اپنی فہم کی مقدار کا اندازہ لگایا جا سکے۔چنانچہ اگر کتاب کے کسی موضوع کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہر فصل کے آخر میں مطالعہ کے لئے بیان کی گئی کتابوں سے اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

درک مطالب میں پیش آنے والی مشکلات سے دوچار ہونے کی صورت میں اپنے سوالات کو مؤسسہ کے ''تدریس از راہ دور'' کے شعبہ میں ارسال کر کے جوابات دریافت کر سکتے ہیں، اسلوب بیان کی روش میں اصلاح کیلئے آپ کی رائے اور اظہار نظر کے مشتاق ہیں، اللہ آپکی توفیقات میں مزید اضافہ کرے۔

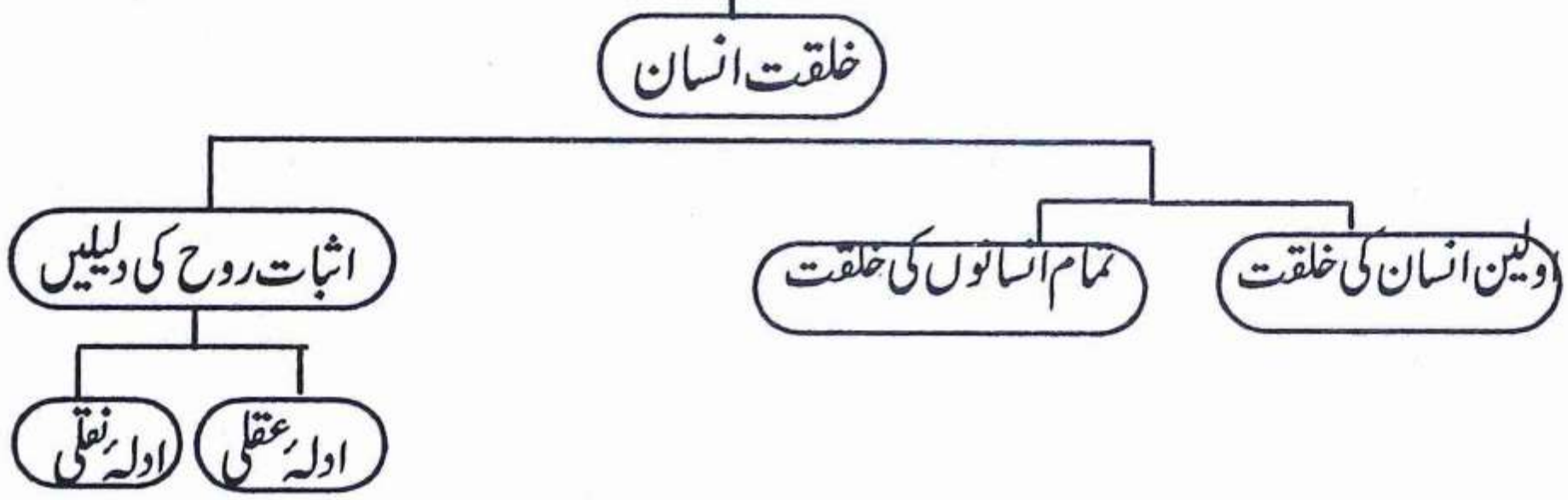
موسسۂ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ

مطالعہ کتاب کی کامل رہنمائی

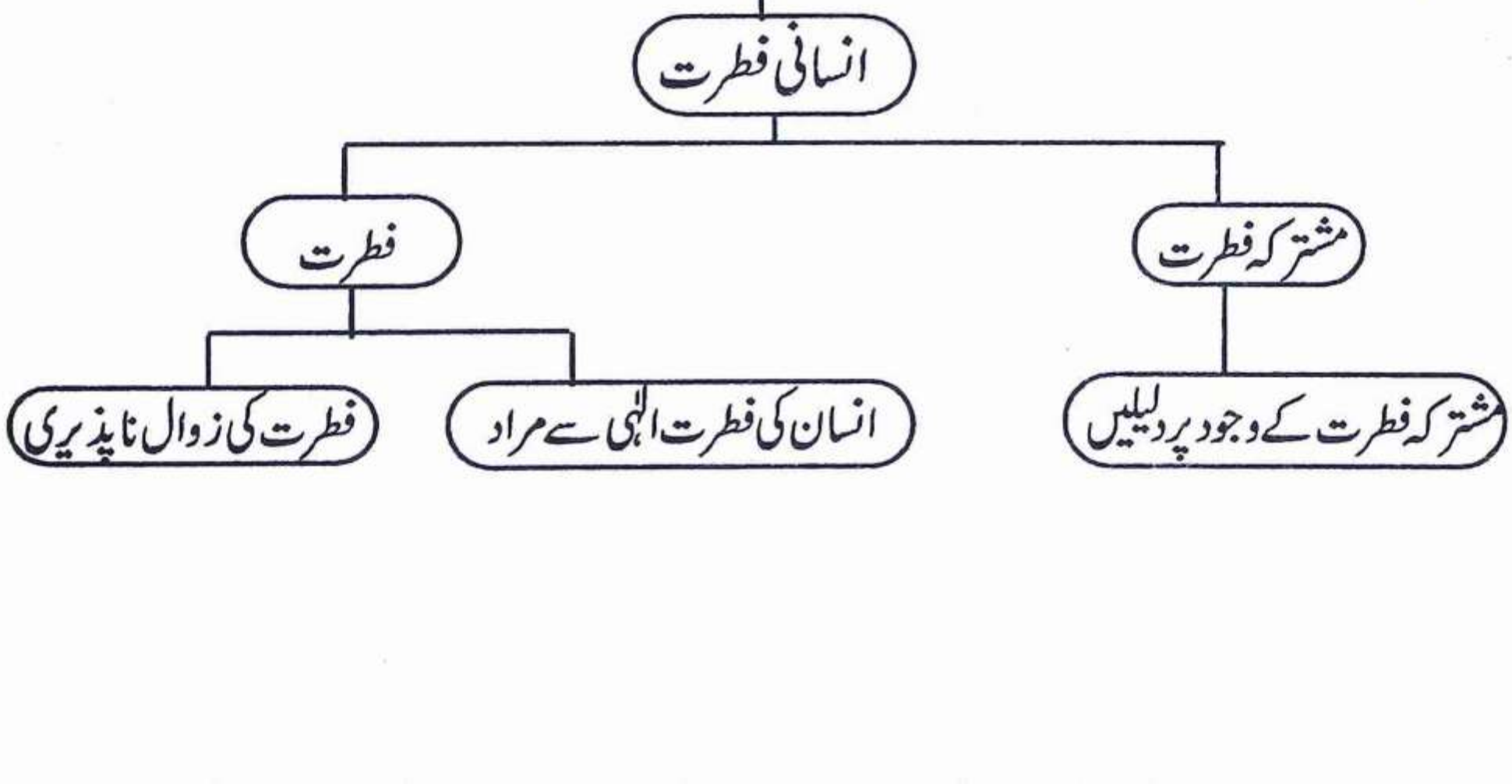
فصل ۱



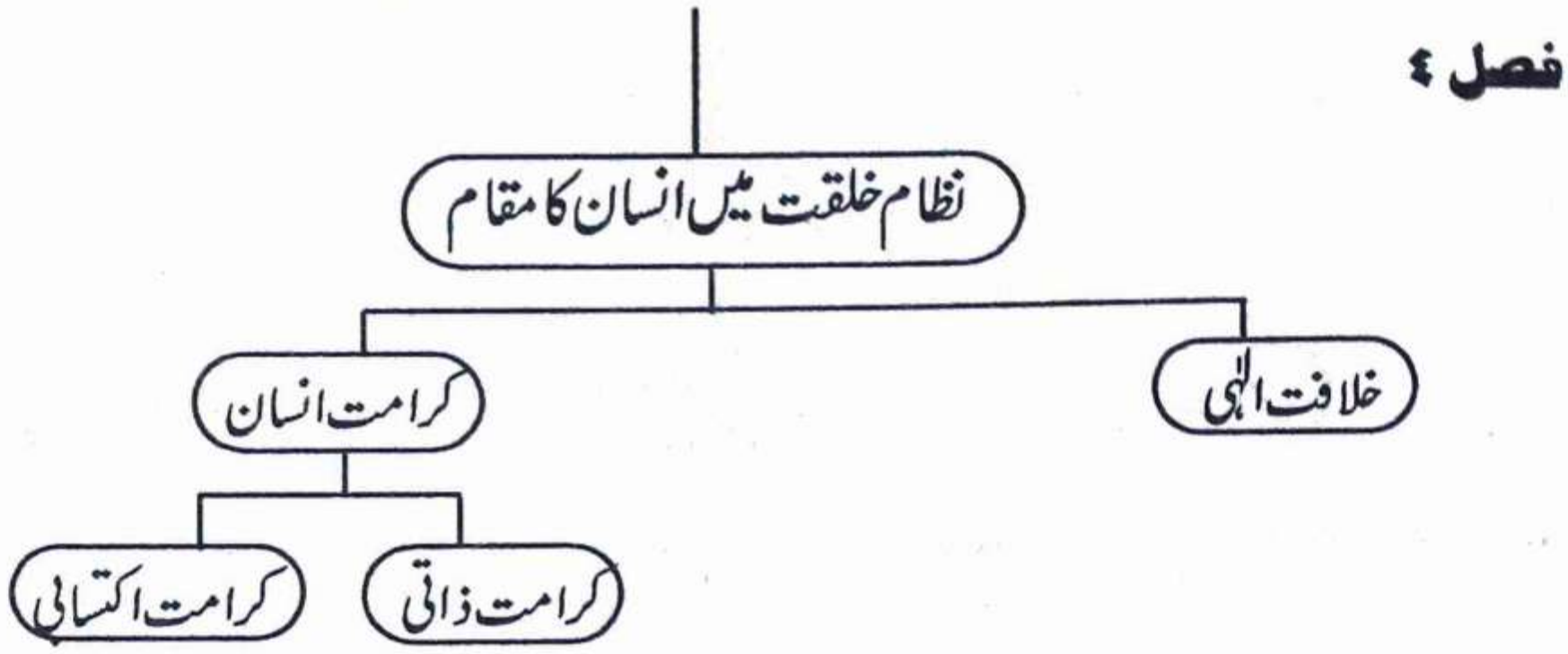
فصل ۲



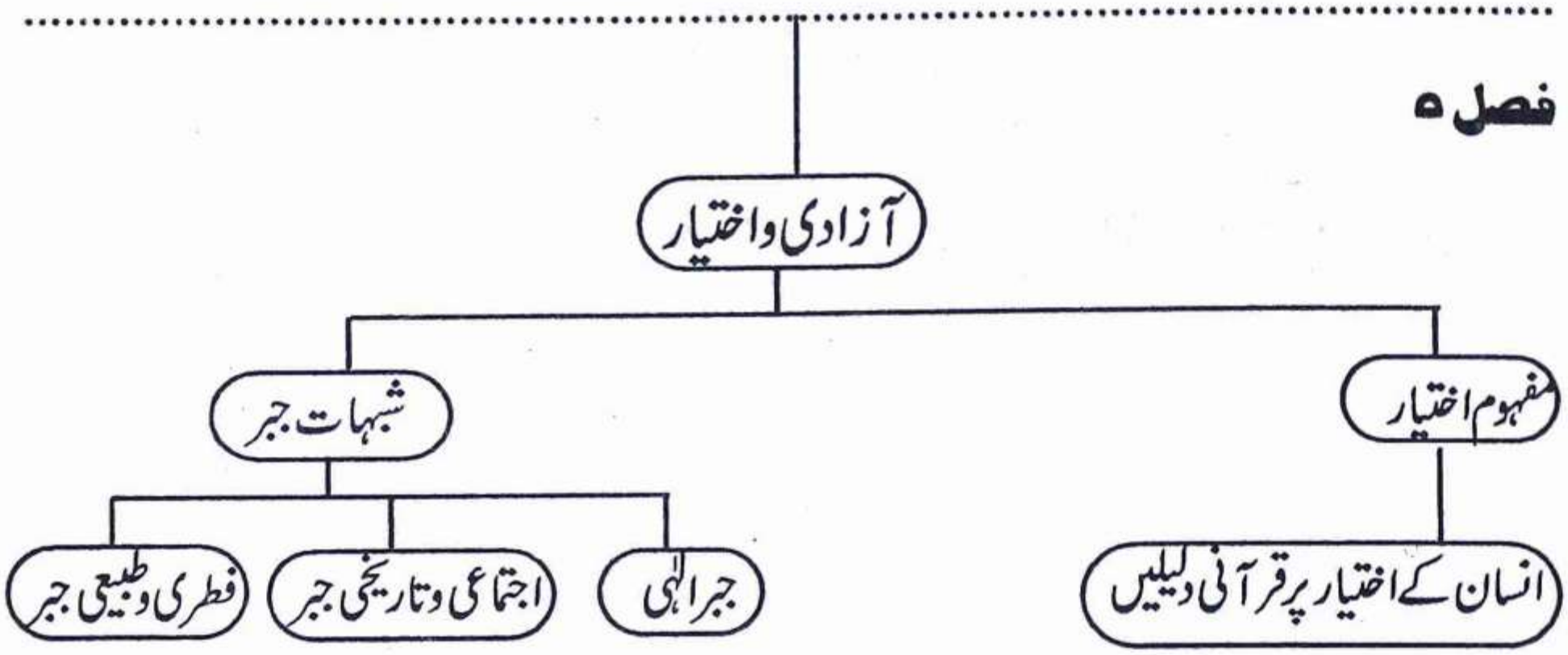
فصل ۳



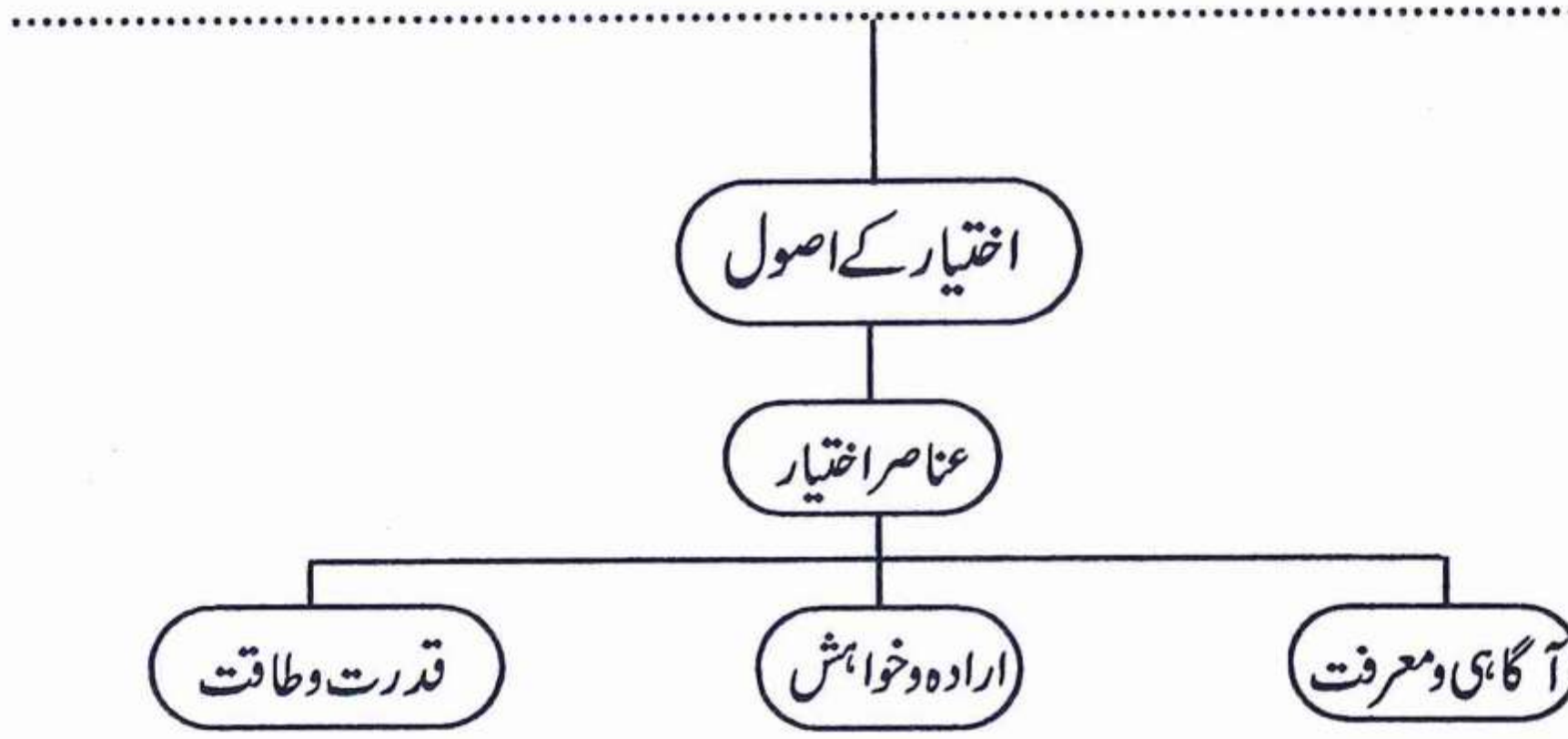
فصل ٤



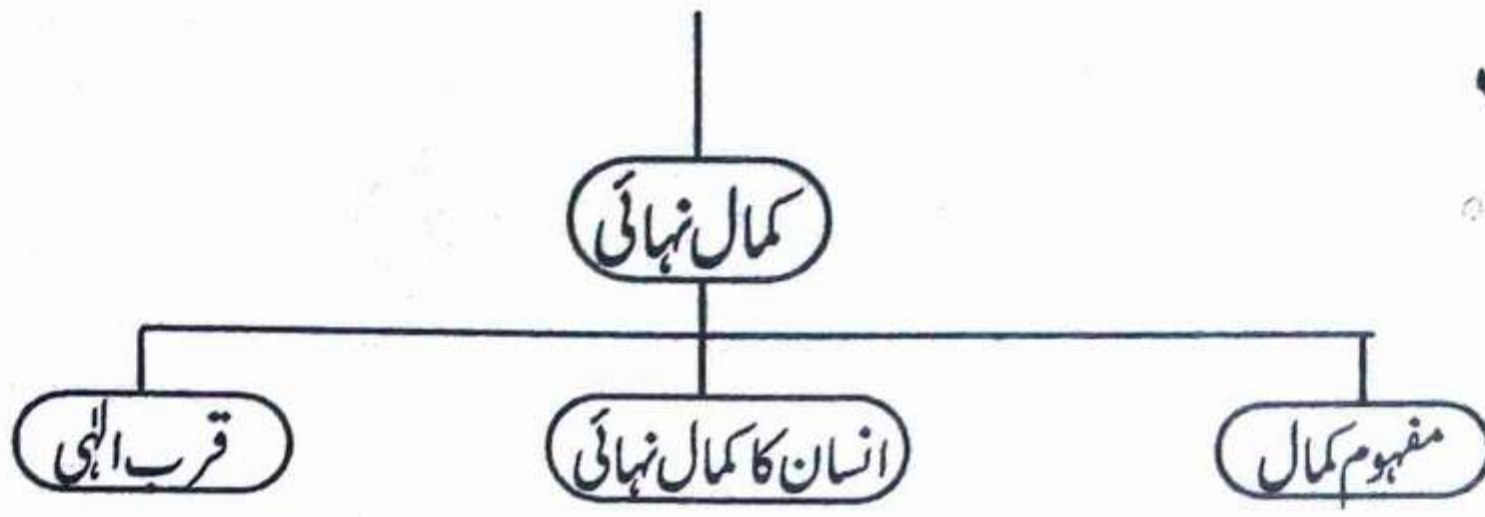
فصل ٥



فصل ٦



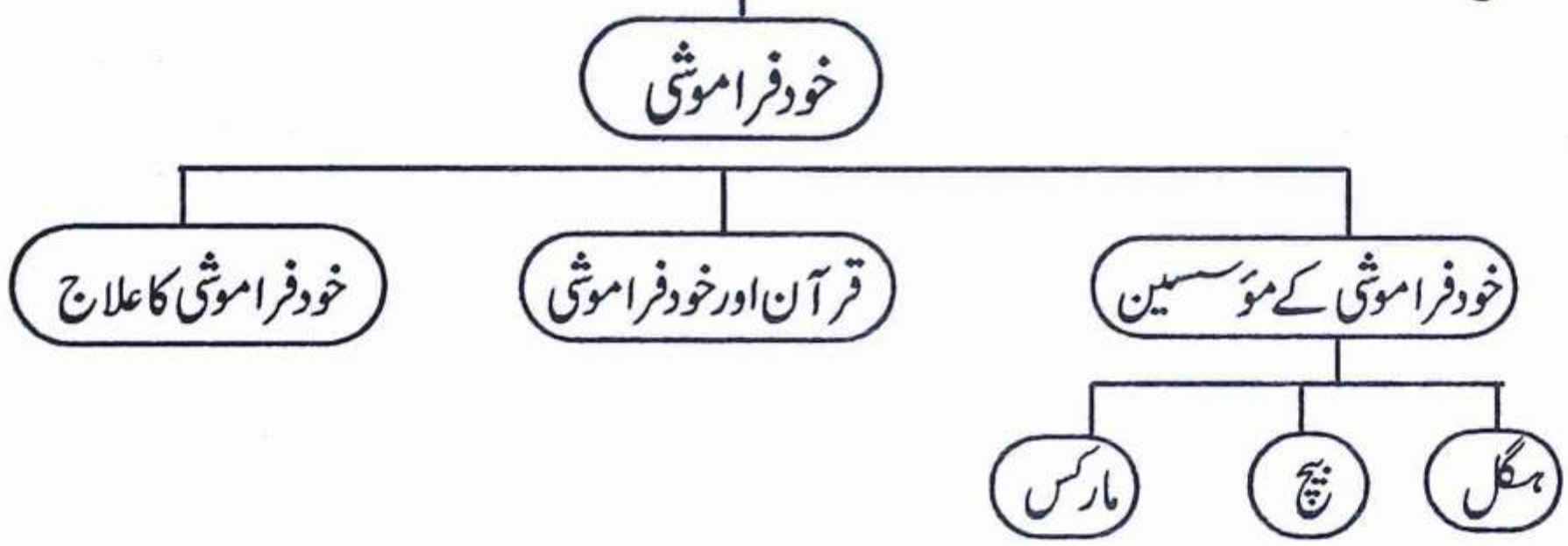
فصل ۷



فصل ۸



فصل ۹



۱

مفہوم انسان شناسی

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات:

۱۔ ''انسان شناسی'' کی تعریف اور اس کے اقسام کو بیان کریں؟

۲۔ جملۂ ''انسان شناسی؛ فکر بشر کے آئینہ میں'' کی وضاحت کریں؟

۳۔ معرفت خدا، نبوت و معاد کا انسان شناسی سے کیا رابطہ ہے دو سطروں میں بیان کریں؟

۴۔ انسان شناسی ''کل نگر'' و ''جزء نگر'' کے موضوعات کی مثالوں کو ذکر کریں؟

۵۔ خودشناسی سے کیا مراد ہے اور اس کا دینی انسان شناسی سے کیا رابطہ ہے بیان کریں؟

۶۔ ''دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران'' میں سے چار محور کی وضاحت کریں؟

خدا، انسان اور دنیا فکر بشر کے تین بنیادی مسائل ہیں جن کے بارے میں پوری تاریخ بشر کے ہر دور میں ہمیشہ بنیادی، فکری اور عقلی سوالات ہوتے رہتے ہیں اور فکر بشر کی ساری کوششیں انہی تین بنیادی چیزوں پر متمرکز اور ان سے مربوط سوالات کے صحیح جوابات کی تلاش میں ہیں۔

بہر حال انسان کی معرفت، اس کے مشکلات کا حل نیز اس کے پوشیدہ اسرار، کافی اہمیت کے حامل ہیں، جس نے بہت سے دانشمندوں کو اپنے مختلف علوم کے شعبوں میں مشغول کر رکھا ہے۔(۱) مذاہب آسمانی کی تعلیمات میں (خصوصاً اسلام میں) معرفت خدا کے مسئلہ کے بعد معرفت انسان سب سے اہم مسئلہ مانا جاتا ہے، دنیا کا خلق کرنا، پیغمبروں کو مبعوث کرنا، آسمانی کتابوں کا نزول درحقیقت آخرت میں انسان کی خوشبختی کے لئے انجام دیا گیا ہے اگر چہ قرآن کی روشنی میں سبھی چیزیں خدا کی مخلوق ہیں اور کوئی بھی شئی اس کے مقابلہ میں نہیں ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی روشنی میں اس کائنات کو ایک ایسے دائرے سے کہ جس کے دو نقطہ ہوں تعبیر کیا گیا ہے جس کی حقیقی نسبت کا ایک سرا اوپر (اللہ) ہے اور دوسرا سرا نیچے (انسان) کی طرف ہے (۲) اور انسان بھی ایک عرصۂ دراز سے، اپنے وسیع تجربے کے ذریعہ اسی نسبت کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جب

---

(۱) منجملہ علوم جو انسان اور اس کے اسرار و رموز کی تحلیل و تحقیق کرتے ہیں جیسے علوم انسانی تجربی اور دیگر فلسفے جیسے علم النفس، فلسفہ خودشناسی، فلسفہ اخلاق، فلسفہ عرفان، فلسفہ اخلاق، فلسفہ اجتماعی، فلسفۂ علوم اجتماعی، فلسفہ تاریخ و حقوق وغیرہ

(۲) ایزوتسو، ٹوشی ہیکو، قرآن میں خدا و انسان، ترجمہ احمد آرام، ص ۹۲۔

کہ انسان شناسی کے ماہرین نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ انسان کی معرفت کے اسباب ووسائل، پوری طرح سے انسان کی حقیقت اوراس کے وجودی گوشوں کے حوالے سے مہم سوالات کا جواب نہیں دے سکتے ہیں لہٰذا آج انسان کوایساوجود جس کی شناخت نہ ہوسکی ہو یا انسان کی معرفت کا بحران وغیرہ جیسے الفاظ سے یادکیا جانے لگا۔

مذکورہ دوحقیقتوں میں غوروفکر ہمیں مندرجہ ذیل چار سوالات سے روبروکرتا ہے:

۱۔انسان کے بارے میں کئے گئے بنیادی سوال کون سے ہیں اور انسان کی معرفت میں کیسی کوششیں ہونی چاہیئے اوران سوالات کے لئے مناسب جوابات تک رسائی کیسے ممکن ہے؟

۲۔انسان کی معرفت میں بشر کی مسلسل حقیقی تلاش کا سبب کیا ہے؟ اورکیا دوسرے بہت سے اسباب کی طرح فطری جستجو کا وجود ہی ان تمام کوششوں کی وضاحت وتحلیل کے لئے کافی ہے؟ یا دوسرے اسباب وعلل کی بھی جستجوضروری ہے یا انسان کی معرفت کے اہم مسائل اوراس کی دنیوی و اخروی زندگی نیز علمی ودینی امور میں گہرے اورشدید رابطوں کو بیان کرنا ضروری ہے؟

۳۔دورحاضر میں انسان شناسی کے بحران سے کیامراد ہے اوراس بحران کے انشعابات کیاہیں؟

۴۔دورحاضر میں انسان شناسی کے بحران سے نجات کے لئے کیا کوئی بنیادی حل موجود ہے؟ دین اوردینی انسان شناسی کااس میں کیا کردار ہے؟

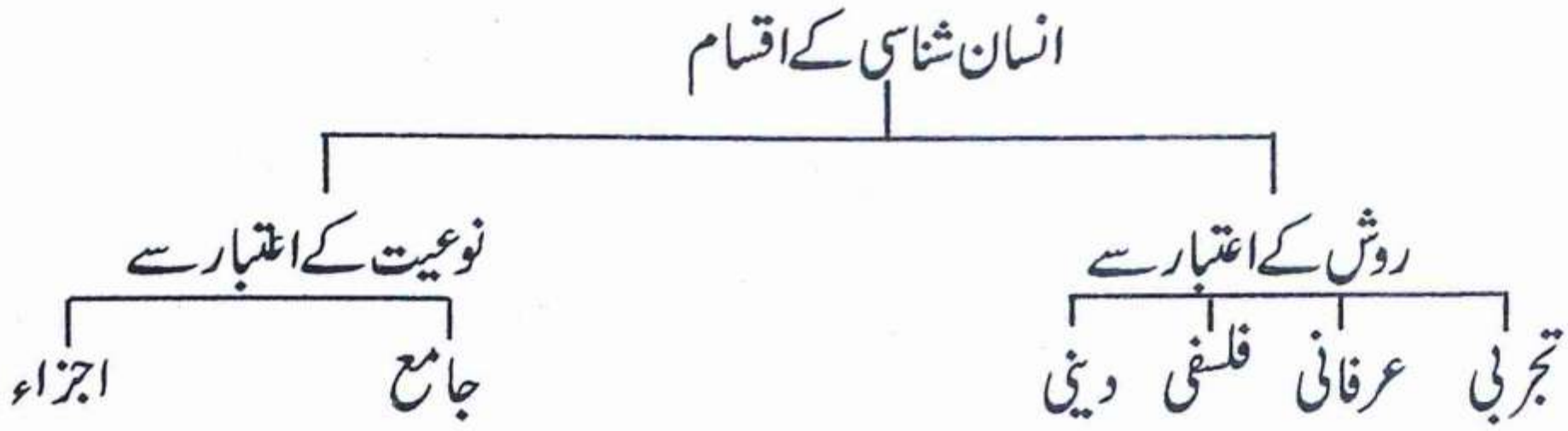
مذکورہ سوالات کے مناسب جوابات حاصل کرنے کے لئے اس فصل میں انسان شناسی کے مفہوم کی تحقیق اوراس کے اقسام، انسان شناسی کی ضرورت اوراہمیت، انسان شناسی کے بحران اوراس کے اسباب نیز دینی انسان شناسی کی خصوصیات کے بارے میں ہم گفتگوکریں گے۔

۱۔انسان شناسی کی تعریف

ہروہ منظومہ معرفت جوکسی شخص، گروپ یا طبقہ کا کسی زاویہ سے جائزہ لیتی ہے اس کوانسان شناسی کہا جاسکتا ہے، انسان شناسی کی مختلف اورطرح طرح کی قسمیں ہیں کہ جس کا امتیاز ایک

دوسرے سے یہ ہے کہ اس کی روش یا زاویہ نگاہ مختلف ہے، اس مقولہ کو انسان شناسی کی روش کے اعتبار سے تجربی، عرفانی، فلسفی اور دینی میں اور انسان شناسی کی نوعیت کے اعتبار سے کلی اور جزئی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ روش اور نوعیت کے اعتبار سے انسان شناسی کے اقسام



۲۔ انسان شناسی کے اقسام

تجربی، عرفانی، فلسفی اور دینی

متفکرین نے انسان کے سلسلہ میں کئے گئے سوالات اور معموں کو حل کرنے کے لئے پوری تاریخ انسانی میں مختلف طریقہ کار کا سہارا لیا ہے، بعض لوگوں نے تجربی روش سے مسئلہ کی تحقیق کی ہے اور ''انسان شناسی تجربی'' (۱) کی بنیاد رکھی جس کے دامن میں انسانی علوم کے سبھی مباحث موجود ہیں۔ (۲)

.....

(۱) انسان شناسی تجربی کو انسان شناسی Anthropology کے مفہوم سے مخلوط نہیں کرنا چاہیئے، جیسا کہ متن درس میں اشارہ ہو چکا ہے، انسان شناسی تجربی، علوم انسانی کے تمام موضوعات منجملہ Anthropology کو بھی شامل ہے، گرچہ پوری تاریخ بشر میں مختلف استعمالات موجود ہیں، لیکن دور حاضر میں علمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں اس کے رائج معانی علوم اجتماعی کے یا علوم انسانی تجربی کے موضوعات میں سے ہے جس میں انسان کی تخلیق کا سبب، جمعیت کی وسعت اور اس کی پراکندگی، انسانوں کی درجہ بندی، قوموں کا ملاپ، ماحول و مادی خصوصیات اور اجتماعی و سماجی موضوعات، نیز روابط جیسے مسائل کو تجربہ کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ (۲) فارسی میں کلمہ علوم انسانی کبھی کلمہ Humanities اور کبھی کلمہ Social sciences کے مترادف قرار پاتا ہے۔ کلمۂ Humanities کا فارسی معنی علوم انسانی یا . . .

بعض لوگوں نے عرفانی سیر وسلوک اور مشاہدہ کو انسان کی معرفت کا صحیح طریقہ مانا ہے، اور وہ کوششیں جو اس روش سے انجام دی ہیں، اس کے ذریعہ ایک طرح سے انسان کی معرفت کو حاصل کر لیا ہے جسے انسان شناسی عرفانی کہا جا سکتا ہے، دوسرے گروہ نے عقلی اور فلسفی تفکر سے انسان کے وجودی گوشوں کی تحقیق کی ہے اور فکری تلاش کے ماحصل کو انسان شناسی فلسفی کا نام دیا گیا ہے اور آخر کار ایک گروپ نے دینی تعلیمات اور نقل روایت سے استفادہ کرتے ہوئے انسان کی معرفت حاصل کی اور انسان شناسی دینی کی بنیاد رکھی ہے، اس کتاب کی آئندہ بحثوں میں جو منظور نظر ہے وہ دینی تعلیمات اور نقل احادیث کے آئینہ میں انسان کی تحقیق ہے لہٰذا انسان شناسی کے باب میں دینی تعلیمات کو

.....

. . معارف انسانی قرار دینا بہتر ہے، اس کا ابتدائی استعمال ان انگریزی اور یونانی آثار پر ہوتا تھا جو قرون وسطی میں اہل مدرسہ کی خداشناسی کے برخلاف انسانی پہلو رکھتا تھا اور آج ان علوم میں استعمال ہوتا ہے جو انسان کی زندگی، تجربہ رفتار و کردار کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں یہ کلمہ ادبیات، لسان، فلسفہ، تاریخ، ہنر، خداشناسی اور طبیعی و اجتماعی علوم کی موسیقی کے موضوعات کی جدائی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور روش کے اعتبار سے علمی و تجربی روش میں منحصر نہیں ہے، معارف دینی بھی جب فکر بشر کا نتیجہ ہوگی تو اسی دائرہ اختیار میں قرار دی جائیگی، اسی بنا پر دینی معارف کے تفکرات و اعتبارات، خدا کی طرف سے اور فطرت سے بالاتر ذات سے حاصل ہونے کی وجہ سے اس گروہ سے خارج ہیں، کلمۂ Social sciences کا بالکل دقیق مترادف ''علوم اجتماعی تجربی'' ہے اور کبھی انسانی علوم تجربی کا استعمال، طبیعی تجربی علوم کے مد مقابل معنی میں ہوتا ہے، اور جامعہ شناسی، نفسیات شناسی، علوم سیاسی و اقتصادی حتی مدیریت، تربیتی علوم اور علم حقوق کے موضوعات کو بھی شامل ہے۔ اور کبھی اس کے حصار میں جامعہ شناسی، اقتصاد، علوم سیاسی اور انسان شناسی (Anthropology) بھی قرار پاتے ہیں اور اجتماعی نفسیات شناسی، اجتماعی حیات شناسی اجتماعی جغرافیا اور اس کے سرحدی گوشے اور حقوق، فلسفہ اجتماعی، سیاسی نظریات اور طریقہ عمل کے اعتبار سے تاریخی تحقیقات (تاریخ اجتماعی، تاریخ اقتصادی) اس کے مشترکہ موضوعات میں شمار ہوتا ہے۔ رجوع کریں

Kuper Adman The social Sciences Encyclopedia Rotlage and Kogan paul.

و: فرہنگ اندیشہ نو، بولک بارس وغیرہ، ترجمہ پاشائی و نیز:

Theodorson George, A modern Dictionary of Social Sciences .

ہم آئندہ مباحث میں محور قرار دیں گے اگر چہ انسان شناسی فلسفی، تجربی اور عرفانی معلومات بھی بعض جگہوں پر وضاحت اور انسان شناسی دینی میں ان کا تقابل اور ہماہنگی کے بارے میں گفتگو کی جائیگی، لہٰذا انسان شناسی میں ہماری روش، نقل روایت اور ایک طرح سے تعبدی یا تعلیمات وحی کی روش ہوگی۔(۱)

انسان شناسی خرد وکلاں یا جامع واجزاء

انسان کے بارے میں پوری گفتگو اور انجام دی گئی تحقیق کو دو عام گروہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؛ کبھی انسان کی تحقیق میں کسی خاص شخص، کوئی مخصوص گروہ، یا کسی خاص زمان ومکان کو پیش نظر رکھ کر افراد کے سلسلہ میں مفکرین نے سوال اٹھائے ہیں اور اسی کے متعلق جواب لانے میں کامیابی حاصل کی ہے اور کبھی انسان بطور کلی کسی شخص یا خاص شرائط زمان ومکان کا لحاظ کئے بغیر مفکرین ومحققین کی توجہ کا مرکز قرار پاتا ہے اور انسان شناسی کے راز کشف کئے جاتے ہیں، مثال کے طور پر انسان کے جسمانی

(۱) طریقہ وحی سے مراد یہ ہے کہ واقعیت اور حقایق کی شناخت میں تجربی طریقۂ سے استفادہ کرنے کے بجائے عقلی یا شہودی اور وحی الٰہی کے ذریعہ معرفت حاصل کی جائے. ایسی معرفت پیغمبروں کے لئے منزل شہود کی طرح ہے اور دوسرے جو دینی مقدس متون کے ذریعہ اسے حاصل کرتے ہیں وہ سندی یا نقلی طریقہ سے حقیقت کو حاصل کرنا ہے اسی بنا پر اس کو روش نقلی بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ کبھی طریقہ وحی سے مراد، دین کی مورد تائید طریقوں کا مجموعہ ہے جو روش تجربی، عقلانی اور شہودی کو اس شرط پر شامل ہے کہ جب وہ واقع نما اور ان کا قطعی ہونا ثابت ہوجائے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس قسم کی روش کو دینی روش کہنا چاہیئے۔ دینی متون اور منابع کے درمیان فقط وہ اسلامی منابع مورد توجہ ہونا چاہیئے جو ہمارے نظریہ کے مطابق قابل اعتبار ہوں۔ چونکہ تمام منابع اسلامی کے اعتبار سے (خواہ وہ آیات و روایات ہوں) مسئلہ کی تحقیق وتحلیل کے لئے مزید وقت درکار ہے لہٰذا اسلام کا نظریہ بیان کرنے میں تمام مذاہب و فرقوں کے درمیان سب سے مستحکم ومتقن منبع دینی یعنی قرآن مجید سے انسان شناسی کے مختلف موضوعات کی تحقیق و تحلیل میں استفادہ کریں گے اور مخصوص موارد کے علاوہ روائی منابع سے استناد نہیں کریں گے؛ اسی بنا پر مورد بحث انسان شناسی کو اسلامی انسان شناسی یا قرآنی انسان شناسی بھی کہا جاسکتا ہے۔

طول، عرض، عمق کی بناوٹ کی کیفیت کے بارے میں، اسی طرح اولین انسان یا جسم میں تاریخی اعتبار سے تبدیلی اور تغیر کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے یا ابتدائی انسانوں کے فکری، عاطفی و عملی یا مخصوص سرزمین میں قیام یا معین مرحلۂ زمان میں زندگی گزارنے والے افراد کے طریقۂ زندگی، کلچر، آداب ورسومات کے بارے میں تحقیق و گفتگو ہوتی ہے اور کبھی عام طور پر انسان کے مجبور و مختار، دائمی اور غیر دائمی یا دوسری مخلوقات سے اس کی برتری یا عدم برتری نیز اس کے انتہائی کمال اور حقیقی سعادت و خوش بختی کے بارے گفتگو ہوتی ہے جو کسی ایک فرد یا کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں ہوتی۔ انسان شناسی کی پہلی قسم کو انسان شناسی خرد یا ''جز نمائی'' اور انسان شناسی کی دوسری قسم کو انسان شناسی کلاں یا ''کل نمائی'' کہا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کے زاویہ نگاہ سے انسان شناسی کلاں یا کل مورد نظر ہے اسی بنا پر انسان کے سلسلہ میں زمان و مکان اور معین شرائط نیز افراد انسان کے کسی خاص شخص سے استثنائی موارد کے علاوہ گفتگو نہیں ہوگی، لہٰذا اس کتاب میں مورد بحث انسان شناسی کا موضوع، انسان بعنوان عام ہے اور انسان کو بہ طور کلی اور مجموعی مسائل کے تناظر میں پیش کیا جائے گا اور وہ تجربی اطلاعات و گزارشات جو کسی خاص انسان سے مختص ہیں یا کسی خاص شرائط و زمان و مکان کے افراد سے وابستہ ہیں اس موضوع بحث سے خارج ہیں۔

انسان شناسی کی ضرورت اور اہمیت

انسان شناسی کی ضرورت اور اہمیت کے لئے دو زاویہ نگاہ سے تحقیق کیا جاسکتا ہے:

پہلے زاویہ نگاہ میں، اس مسئلہ کی بشری تفکر کے دائرہ میں تحقیق کی جاتی ہے۔

دوسرے زاویہ نگاہ میں، انسان شناسی کی اہمیت کو دینی تعلیمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔

الف: انسان شناسی، بشری تفکر کے دائرے میں

باہدف زندگی کی تلاش

انسان کی زندگی کا با مقصد اور بے مقصد ہونا اس کے مختلف تصورات سے پوری طرح مرتبط ہے اور ان مختلف تصورات کو انسان شناسی کی تحقیقات ہمارے لئے فراہم کرتی ہے، مثال کے طور پر اگر انسان شناسی میں ہم یہ تصور ذہن میں بٹھالیں کہ انسان کا کوئی معقول ومناسب ہدف نہیں ہے جس پر اپنی پوری زندگی گذارتا رہے یا اگر انسان کو ایسی مخلوق سمجھا جائے جو زبردستی الٰہی، تاریخی، اجتماعی زندگی گذارنے پر مجبور ہو اور خود اپنی تقدیر نہ بنا سکے تو ایسی صورت میں انسان کی زندگی بے معنی اور کاملاً بے مقصد اور عبث ہوگی، لیکن اگر ہم نے انسان کو باہدف (معقول ومناسب ہدف) اور صاحب اختیار تصور کیا اس طرح سے کہ اپنے اختیار سے تلاش وکوشش کے ذریعہ اس بہترین ہدف تک پہونچ سکتا ہے تو اس کی زندگی معقول ومناسب اور بامعنی وبا مقصد تصور کی جائے گی۔(۱)

.....

(۱) معانی زندگی کی تلاش کا مسئلہ نفسیاتی علاج (Psychotherapy) میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور نفسیاتی علاج کے موضوعات میں سے ایک با مقصد علاج (logotherapy) ہے، با مقصد علاج کے نفسیاتی ماہرین کا عقیدہ ہے کہ تمام نفسیاتی علاج جس کا کوئی جسمانی سبب نہیں ہے زندگی کو با مقصد بنا کر علاج کیا جا سکتا ہے، با مقصد علاج کا موجد "وکٹر فرینکل (Emil Viktor Frankle) معتقد ہے کہ زندگی کو ایسا با مقصد بنانا چاہیئے کہ انسان اپنی زندگی گذارنے میں ایک ہدف نہائی کا تصور حاصل کرلے تا کہ اس کے زیر سایہ اس کی پوری زندگی با مقصد ہو جائے اور ایسا کوئی لاجواب سوال جو اس کی زندگی کے با مقصد ہونے کو متزلزل کرے اس کے لئے باقی نہ رہے، ایسی صورت میں جب کہ اس کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا کوئی جسمانی سبب نہیں ہے اس طرح قابل علاج ہیں۔ با مقصد علاج کے سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

الف) انسان در جستجوی معنا، ترجمہ اکبر معارفی۔

ب) پزشک وروح، ترجمہ بہزاد بیرشک۔

ج) فریاد ناشنیدہ معنا، ترجمہ بہزاد بیرشک، از وکٹر فرینکل۔

اجتماعی نظام کا عقلی ہونا (۱)

تمام اجتماعی اور اخلاقی نظام اس وقت قابل اعتبار ہوں گے جب انسان شناسی کے بعض وہ بنیادی مسائل صحیح اور واضح طور سے حل ہو چکے ہوں جو ان نظام کے اصول کو ترکیب و ترتیب دیتے ہیں۔ اصل میں اجتماعی شکل اور نظام کے وجود کا سبب انسان کی بنیادی ضرورتوں کا پورا کرنا ہے اور جب تک انسان کی اصلی اور اس کی جھوٹی ضرورتوں کو جدا نہ کیا جا سکے اور اجتماعی نظام انسان کے حقیقی اور اصلی ضرورتوں کے مطابق اس کا اخروی ہدف فراہم نہ ہو سکے تو اس وقت تک یہ نظام منطقی اور معقول نہیں سمجھا جائے گا۔

علوم انسانی کی اہمیت اور پیدائش

"علوم انسانی تبیینی" سے مراد وہ تجربی علوم ہیں جو حوادث بشر کی تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں اور فقط تاریخ نگاری اور تعریف کے بجائے حوادث سے مرتبط قوانین و اصول کو آشکار کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ ان علوم کا وجود و اعتبار انسان شناسی کے بعض مسائل کے حل ہونے پر موقوف ہے، مثال کے طور پر اگر تمام انسانوں کے درمیان مشترکہ طبیعت اور فطری مسائل کے مثبت پہلوؤں کے جوابات تک رسائی نہ ہو سکے اور کلی طور پر انسانوں کے لئے حیوانی پہلو کے علاوہ مشترک امور سے انکار کر دیا جائے تو انسانی علوم کی اہمیت، حیوانی اور معیشتی علوم سے گر جائے گی، اور ایسی حالت میں علوم انسانی کا وجود اپنے واقعی مفہوم سے خالی

.....

(۱) "اجتماعی نظام" سے ہماری مراد ایسا آپس میں مرتبط مجموعہ اور عقائد و نظرات کا منطقی رابطہ ہے جسے کسی معین ہدف کو حاصل کرنے کے لئے روابط اجتماعی کے خاص قوانین کے تحت مرتب کیا گیا ہو جیسے اسلام کا اقتصادی، سیاسی، حقوقی اور تربیتی نظام، اسی بنا پر اس بحث میں اجتماعی نظام کا مفہوم اس علوم اجتماعی سے متفاوت ہے جو مختلف افراد کے منظّم روابط اور ایک معاشرہ اور سماج کے مختلف پہلوؤں کو شامل ہوتا ہے جس میں اگر چہ کسی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے لیکن اس کا انتزاعی پہلو بہت زیادہ ہے، مذکورہ صراحت کے پیش نظر علمی و اجتماعی نظریہ کے دستور اور اجتماعی نظام کے درمیان فرق روشن ہو جاتا ہے۔

ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ جائے گا، اس لئے کہ اس صورت میں انسان یا کسی بھی حیوان کا سمجھنا بہت دشوار ہوگا، اس لئے کہ یا خود اسی حیوانی اور معیشتی علوم کے ذریعہ اور ان پر جاری قوانین کا سہارا لے کر اس تک رسائی حاصل کی جائے گی یا ہر انسان کی ایک الگ اور جداگانہ حیثیت ہوگی جہاں ایک نمونہ یا بہت سے نمونے کی تحقیق اور ان نمونوں پر جاری قوانین اور ترکیبات کے کشف سے دوسرے انسانوں کی شناخت کے لئے کوئی جامع قانون حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے جبکہ ان دونوں صورتوں میں علوم انسانی تبیینی اپنے موجودہ مفہوم کے ہمراہ بے معنی ہے، لیکن انسانوں کی مشترکہ فطرت کو قبول کر کے (مشترکہ حیوانی چیزوں کے علاوہ جو انسانوں کے درمیان مشترک ہیں) راہ انکشاف اور اس طرح کے قوانین و مختلف نظامِ معرفت تشکیل دے کر انسان کے مختلف گوشوں میں علوم انسانی کی بنیاد کو فراہم کیا جا سکتا ہے۔

البتہ اس گفتگو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری مشکلات سے چشم پوشی کر لی جائے جو علوم انسانی کے قوانین کو حاصل کرنے میں درپیش ہیں۔

اجتماعی تحقیقات اور علوم انسانی کی جہ تحصیل

مزید یہ کہ انسان شناسی کے مسائل علوم انسانی کے اعتبار اور وجود میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، علوم انسانی کے اختیارات اور میدان عمل کی حد بندی کا انسان شناسی کے بعض مباحث سے شدید رابطہ ہے، مثال کے طور پر اگر ہم انسان شناسی کے باب میں روح مجرد سے بالکل انکار کر دیں یا ہر انسان کی اس دنیاوی زندگی کے اختتام سے انسان کی زندگی کا اختتام سمجھا جائے تو انسانی حوادث اور اجتماعی تحقیقوں نیز ہر معنوی موضوع میں، انسان کی موت کے بعد کی دنیا سے رابطہ اور اس دنیاوی زندگی میں اس کے تأثّرات سے چشم پوشی ہوگی، اس طرح انسان کے سبھی اتفاقات میں فقط مادی حیثیت سے تجزیہ و تحلیل ہوگی اور انسانی تحقیقیں مادی زاویوں کی طرف متوجہ ہو کر رہ جائیں گی لیکن اگر روح کا مسئلہ انسان کی شخصیت سازی میں ایک حقیقی عنصر کے عنوان سے بیان ہو تو تحقیقوں کا رخ

انسان کی زندگی میں روح وبدن کے حوالے سے تاثیر وتاثّر کی حیثیت سے ہوگا اور علوم انسانی میں ایک طرح سے غیر مادی یا مادی اور غیر مادی سے ملی ہوئی تفسیر وتشریح بیان ہوگی، اس نکتہ کو آئندہ مباحث کے ضمن میں اچھی طرح سے واضح کیا جائے گا۔(۱)

ب) انسان شناسی، معارف دینی کے آئینہ میں

انسان شناسی کے مباحث کا اصول دین اور اس کے وجود شناسی کے مسائل سے محکم رابطہ ہے نیز فروع دین اور دین کے اہم مسائل سے بھی اس کا تعلق ہے۔ یہاں ہم وجود شناسی اور دین کے حوالے سے اجتماعی انسان شناسی سے رابطے کے بارے میں تین بنیادی اصولوں کے تحت تحقیق کریں گے۔

خدا شناسی اور انسان شناسی

انسان شناسی اور خدا شناسی کے رابطہ کو سمجھنا (انسان وخدا کی طرف نسبت دیتے ہوئے) شناخت حصولی اور شناخت حضوری دونوں کے ذریعہ ممکن ہے۔(۲) یا دوسرے لفظوں میں، انسان کی حضوری معرفت خود وسیلہ اور ذریعہ ہے خدا کی حضوری معرفت کا، اور اسی طرح انسان کے سلسلہ میں حصولی شناخت بھی خدا اور اس کے عظیم صفات کے بارے میں حصولی شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ پہلی قسم میں عبادت، تزکیہ نفس، عرفانی راستوں کے ذریعہ اور دوسری قسم میں انسانی وجود اور اس کے اسرار ورموز میں غور وفکر کے ذریعہ یہ شناخت ممکن ہے۔ اس کے باوجود یہ مباحث

.....

(۱) موجودہ علوم انسانی کی فقط مادی تحلیلوں ومعنوی گوشوں اور غیر فطری عناصر سے غفلت کے بارے میں معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: مکتب ھای روان شناسی ونقد آن (خصوصاً نقد مکتب ھا کا حصہ) دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ۔

(۲) معرفت یا علم حضوری سے مراد عالم اور درک کرنے والے کے لئے خود شئی کے حقیقی وواقعی وجود کا کشف ہونا ہے اور علم حصولی یعنی درک کرنے والے کے لئے حقیقی وخارجی شی کے وجود کا کشف نہ ہونا ہے۔ بلکہ اس حقیقی اور خارجی شی کے مفہوم یا صورت کو (جو اس وجود خارجی کو بیان کرتی ہے) درک کرنا ہے اور اس صورت ومفہوم کے ذریعہ اس خارجی شی کو درک کیا جاتا ہے۔

انسان شناسی، جوعلم حصولی کے مفاہیم میں لحاظ کئے جاتے ہیں انسان کی حضوری معرفت اور خدا کے سلسلہ میں حضوری شناخت کے موضوع سے خارج ہیں لہٰذا ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔(۱)

قرآن مجید خدا کی حصولی معرفت کے ساتھ انسان کی حصولی معرفت کے رابطہ کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿وَ فِی الأَرضِ آیاتٌ لِلمُوقِنِینَ وَ فِی أَنفُسِکُم أَفَلا تُبصِرُونَ﴾(۲)

زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں (خدا کے وجود اور اس کے صفات پر بہت ہی عظیم) ہیں اور تم میں (بھی) نشانیاں (کتنی عظیم) ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

اور دوسری آیت میں بیان ہوا:

﴿سَنُرِیهِم آیاتِنَا فِی الآفاقِ وَ فِی أَنفُسِهِم حَتیٰ یَتَبَیَّنَ لَهُم أَنَّهُ الحَقُّ﴾(۳)

عنقریب ہم اپنی نشانیوں کو پورے اطراف عالم اور ان کے وجود میں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔(۴)

.....

(۱) قابل ذکر یہ ہے کہ انسان کی حقیقی سعادت (انبیاء الٰہی کی بعثت کا ہدف) پروردگار عالم کی عبادت میں خلوص کے ذریعہ ممکن ہے جو اس کی حضوری معرفت کا سبب ہو۔ لیکن ایسی معرفت کا حصول بغیر علمی مقدمات کے ممکن نہیں ہے یعنی اس کی حقیقت اور عظمت کے حوالے سے اس کی حصولی معرفت، نیز اس پر عقیدہ رکھنا، اور مقام عمل میں اس پر پورا اترنا ہے، اور انسان شناسی کی تحقیق و تحلیل اس حضوری معرفت کی راہ حصول میں پہلا قدم ہے۔(۲) ذاریات/ ۲۰و۲۱۔(۳) فصلت/۵۳۔

(۴) مراد؛ معرفت حصولی میں مفاد آیت کا منحصر ہونا نہیں ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں حضوری و حصولی دونوں معرفت مراد ہو لیکن ظاہر آیت کے مطابق معرفت حصولی حتماً مورد نظر ہے۔

نبوت اور انسان شناسی

نبوت کا ہونا اور اس کا اثبات ورابطہ، انسان شناسی کے بعض مسائل کے حل پر موقوف ہے۔ اگر انسان شناسی میں یہ ثابت نہ ہو کہ وہ فرشتوں کی طرح خدا سے براہ راست یا باواسطہ رابطہ رکھ سکتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وحی اور پیغمبر کے سلسلہ میں گفتگو کی جائے؟!

وحی اور منصب نبوت سے مراد یہ ہے کہ لوگوں میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو براہ راست یا فرشتوں کے ذریعہ خداوند عالم سے وابستہ ہیں، خداوند عالم ان کے ذریعہ معجزات دکھاتا ہے اور یہ حضرات خدا سے معارف اور پیغامات حاصل کرتے ہیں تا کہ لوگوں تک پہونچائیں، اس حقیقت کو ثابت اور قبول کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس رابطہ کے سلسلہ میں انسان کی قابلیت کو پرکھا جائے۔ بنوت کا انکار کرنے والوں کے اعتراضات اور شبہات میں سے ایک یہ ہے کہ انسان ایسا رابطہ خداوند عالم سے رکھ ہی نہیں سکتا اور ایسا رابطہ انسان کی قدرت سے خارج ہے، قرآن مجید اس طرح بنوت کا انکار کرنے والوں کے سلسلہ میں فرماتا ہے کہ وہ کہتے ہیں:

﴿مَا هٰذا إلاّ بَشَرٌ مِثلُكُم ... ولَو شَاءَ اللّٰهُ لَأنزَلَ مَلائِكَةً مَا سَمِعنَا بِهٰذا فِی آبَائِنَا الأوَّلِينَ﴾(۱)

''یہ (پیغمبر) تم جیسا بشر کے علاوہ کچھ نہیں... اگر خدا چاہتا (کوئی پیغمبر بھیجے) تو فرشتوں کو نازل کرتا، ہم نے تو اس سلسلہ میں اپنے آباء واجداد سے کچھ نہیں سنا

دوسری آیت میں کافروں اور قیامت کا انکار کرنے والوں سے نقل کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے:

﴿مَا هٰذَا إلاّ بَشَرٌ مِثلُكُم يَأكُلُ مِمَّا تَأكُلُونَ مِنهُ وَ يَشرَبُ مِمَّا تَشرَبُونَ وَ لَئِن أَطَعتُم بَشَراً مِثلَكُم إِنَّكُم إِذاً لَخَاسِرُونَ﴾(۲)

---

(۱) مومنون/۲۴۔ (۲) مومنون/۳۳و۳۴۔

(کفار اور قیامت کا انکار کرنے والے کہتے ہیں:) یہ (پیغمبر) فقط تمہاری طرح ایک بشر ہے جو چیزیں تم کھاتے اور پیتے ہو وہی وہ کھاتا اور پیتا ہے، اور اگر تم لوگ نے اپنے جیسے بشر کی پیروی کر لی، تب تو ضرور گھاٹے میں رہو گے۔

لہٰذا نبوت کا ہونا یا نہ ہونا اس مسئلہ کے حل سے وابستہ ہے کہ کیا انسان اللہ کی جانب سے بھیجے گئے پیغامات وحی کو دریافت کر سکتا ہے یا نہیں؟ مزید یہ کہ نبوت کا ہونا، نبوت عامہ کا اثبات اور انبیاء کی بعثت کی ضرورت بھی اسی انسان شناسی کے مسائل کے حل سے وابستہ ہے کہ کیا انسان وحی کی مدد اور خدا کی مخصوص رہنمائی کے بغیر، نیز صرف عمومی اسباب کے ذریعہ معرفت حاصل کر کے اپنی راہ سعادت کو کامل طریقے سے پہچان سکتا ہے؟ یا یہ کہ عمومی اسباب کسب معرفت کے سلسلہ میں کافی ووافی کردار ادا نہیں کر سکتے اور کیا ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لئے کوئی پیغمبر مبعوث ہو؟

معاد اور انسان شناسی

وحی کی روشنی میں انسان کا وجود صرف مادی دنیا اور دنیاوی زندگی ہی سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ اس کے وجود کی وسعت عالم آخرت سے بھی تعلق رکھتی ہے اور اس کی حقیقی زندگی موت کے بعد کی دنیا سے مربوط ہے لہٰذا ایک زاویہ نگاہ سے معاد پر اعتقاد، موت کے بعد انسان کی زندگی کے دوام اور اس کے نابود نہ ہونے کا اعتقاد ہے اور ایسا اعتقاد دراصل ایک طرح سے انسان کے سلسلہ میں ایسا تفکر ہے جسے انسان شناسی کے مباحث سے اگر حاصل اور ثابت نہیں کیا گیا تو معاد کے مسئلہ کی کوئی عقلی ضرورت نہیں رہ جاتی اور معاد کا مسئلہ عقلی دلائل کی پشت پناہی سے عاری ہوگا اسی وجہ سے قرآن مجید معاد کی ضرورت وحقانیت پر استدلال کے لئے موت کے بعد انسان کی بقا اور اس کے نابود نہ ہونے پر تکیہ کرتا ہے اور رسول اکرمؐ سے مخاطب ہو کر منکرین معاد کی گفتگو کو اس طرح پیش کرتا ہے:

﴿وَ قَالُوا أَءِذَا ضَلَلنَا فِی الأرضِ أَءِنّا لَفِی خَلقٍ جَدیدٍ﴾ (۱)
اور (معاد کا انکار کرنے والے) یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب (ہم مر گئے اور بوسیدہ ہو گئے اور) زمین میں ناپید ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر دوبارہ پیدا کئے جائیں گے؟
ان لوگوں کے جواب میں قرآن یوں فرماتا ہے:

﴿...بَل هُم بِلِقاءِ رَبِّهِم كَافِرُونَ☆قُلّ يَتوفَّاكُم مَلكُ الموتِ الذِی وُكِّلَ بِكُم ثُمَّ إلیٰ رَبِّكُم تُرجَعُونَ﴾(۲)
(ان لوگوں نے زمین میں مل جانے کو دلیل قرار دیا ہے ورنہ معاد کے ہونے اور اس کے تحقق میں کوئی شبہہ نہیں رکھتے ہیں) بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی ملاقات ہی سے انکار کرتے ہیں (اے پیغمبر! اس دلیل کے جواب میں) تم کہدو کہ: ملک الموت جو تمہارے اوپر معین ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا (اور تم ناپید انہیں ہوؤ گے) اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

انسان شناسی اور احکام اجتماعی کی وضاحت

اس سے پہلے انسان کی حقیقی قابلیت اور بنیادی ضرورتوں کی معرفت نیز بنیاد سازی اور معقول وصحیح اجتماعی عادات واطوار کی ترسیم مورد تائید قرار پا چکی ہے۔ لہٰذا ہم یہاں اس نکتہ کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ بعض دین کے اجتماعی احکام کو عقلی نقطۂ نظر سے قبول کریں اور انہیں انسان شناسی کے بعض مسائل میں استفادہ کریں، اگر چہ دین کے اجتماعی احکام کی صحت وحقانیت علم خدا کے اس لامتناہی سرچشمہ کی وجہ سے ہے کہ جس کی ذات، عادل، رحیم وکلیم جیسے صفات سے استوار ہے، لیکن اسلام کے بعض اجتماعی احکام کی معقول وضاحت ((دینی، عالم کی معرفت میں) اس طرح سے کہ جو لوگ

.....

(۱) سجدہ/۱۰۔ (۲) سجدہ/۱۰و۱۱

دین کونہیں مانتے ہیں ان کے لئے بھی معقول اور قابل فہم ہو) صرف انسان شناسی کے بعض مسائل کے جوابات کی روشنی میں میسور وممکن ہے مثال کے طور پر وحی کی تعلیمات میں، انسان کی حقیقی شخصیت (انسان کی انسانیت) قرب الٰہی (خدا سے قریب ہونا) کی راہ میں گامزن ہونے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔اور خدا سے دور ہونے کا مطلب خود کوفراموش کرنا اور انسانیت کے رتبہ سے گر کر حیوانات سے بدتر ہونا ہے(۱) اس مطلب کی روشنی میں، وہ شخص جو اسلام کی حقانیت اور اس پر ایمان لانے کے بعد کسی غرض اور حق کی مخالفت کی وجہ سے اسلام سے منہ موڑ کے کافر (مرتد) ہوجائے تو اس کے لئے پھانسی کا قانون ایک معقول اور مستحکم فعل ہے، اس لئے کہ ایسے شخص نے اپنی انسانیت کو جان بوجھ کر گنوایا ہے نیز حیوان اور بدترین مخلوق ہونے کا سہرا باندھ کر جامعہ کے لئے خطرناک جانور (۲) میں تبدیل ہوگیا ہے۔

دور حاضر میں انسان شناسی کا بحران اور اس کے مختلف پہلو

بہت سی فکری کوششیں جو وجود انسان کے گوشوں کو روشن کرنے کے لئے دوبارہ احیاء ہوئی ہیں اس نے بشر کے لئے بہت سی معلومات فراہم کی ہیں، اگر چہ ان معلومات کی جمع آوری میں تحقیق کے مختلف طریقوں کو بروئے کار لایا گیا ہے لیکن ان میں روش تجربی کا حصہ دوسری راہوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ انسان شناسی میں زیادہ حصہ تجربہ کا ہے۔ بہت سے قضایا اور انکشافات جو انسان شناسی کے مختلف مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور وجود انسانی کے

.....

(۱) ﴿أولٰئِکَ کَالأنعَامِ بَل هُم أَضَلُّ أولٰئِکَ هُمُ الغَافِلونَ﴾ ''وہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بہت زیادہ گمراہ ہیں، وہ لوگ بے خبر اور غافل ہیں'' (سورۂ اعراف/۱۷۹)

(۲) ﴿إنَّ شرَّ الدَّوَابِّ عندَ اللّٰهِ الّذِینَ کَفَرُوا فَهُم لایُؤمِنُونَ﴾ ''یقیناً خدا کے نزدیک بدترین جانور وہی ہیں جو کافر ہوگئے ہیں پس وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے'' (انفال/۵۵)

تاریک گوشوں کے حوالے سے قابل تحقیق ہیں۔ نیز فراوانی اوراس کے ابعاد کی کثرت کی وجہ سے نہ صرف انسان کے ناشناختہ پہلوؤں کو جیسا چاہیئے تھا واضح کرتے اوراس نامعلوم موجود کی شناخت میں حائل شدہ مشکلات کو حل کرتے خود ہی مشکلات سے دچار ہو گئے ہیں۔(۱)

علم کے کسی شعبہ میں بحران کا معنی یہ ہیں کہ جن مشکلات کے حل کے لئے اس علم کی بنیاد رکھی گئی ہو وہ علم اس کو حل کرنے سے عاجز ہو اور اپنے محوری و مرکزی سوالات کے جوابات میں مبہوت و پریشان ہو، ٹھیک یہی صورت حال دور حاضر میں انسان شناسی کی ہوگئی ہے، یہ بات ایک سرسری نظر سے معلوم ہو جاتی ہے کہ دور حاضر میں انسان شناسی کی مختلف معلومات، مختلف جہتوں سے بحران کا شکار ہیں۔ انسان شناسی کا ماہر، جرمنی کا فلسفی ''اسکیلر میکس'' لکھتا ہے کہ: تاریخ کے اوراق میں کسی وقت بھی ...انسان جس قدر آج معمہ بنا ہوا ہے کبھی نہیں تھا... تخصصی علوم جن کی تعداد میں ہر روز اضافہ ہی ہو رہا ہے اور بشر کے مسائل سے مربوط ہیں، یہ بھی ذات انسان کو مزید معمہ بنائے ہوئے ہیں۔(۲)

دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران کا چار بنیادی طریقوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور ان چار بنیادی طریقوں سے مراد یہ ہیں؛ ۱۔ علوم نظری کی ایک دوسرے سے عدم ہماہنگی اور اندرونی نظم سے عاری ہونا۔ ۲۔ فائدہ منداور مورد اتفاق دلیل کا نہ ہونا۔ ۳۔ انسان کے ماضی و مستقبل کا خیال نہ کرنا

---

(۱) ''ہوسرل'' منجملہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے انسان شناسی کے بحران کو بیان کیا ہے، اس نے ''وین'' (مئی ۱۹۳۵) کی اپنی تقریر میں ''یورپ میں انسانیت کی بحران کا فلسفہ'' اور ''پراگ'' (۱۲/۱۹۳۴) کی تقریر میں ''نفسیات شناسی اور یورپ کے علوم کا بحران'' کے عناوین سے اس موضوع پر تقریریں کی ہیں اوراس کی موت کے بعد اس کے مسودوں کو ۱۹۵۴ء میں ایک پر حجم کتاب کی شکل میں ''بحران علوم اروپائی و پدیدار شناسی استعلایی'' کے عنوان سے منتشر کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو؛ مدرنیتہ و اندیشہ انتقادی، ص ۵۶

(2)Scheler Max. lasituation de l' hommo dans la monde.p. 17.

کیسیر رسے نقل کرتے ہوئے، ارنسٹ، (۱۳۶۰) فلسفہ و فرہنگ، ترجمہ بزرگی نادرزادہ، تہران؛ موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی، ص ۴۶ و ۴۷۔

۴۔انسان کے اہم ترین حوادث کی وضاحت سے عاجز ہونا۔

الف) علوم نظری کی آپس میں ناہماہنگی اور درونی نظم وضبط کا نہ ہونا

تمام مفکرین مدعی ہیں کہ انسان کے سلسلہ میں ان کا خاکہ اور نظریہ، دنیاوی اور تجربی معلومات و حوادث پر مبنی ہے اور ان کے نظریات کی دنیاوی حوادث سے تائید ہو جاتی ہے لیکن اگر ان نظریات کی سبھی توضیحات کو ملاحظہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی فطری وحدت مجہول ہے اور ہم انسان کی ایک فرد یا ایسے مختلف افراد سے رو برو نہیں ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔(۱) مثال کے طور پر ''رفتار گرایان'' کا عقیدہ (جو انسان کے کردار کو محور تسلیم کرتے ہیں) جیسے اسکینر (۲)، سیاسی واقتصادی جامعہ شناس جیسے کارل مارکس (۳)، جامعہ شناس جیسے دورکھیم (۴) علم الحیات کے نظریات کو ماننے والے اور عقیدہ وجود والے جیسے ژان پل سارٹر (۵) کے نظریات انسان کے اختیارات اور آزادی کے بارے میں ملاحظہ کریں کہ کس طرح ایک دوسرے سے ہماہنگ اور قابل جمع نہیں ہیں؛ ''عقیدۂ رفتار و کردار رکھنے والے'' اختیار کا ایک سرے سے ہی انکار کرتے ہیں۔ ''مارکس'' انسان کے اختیار اور آزادی کو روابط کے ایجاد اور تاریخی جبر کی پیداوار سمجھتا ہے۔ ''دورکھیم'' اجتماعی جبر کی تاکید کرتا ہے۔ ''حیات شناس افراد'' عناصر حیات کے سرنوشت ساز کردار کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور ''ژان پل سارٹر'' انسان کی بے چوں و چرا آزادی کا قائل ہے کہ جس میں حیات کے تقاضوں سے بالاتر ہو کر مادی دنیا کے تغییر ناپذیر قوانین کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ''اسکیلر میکس'' اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ گذشتہ دور کے برخلاف آج کے دور میں انسان شناسی تجربی (اپنے تمام انواع کے ساتھ) انسان شناسی فلسفی اور انسان شناسی الٰہی ایک دوسرے کے مخالف یا آپس میں بالکل ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں ان میں

---

(۱) کیسیرر، ارنسٹ؛ فلسفہ وفرہنگ (ترجمہ) ص ۴۵ و ۴۶۔

(2)B.F.Skinner (3)Karl Marx (4)Emile Durkheim (5)Jean-Paul

انسان کے سلسلہ میں اجماعی نظریہ اور اتحاد نہیں پایا جاتا ہے۔(۱)

ب) فائدہ منداور موردا تفاق دلیل کا نہ ہونا

طبیعی علوم میں وہ قوانین جن کو علوم طبیعی کے اکثر مفکرین مانتے ہیں ان کے علاوہ، تجربی روش کو بھی اکثر مفکرین نے آخری دلیل اور حاکم کے عنوان سے قبول کیا ہے، اگر چہ اس کی افادیت کی مقدار میں بعض اعتراضات موجود ہیں لیکن علوم انسانی میں (جیسا کہ" ارنسٹ کیسیرر" (۲) ذکر کرتا ہے کہ) کوئی ایسی علمی اصل نہیں ملتی جسے سبھی مانتے ہوں (۳) ایسے موقعہ پر ایک مفید حاکم و دلیل کی شدید ضرورت ہوتی ہے، اس کے باوجود علمی تحقیق یہ ہے کہ دور حاضر میں ہر انسان شناس اپنے نظریات کے سلسلہ میں عین واقعیت اور تجربی دلیلوں سے ہماہنگی کا مدعی ہے، حالانکہ، تجربی روش جس کو آخری اور مستحکم دلیل وحاکم کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے خود ہی متناقض معلومات فراہم کرتی ہے اور وہ بیان کئے گئے مشکلات کو حل کرنے میں مرجع ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے لہٰذا ضروری افادیت سے محروم ہے مزید یہ کہ (مفکرین کے) قابل توجہ گروہ نے کلی طور پر (حتی ان موارد میں بھی جہاں علم تجربی ہمارے لئے ہماہنگ معلومات فراہم کرتا ہے) اس روش کی افادیت میں شک ظاہر کیا ہے اور تفہیم وحوادث شناسی کے دوسرے طریقۂ کار کی تاکید کی ہے۔

ج) انسان کے ماضی اور مستقبل کا خیال نہ کرنا

انسان شناسی تجربی کے نظریات، انسان کے ماضی اور مستقبل (موت کے بعد کی دنیا) کے سلسلہ میں کوئی گفتگو نہیں کرتے ہیں۔ اگر انسان موت سے نابود نہیں ہوتا ہے (جب کہ ایسا ہی ہے) تو یہ نظریات اس کی کیفیت اور اس دنیاوی زندگی سے اس کے رابطوں کی وضاحت وتعریف سے عاجز ہیں

---

(۱) اسکیلر میکس۔

(2)Earnest Cassirar

(۳) کیسیرر، ارنسٹ، گذشتہ حوالہ، ص ۴۶۔

چنانچہ وہ اپنے ماضی سے غافل ہیں، انسان کی سرنوشت اوراس کی خواہش میں معنوی اسباب کا اثر وعمل بھی ایک دوسرا مسئلہ ہے جس کے بارے میں انسان شناسی تجربی کے نظریات کسی بھی وضاحت یا حتمی رائی دینے سے قاصر ہیں۔انسان شناسی کے دوسرے اقسام بھی (دینی انسان شناسی کے علاوہ) اخروی سعادت اورانسانی اعمال کے درمیان تفصیلی اورقدم بہ قدم روابط کے بیان سے عاجز ہیں۔

د)انسان کے اہم ترین حوادث کی وضاحت سے عاجز ہونا

دورحاضر میں انسان شناسی کے نظریے اور مکاتب اس دنیا کے بھی مہم ترین انسانی حوادث کی تفصیل وصراحت سے عاجز ہیں اوراس جہت سے بھی علمِ انسان شناسی بحران کا شکار ہے۔زبان، اجتماعی اورانسانی حوادث کے اہم ترین ایجادات میں سے ہے اوراس کی اہمیت اتنی ہے کہ علوم انسانی کے بعض مفکرین کا نظریہ ہے کہ: جومکتب اچھی طرح زبان کی وضاحت پر قادر ہے وہ انسانی حوادث کی بھی صراحت کرسکتا ہے جب کہ دورحاضر میں انسان شناسی ،زبان کے بعض گوشوں کی تفسیر و وضاحت سے عاجز ہے مثال کے طور پر وہ نظریات جوانسان کوایک مشین یا کامل حیوان کا درجہ دیتے ہیں کس طرح ان جدید اصطلاحات وایجاد معانی جن کو پہلی مرتبہ انسان مشاہدہ کرتا ہے یااس طرح کی چیزوں کے سمجھنے میں ذہن انسانی کی خلاقیت اوراس کی ابتکاری صلاحیت کی کیونکر وضاحت کرسکتے ہیں؟ یانمونہ کے طور پر میدانِ فہم وتفہیم میں (مقصد کو بیان کرنے کے لئے کلمات کا ایجاد کرنا) جو حیوانات کی آواز کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے،انسان کی خلاقیت کی کس طرح وضاحت کریں گے؟ ''چومسکی''(۱) معتقد ہے کہ قابلیت اورایجادات،انسان کی زبان کے امتیازات میں سے ہے یعنی ہم سب سے گفتگو کرسکتے ہیں اورزبان کے قوانین اور معانی کی مدد سے ایسے جملات کو سمجھتے ہیں جس کو اس سے پہلے سنا ہی نہ تھا،لہٰذا زبان ماہیت کے اعتبار سے حیوانات کے اپنے مخصوص طریقۂ عمل سے کاملاً جدا ہے۔(۲)

---

(1)Chomsky Noam (۲)لسلی،اسٹیونسن ہفت نظریہ دربارہ طبیعت انسان،ص۱۶۱۔

دینی انسان شناسی کی خصوصیات

دینی انسان شناسی اپنے مد مقابل اقسام کے درمیان کچھ ایسے امتیازات کی مالک ہے جسے ہم اختصار کے ساتھ بیان کررہے ہیں:

جامعیت

چونکہ دینی انسان شناسی تعلیمات وحی سے بہرہ مند ہے اور طریقہ وحی کسی خاص زاویہ سے مخصوص نہیں ہے لہٰذا اس سلسلہ میں دوسری روشوں کی محدودیت معنی نہیں رکھتی ہے بلکہ یہ ایک مخصوص عمومیت کی مالک ہے، اس طرح کہ اگر ہم کسی فرد خاص کے بارے میں بھی گفتگو کریں تو اس گفتگو کو انسان کے سبھی افراد کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کیا جاسکتا ہے اور اس فرد خاص کے اعتبار سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ گفتگو کرنے والا کامل اور ہر زاویہ سے صاحب معرفت ہے، مزید دینی انسان شناسی کی معلومات یہ بتاتی ہے کہ یہ انسان شناسی، انسان کے مختلف افراد کو مد نظر رکھتی ہے نیز جسمانی وفطری، تاریخی وسماجی، دنیاوی واخروی، فعلی وارمانی، مادی ومعنوی لحاظ سے بھی گفتگو کرتی ہے اور بعض موارد میں ایسی حقیقتوں کو منظر عام پر لاتی ہے جن کو انسان شناسی کے دوسرے انواع واقسام کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے، دینی تعلیمات میں منظور نظر اہداف ہی انسان شناسی دینی کے مختلف گوشے ہیں جو انتخابی صورت میں انجام پاتے ہیں۔ لہٰذا ہر پہلو کے مسئلہ کو اسی مقدار میں پیش کیا جائے گا جس قدر وہ انسان کی حقیقی سعادت میں اثر انداز ہے، جب کہ اس کی انتخابی عمومیت باقی رہے گی بلکہ انسان شناسی کے ہر ایک شعبہ مثلاً فلسفی، تجربی، شہودی کے لئے ایک خاص موضوع مورد نظر ہوگا اور انسان شناسی سے مربوط دوسرے موضوعات اس کے دائرۂ بحث سے خارج ہوں گے۔

استوار اور محکم

دینی انسان شناسی، تعلیمات وحی سے مستفاد ہے، چونکہ یہ تعلیمات نا قابل خطا اور کاملاً صحیح

ہیں لہٰذا اس قسم کی انسان شناسی استواری اور استحکام کا باعث ہوگی جو فلسفی، عرفانی اور تجربی انسان شناسی میں قابل تصور نہیں ہے، اگر دینی انسان شناسی میں دینی نظریات کا استفادہ اور انتساب ضروری ہو جائے تو ان نظریات کے استحکام اور بے خطا ہونے میں کوئی شک نہیں ہوگا، لیکن انسان شناسی کے دوسرے اقسام؛ تجربی، عقلی یا سیر وسلوک میں خطا اور غلطی کے احتمال کی نفی نہیں کی جاسکتی ہے۔

مبدا اور معاد کا تصور

غیر دینی انسان شناسی میں یا تو مبدا اور معاد سے بالکل عاری انسان کی تحقیق ہوتی ہے (جیسا کہ ہم تجربی انسان شناسی اور فلسفی وعرفانی انسان شناسی کے بعض گوشوں میں مشاہدہ کرتے ہیں) یا انسان کے معاد ومبدأ کے بارے میں بہت ہی عام اور کلی گفتگو ہوتی ہے جو زندگی اور راہ کمال کے طے کرنے کی کیفیت کو واضح نہیں کرتی ہے لیکن دینی انسان شناسی میں، مبدا اور معاد کی بحث انسانی وجود کے دو بنیادی حصوں کے عنوان سے مورد توجہ قرار پائی ہے اور اس میں انسان کی اس دنیاوی زندگی کا مبدا اور معاد سے رابطہ کی تفصیلات وجزئیات کو بیان کیا گیا ہے اسی لئے بعثت انبیاء کی ضرورت پر اسلامی مفکرین کی اہم ترین دلیل جن باتوں پر استوار ہے وہ یہ ہیں: دنیا اور آخرت کے رابطہ سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت اور سعادت انسانی کی راہ میں کون سی چیز موثر ہے اور کون سی چیز موثر نہیں ہے اس سے واقفیت اور عقل انسانی اور تجربہ کا ان کے درک سے قاصر ہونا ہے۔(۱)

بنیادی فکر

دینی انسان شناسی کے دوسرے امتیازات یہ ہیں کہ آپس میں تمام افراد انسان کے مختلف سطح کے رابطہ سے غافل نہیں ہے اور تمام انسانوں کو کلی حیثیت سے مختلف سطح کے ہوتے ہوئے، ایک قالب اور ایک تناظر میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس تفکر میں انسان کا ماضی، حال اور آئندہ، جسم وروح، مادی و

---

(۱) ملاحظہ ہو: محمد تقی مصباح، راہ وراہنما شناسی؛ ص ۴۳ و ۴۴۔

معنوی اور فکری تمایل نیز ان کے آپسی روابط کے تاثرات، شدید مورد توجہ قرار پاتے ہیں۔ لیکن تجربی، فلسفی، عرفانی انسان شناسی میں یا تو آپس میں ایسے وسیع روابط سے غفلت ہو جاتی ہے یا اتنی وسعت سے توجہ نہیں کی جاتی ہے بلکہ صرف بعض آپسی جوانب کے روابط سے گفتگو ہوتی ہے۔

خلاصہ فصل

۱۔ انسان کی شناخت اور اس کے ابعاد وجودی، زمانہ قدیم سے لے کر اب تک مفکرین کی مہم ترین تحقیقات کا موضوع رہے ہیں۔

۲۔ ہر وہ منظومہ معرفت جو کسی شخص، گروہ یا انسان کے ابعاد وجودی کے بارے میں بحث کرے یا انسان کے سلسلہ میں کلی طور پر بحث کرے اس کو انسان شناسی کہا جاتا ہے۔

۳۔ انسان شناسی کی مختلف قسمیں ہیں، جو تحقیقی روش یا زاویہ نگاہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔

۴۔ اس کتاب میں مورد توجہ انسان شناسی، انسان شناسی کلاں یا جامع ہے جو روائی اور دینی تعلیمات کی روشنی میں یا یوں کہا جائے کہ وحی اور تعبدی طریقہ سے حاصل ہوتی ہے۔

۵۔ انسان شناسی ''کلاں نمائی'' مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے مخصوص اہمیت کی حامل ہے:

الف) زندگی کو واضح کرتی ہے۔ ب) اجتماعی نظام کو بیان کرتی ہے۔

ج) علوم و تحقیقات کی طرفداری میں موثر ہے۔ د) دین کے بنیادی اصول اور اس کے اجتماعی احکام کی توضیح سے مربوط ہے۔

۶۔ دور حاضر میں انسان شناسی کے نظریات میں عدم ہماہنگی کی وجہ سے جامع اور مفید دلیل و حاکم کے فقدان، انسان کے ماضی و آئندہ سے چشم پوشی اور اس کے مہم ترین حوادث کی وضاحت سے عاجز اور شدید بحران سے روبرو ہے۔

۷۔ دینی انسان شناسی ''ہمہ گیر'' ہونے کی وجہ سے جامعیت، ناقابل خطا، مبدا و معاد پہ توجہ

اور دوسرے انسان شناسی کے مقابلہ میں عمدہ کردار کی وجہ سے برتری رکھتی ہے۔

تمرین

اس فصل سے مربوط اپنی معلومات کو مندرجہ ذیل سوالات وجوابات کے ذریعہ آزمائیں اور اگر ان کے جوابات میں کوئی مشکل درپیش ہو تو مطالب کا دوبارہ مطالعہ کریں؟

۱۔ مندرجہ ذیل موارد میں سے کون انسان شناسی کل نمائی اور ہمہ گیر موضوعات کا جزء ہے اور کون انسان شناسی، جزئی موضوعات کا جزء ہے؟

''سعادت انسان، خودفراموشی، حقوق بشر، انسانی قابلیت، انسانی ضرورتیں، مغز کی بناوٹ''

۲۔ ''خودشناسی'' سے مراد کیا ہے اور دینی انسان شناسی سے اس کا کیا رابطہ ہے؟

۳۔ مندرجہ ذیل میں سے کون صحیح ہے؟

(الف) تجربی علوم انسانی میں ایک مکتب، انسان محوری ہے؟ (ب) تجربی علوم انسانی اور دینی انسان شناسی، موضوع، دائرہ عمل اور روش کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ (ج) حقوق بشر کا یقین اور اعتقاد، انسانوں کی مشترکہ فطرت سے وابستہ ہے۔ (د) موت کے بعد کی دنیا پر یقین کا انسان شناسی کے مسائل سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

۴۔ انسان کی صحیح اور جھوٹی ضرورتوں کی شناخت کا معیار کیا ہے؟

۵۔ آپ کے تعلیمی موضوع کا وجود واعتبار کس طرح انسان شناسی کے بعض مسائل کے حل سے مربوط ہے؟

۶۔ انسانوں کا جانوروں سے امتیاز اور اختلاف، فہم اور انتقال مطالب کے دائرے میں زبان اور آواز کے حوالے سے کیا ہے؟

۷۔ آیا انسان محوری، انسان کی تعظیم وقدردانی ہے یا انسان کی تذلیل اور اس کے حقیقی قدر و منزلت سے گرانا ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے

۱.دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران کے سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

ـ ارتگای گاست، خوسہ؛ انسان و بحران ترجمہ احمد تدین؛ تہران: انتشارات علمی وفرہنگی.

ـ عارف، نصر محمد (۱۹۱۷) قضایا المنهجية فی العلوم الإنسانية. قاہرہ: المعهد العالمی للفكر الإسلامی .

ـ کیسیر ر، ارنسٹ (۱۳۶۹) رسالہای در باب انسان در آمدی بر فلسفہ وفرہنگ، ترجمہ بزرگ نادرزادہ. تہران: پژوہشگاہ علوم انسانی.

ـ گلدنر، الوین (۱۳۶۸) بحران جامعہ شناسی غرب، ترجمہ فریدہ ممتاز، تہران: شرکت سہامی انتشار

ـ گنون، رنہ، بحران دنیای متجدد، ترجمہ ضیاء الدین دہشیری. تہران: امیر کبیر

ـ والراشتاین، ایمانویل (۱۳۷۷) سیاست وفرہنگ در نظام متحول جہانی، ترجمہ پیروز ایزدی. تہران: نشرنی.

ـ واعظی، احمد، ''بحران انسان شناسی معاصر'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ، شمارہ ۹، ص ۱۰۹.۹۴، قم دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ، زمستان ۱۳۷۵.

۲.معارف دینی اور تفکر بشری کے سلسلہ میں انسان شناسی کا اثر چنانچہ اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو:

ـ دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ در آمدی بہ جامعہ شناسی اسلامی: مبانی جامعہ شناسی. ص ۴۵.۵۵۔

ـ محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم: موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ ص ۱۵۔۳۵۔

ـ پیش نیازہای مدیریت اسلامی، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، قم: ۱۳۷۹۔

ـواعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان در اسلام، دفتر همکاری حوزه و دانشگاه، تهران: سمت، ص ۱۴ـ۱۷۔

۳. انسان شناسی کی کتابوں کے بارے میں معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

ـمجلّہ حوزہ و دانشگاہ، شمارہ ۹، ص ۱۶۶ـ۱۲۸، قم: دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، زمستان ۱۳۷۵

۴ـ بعض وہ کتابیں جس میں اسلامی نقطہ نظر سے انسان کے بارے میں بحث ہوئی ہے:

ـایزوٹسوٹوشی ہیکو (۱۳۶۸) خدا و انسان در قرآن، ترجمہ احمد آرام، تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی

ـبہشتی، احمد (۱۳۶۴) انسان در قرآن، کانون نشر طریق القدس۔

ـجعفری، محمد تقی (۱۳۴۹) انسان در افق قرآن، اصفہان: کانون علمی و تربیتی جہان اسلام.

ـجوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۲) انسان در اسلام، تہران: رجاء۔

ـحائری تہرانی، مہدی (۱۳۷۳) شخصیت انسان از نظر قرآن و عترت. قم: بنیاد فرہنگی امام مہدی۔

ـحسن زادہ آملی، حسن (۱۳۶۹) انسان و قرآن، تہران: الزہراء

ـحلبی، علی اصغر (۱۳۷۱) انسان در اسلام و مکاتب غربی. تہران: اساطیر.

ـدولت آبادی، علی رضا (۱۳۷۵) سایہ خدایان نظریہ بحران روان شناسی در مسئلہ انسان، فردوس: (۱۳۷۵)

ـقرائتی، محسن (بی تا) جہان و انسان از دیدگاہ قرآن، قم: موسسہ در راہ حق۔

ـقطب، محمد (۱۳۴۱) انسان بین مادیگری و اسلام، تہران: سہامی انتشار۔

ـمحمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (جہان شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

ـمطہری، مرتضی (بی تا) انسان در قرآن، تہران: صدرا۔

ـنصری، عبداللہ (۱۳۶۸) مبانی انسان شناسی در قرآن، تہران: جہاد دانشگاہی۔

ـواعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان از دیدگاہ اسلام، قم: دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ۔

۲

ہیومنزم یا عقیدۂ انسان

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات :

۱۔ انسان کے بارے میں مختلف نظریوں کو مختصراً بیان کریں؟

۲۔ ہیومنزم کے معانی و مراد کی وضاحت کریں؟

۳۔ ہیومنزم کے چار اہداف و مراتب کی مختصراً وضاحت پیش کریں؟

۴۔ ہیومنزم کے نظریہ کی تنقید و تحلیل کریں؟

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان، بشری تفکر کا ایک محور ہے جس کے بارے میں وجود اور اہمیت شناسی کے مختلف نظریات بیان ہوئے ہیں، بعض مفکرین نے انسان کو دوسرے موجودات سے بالاتر اور بعض نے اسے حیوانات کے برابر اور کچھ نے اس کو حیوان سے کمتر و ناتواں اور ضعیف بیان کیا ہے، معرفت کی اہمیت کے اعتبار سے بھی بعض نے اس کو اشرف المخلوقات، بعض نے معتدل (نہ بہتر اور نہ خراب) اور بعض نے انسان کو برا، ذلیل اور پست کہا ہے، آئندہ مباحث میں ہم بعض مذکورہ بالا نظریوں کو اجمالاً بیان کریں گے اور اس سلسلہ میں دینی نظریات کو بھی پیش کریں گے۔

ایک دوسرے زاویہ سے انسان کی حقیقی شخصیت اور اس کی قابلیت ولیاقت کے بارے میں دو کاملاً متفاوت بلکہ متضاد نظریات بیان کئے گئے ہیں، ایک نظریہ کے مطابق انسان کاملاً آزاد اور خود مختار مخلوق ہے جو اپنی حقیقی سعادت کی شناخت اور اس تک دست رسی میں خود کفا ہے، اپنی تقدیر کو خود بناتا ہے، خود مختار، بخشی ہوئی قدرت مطلقہ کا مالک اور ہر طرح کی بیرونی تکلیف سے (خواہش و ارادہ سے خارج) مطلقاً آزاد ہے۔

دوسرے نظریہ کے مطابق انسان کے لئے قدرتِ شناخت کا ہونا لازم ہے نیز واقعی سعادت کے حصول کے لئے الٰہی رہنمائی کا محتاج ہے وہ خدائی قدرت کی ہدایت اور اس کی تدبیر کے زیر اثر اپنی سعادت کے لئے تکالیف اور واجبات کا حامل ہے جو خدا کی طرف سے پیغمبروں کے

ذریعہ اس کے اختیار میں قرار دی جاتی ہے۔

یہ دونوں نظریات، پوری تاریخ بشر میں نسبی یا مطلق طور پر انسانوں پر حاکم رہے ہیں، لیکن اس حاکمیت کی تاریخی سیر کے متعلق تجزیہ و تحلیل ہمارے ہدف کے پیش نظر ضروری نہیں ہے اور اس کتاب کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ لہٰذا پہلے نظریہ کی حاکمیت کے سلسلہ کی آخری کڑی کی تحقیق کریں گے جو تقریباً ۱۴ سو سال سے ہیومنزم (۱) یا انسان مداری کے عنوان سے مرسوم ہے، اور ۶ سو سالوں سے خصوصاً آخری صدیوں میں اکثر سیاسی، فکری اور ادبی مکاتب اس بات سے متفق ہیں کہ ہیومنزم نے مغرب کو اپنے اس نظریہ سے کاملاً متاثر کیا ہے اور بعض مذاہب الٰہی کے پیروکاروں کو بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر جذب کر لیا ہے۔

ہیومنزم کا مفہوم و معنی

اگر چہ اس کلمہ کے تجزیہ و تحلیل اور اس کے معانی میں محققین نے بہت ساری بحثوں اور مختلف نظریوں کو بیان کیا ہے اور اپنے دعوے میں دلیلیں اور مثالیں بھی پیش کی ہیں، لیکن اس کلمہ کی لغوی تحلیل و تفسیر اور اس کا ابتدائی استعمال ہمارے مقصد کے سلسلہ میں زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ لہٰذا اس لغوی تجزیہ و ترکیب کے حل و فصل کے بغیر اس مسئلہ کی حقیقت اور اس کے پہلوؤں کی تحقیق کی جائے گی، اس لئے ہم لغت اور اس کے تاریخی مباحث کے ذکر سے صرف نظر کرتے ہیں، اور اس تحریک کے مفہوم و مطالب کی تاریخی و تحلیلی پہلو سے بحث کرتے ہیں جو آئندہ مباحث کے محور کو ترتیب دیتے ہیں۔ (۲)

---

(1)Humanism

(۲) کلمہ ہیومنزم کے سلسلہ میں لغت بینی اور تاریخی معلومات کے لئے۔ ملاحظہ ہو

.احمد، بابک؛ معمای مدرنیتہ، ص ۸۳، ۹۱۔ .لالانڈ آندرہ، فرہنگ علمی و انتقادی فلسفہ کلمۂ Humanism کے ذیل میں.

. Lewis W, spitz Encyclopedia of Religion.

. Abbagnano, Nicola Encyclopedia of Philosophy.

''ہیومنزم'' ہراس فلسفہ کو کہتے ہیں جوانسان کے لئے مخصوص اہمیت ومنزلت کا قائل ہواوراس کو ہر چیز کے لئے میزان قرار دیتا ہو، تاریخی لحاظ سے انسان محوری یا ہیومنزم ایک ادبی، سماجی، فکری اور تعلیمی تحریک تھی، جو چند مراحل کے بعد سیاسی، اجتماعی رنگ میں ڈھل گئی تھی، اسی بناپراس تحریک نے تقریباً سبھی فلسفی، اخلاقی، ہنری اور ادبی اور سیاسی مکاتب کواپنے ماتحت کرلیا تھا یا یوں کہا جائے کہ یہ تمام مکاتب (دانستہ یا نادانستہ) اس میں داخل ہوگئے تھے، کمیونیزم (۱) سود پرستی (۲) مغربی روح پرستی (۳) شخص پرستی (۴) وجود پرستی (۵) آزاد پرستی (۶) حتی پیرایش گری (۷) لوتھر مارٹن (۸) (مسیحیت کی اصلاح کرنے والے) کے اعتبار سے سبھی انسان محوری میں شریک ہیں اوران میں ہیومنزم کی روح پائی جاتی ہے۔(۹) یہ تحریک عام طور پر روم اور یونان قدیم سے وابسطہ تھی (۱۰) اوراکثر یہ تحریک غیر دینی اوراونچے طبقات نیز روشن فکر حلقہ کی حامی وطرفدار رہی ہے، (۱۱) جو ۱۳ویں صدی کے اواخر میں جنوب اٹلی میں ظاہر ہوئی، اور پورے اٹلی میں پھیل گئی، اس کے بعد جرمن، فرانس، اسپین اورانگلیڈ میں پھیلتی چلی گئی اور مغرب میں اس کوایک نئے سماج کے روپ میں شمار کیا جانے لگا۔ عقیدۂ انسان مداری، اس معنی میں بنیادی ترین ترقی (۱۲) کا پیش خیمہ ہے اور ترقی پسند مفکرین، انسان کو مرکز ومحور بنا کر عالم فطرت اور تاریخ کے زاویہ سے

.....

(1)communism.(2)pragmatism(3)spiritualism(4)Personalism(5)existentialism.

(6)Liberalism(7)protestantism.(8)Luther,Martin

(۹) لالاند، آندرہ، گذشتہ حوالہ۔ (۱۰) پٹراک (Francesco Petratch) اٹلی کا مفکر وشاعر (۱۳۰۴۔ ۱۳۷۴) سوال کرتا تھا ''تاریخ روم کی تحلیل وتفسیر کے علاوہ تاریخ کیا ہوسکتی ہے؟ ملاحظہ ہو: احمدی، بابک؛ معمای مدرنیتہ؛ ص ۹۲ و ۹۳. بیوراکہارٹ (Burackhardt Jacob) (۱۸۱۸۔۱۸۹۷) کہتا تھا: ''آتن'' ہی وہ تنہا دنیا کی سند تاریخ ہے جس میں کوئی صفحہ رنج آور نہیں ہے، ہگل کہتا تھا: یورپ کے مدہوش لوگوں میں یونان کا نام، وطن دوستی تھا۔ ڈیوس ٹونی؛ ہیومنزم؛ ترجمہ عباس فجر؛ ص ۱۷، ۲۱، ۲۳۔ (۱۱) مفکرین کی حکومت سے مراد لائق لوگوں کا حاکم ہونا نہیں ہے بلکہ معاشرہ کے اونچے طبقات کی حکومت ہے۔

(12)Renaissance

انسان کی تفسیر کرنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان محوری کا رابطہ روم اور قدیم یونان سے تھا اور انسان کو محور قرار دے کر گفتگو کرنے والوں کا خیال یہ تھا کہ انسان کی قابلیت، لیاقت روم اور قدیم یونان کے زمانہ میں قابل توجہ تھی، چونکہ قرون وسطی میں چشم پوشی کی گئی تھی، لہٰذا نئے ماحول میں اس کے احیاء کی کوشش کی جانی چاہیئے، ان لوگوں کا یہ تصور تھا کہ احیاء تعلیم و تعلم کے اہتمام اور مندرجہ ذیل علوم جیسے ریاضی، منطق، شعر، تاریخ، اخلاق، سیاست خصوصاً قدیم یونان اور روم کی بلاغت وفصاحت والے علوم کے رواج سے انسان کو کامیاب و کامران بنایا جاسکتا ہے جس سے وہ اپنی آزادی کا احساس کرے، اسی بنا پر وہ حضرات جو مذکورہ علوم کی تعلیم دیتے تھے یا اس کے ترویج و تعلیم کے مقدمات فراہم کرتے تھے انہیں ''ہیومنیسٹ'' کہا جاتا ہے۔(۱)

ہیومنزم کی پیدائش کے اسباب

ہیومنزم کی پیدائش کے اسباب وعلل کے بارے میں بحث و تحقیق مزید وضاحت کی طالب ہے لیکن یہاں فقط دو اہم علتوں کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

ایک طرف تو بعض دینی خصوصیات اور کلیسائی نظام کی حاکمیت مثلاً مسیحیت کے احکام اور بنیادی عقائد کا کمزور ہونا، فہم دین اور اس کی آگاہی پر ایمان کے مقدم ہونے کی ضرورت، مسیحیت کی بعض غلط تعلیمات جیسے انسان کو فطرتاً گنہگار سمجھنا، بہشت کی خرید و فروش، مسیحیت کا علم و عقل کے خلاف ہونا، علمی و عقلی معلومات پر کلیسا کی غیر قابل قبول تعلیمات کو تحمیل کرنا وغیرہ نے اس زمانے کے رائج و نافذ دینی نظام یعنی مسیحیت کی حاکمیت سے روگردانی کے اسباب فراہم کئے نیز روم اور قدیم یونان کو آئیڈیل قرار دیا کہ جس نے انسان اور اس کی عقل کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: ڈیوس ٹونی: ہیومنزم: ص ۱۷۱؛ Abbagnano Nicola Ibid

اور دوسری طرف بہت سے ہیومنیسٹ حضرات نے جو صاحب قدرت مراکز سے مرتبط تھے اور دین کو اپنی خواہشات کے مقابلہ میں سرسخت مانع سمجھ رہے تھے گذشتہ گروہوں کی حکومت کے لئے راہ حل مہیا کرنے میں سیاسی تبدیلی اور تجدد پسندی کی (۱) عقلی تفسیر اور اس کے منفی مشکلات کی توجیہ کرنے لگے، ''ڈیوس ٹونی'' (۲) کے بقول وہ لوگ؛ سات چیزوں کے ماڈرن پہلوؤں کی توجیہ، دین اور اس کی عظمت واہمت پر حملہ اور کلیسائی نظام کو اپنا طریقۂ کار قرار دینا (۳) اور عوام کی ذہنیت کو دین اور دینی علماء سے خراب کرنا نیز دین کی سیاست اور اجتماع سے جدائی کی ضرورت پر کمر بستہ ہوگئے۔ مذکورہ دو سبب سے اپنی حفاظت کی تلاش میں کلیسا، اجتماع اور سیاست کے میدان سے دین کے پیچھے ہٹ جانے کا ذریعہ بنا، اس تحریک میں دین اور خدا کے سلسلہ میں نئی نئی تفسیریں جیسے خدا کو ماننا لیکن دین اور تعلیمات مسیحیت کا انکار کرنا، دین میں شکوک وبدعتیں (۴) نیز کسی بھی دین اور اس کی عظمت واہمیت میں تسامح وتساہل (۵)، دینی قداست اور اقدار کے حوالے سے (۶) مختلف طریقۂ عمل اور نئے انداز میں تعلیمات دینی کی توضیح وتفسیر شروع ہوگئی۔

ہیومنزم کے اجزائے ترکیبی اور نتائج (۷)

ہیومنزم کی روح اور حقیقت، جو ہیومنزم کے مختلف گروہوں کے درمیان عنصر مشترک کو تشکیل دیتی ہے اور ہر چیز کے محور ومرکز کے لئے انسان کو معیار قرار دیتی ہے (۸) اگر اس گفتگو کی منطقی ترکیبات

.....

(1)Modernity (2)Davis,Toni (4)Religious Ploralism (5)Tolerance (6)Protestantism

(۳) ملاحظہ ہو: ڈیوس ٹونی، ہیومنزم ص ۱۷۱

(۷) ماڈرن انسان کے متنوع ہونے اور ہر گروہ کے مخصوص نظریات کی بنا پر ان میں سے بعض مذکورہ امور ہیومنزم کے ائتلاف میں سے ہے اور بعض دوسرے امور اس کے عملی نتائج وضروریات میں سے ہیں۔ قابل ذکر یہ ہے کہ نتائج سے ہماری مراد عملی وعینی نتائج وضروریات سے اعم ہے۔

(۸) لالانڈ، آنڈرہ، گذشتہ مطلب، ڈیوس ٹونی، گذشتہ مطلب، ص ۲۸۔

اورضروریات کو مدنظر رکھا جائے تو جو معلومات ہمیں انسان محوری سے ملی ہے ہمارے مطلب سے بہت ہی قریب ہے، یہاں ہم ان میں سے فقط چار کی تحقیق و بررسی کریں گے۔

عقل پرستی (۱) اور تجربہ گرائی (۲)

ہیومنزم کی بنیادی ترکیبوں میں سے ایک عقل پرستی، خود کفائی پر اعتقاد، انسانی فکر کا اپنی شناخت میں آزاد ہونا، وجود، حقیقی سعادت اور اس کی راہ دریافت ہے۔(۳) معرفت کی شناخت میں ہیومنیسٹ افراد کا یہ عقیدہ تھا کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو فکری توانائی سے کشف کے قابل نہ ہو اسی وجہ سے ہر وہ موجود کہ جس کی شناخت کے دو پہلو تھے، ماوراء طبیعت جیسے خدا، معاد، وحی اور اعجاز وغیرہ (جس طرح دینی تعلیمات میں ہے) اس کو وہ لوگ غیر قابل اثبات سمجھتے تھے۔ اور اہمیت شناخت میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ حقوقی ضرورتوں کو انسان کی عقل ہی کے ذریعہ معین کرنا چاہیئے۔ ہیومنزم ایک ایسی تحریک تھی جو ایک طریقہ سے اس سنتی آئین کے مدمقابل تھی جو دین و وحی سے ماخوذ تھے اسی بنا پر یہ ہیومنزم، دین کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتا ہے۔(۴) انسانی شان و منزلت کے نئے نئے انکشافات سے انسان نے اپنی ذات کو خداپرست کے بجائے عقل پرست موجود کا عنوان دیا، علم پرستی یا علمی دیوانگی (۵) ایسی ہی فکر کا ماحصل ہے۔ ہیومنیسٹ حضرات اٹھارہویں صدی میں ہیوم (۶) (۱۷۱۱۔۱۷۷۶) کی طرح معتقد تھے کہ کوئی ایسا اہم سوال کہ جس کا حل علوم انسانی میں نہ ہو (۷) وجود نہیں رکھتا ہے۔ اومنیسٹ حضرات کی قرون وسطی سے دشمنی اور یونان قدیم سے گہرا رابطہ بھی اسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ لوگ یونان قدیم کو تقویتِ عقل اور قرون وسطی کو جہل و خرافات کی حاکمیت کا دور سمجھتے تھے۔

.....

(1)Rationalism (2)Empiricism (3)Abbagnano (4)Ibid (5)Scientism

(6)Hume, David

(۷) ڈیوس ٹونی؛ ہیومنزم؛ ص ۱۶۶۔

یہ عقل اور تجربہ پرستی کی عظیم وسعت، دین واخلاق کے اہم اطراف میں بھی شامل ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ سبھی چیز منجملہ قواعد اخلاقی، بشر کی ایجاد ہے اور ہونا بھی چاہئے۔(۱) والٹرلپمن (۲) کتاب ''اخلاقیات پر ایک مقدمہ'' (۳) میں لکھتا ہے کہ ہم تجربہ میں اخلاقی معیار کے محتاج ہیں...اس انداز میں زندگی بسر کرنا چاہیئے جو انسان کے لئے ضروری اور لازم ہے۔ایسا نہ ہو کہ اپنے ارادہ کو خدا کے ارادہ سے منطبق کریں بلکہ شرائط سعادت کے اعتبار سے انسان کے ارادہ کو اچھی شناخت سے منطبق ہونا چاہیئے۔(۴)

استقلال

ہیومنیسٹ حضرات معتقد ہیں کہ: انسان دنیا میں آزاد آیا ہے لہٰذا فقط ان چیزوں کے علاوہ جس کو وہ خود اپنے لئے انتخاب کرے ہر قید و بند سے آزاد ہونا چاہئے۔لیکن قرون وسطی کی بنیادی فطرت نے انسان کو اسیر نیز دینی اور اخلاقی احکام کو اپنے مافوق سے دریافت شدہ عظیم چیزوں کے مجموعہ کے عنوان سے اس پر حاکم کر دیا ہے،(۵) ہیومنزم ان چیزوں کو ''خدا کے احکامات اور بندوں کی پابندی'' کے عنوان سے غیر صحیح اور غیر قابل قبول سمجھتے ہیں۔(۶) چونکہ اس وقت کا طریقہ کار اور نظام ہی یہ تھا کہ قبول کیا جائے اور ان کی تغییر اور تبدیلی کا امکان بھی نہ تھا۔(۷) لہٰذا یہ چیزیں ان کی نظر میں انسان کی آزادی اور استقلال

.....

(۱) لالانڈ، آندرہ؛ گذشتہ حوالہ۔

(2)Walter lippmann (3)A Preface to morals

(۴) لالانڈ، آندرہ؛ گذشتہ حوالہ۔

(5)Abbagnano, Nicola, Ibid

(۶) آربلاسٹر لکھتا ہے: ہیومنزم کے اعتبار سے انسان کی خواہش اور اس کے ارادے کی اصل اہمیت ہے، بلکہ اس کے ارادے ہی، اعتبارات کا سرچشمہ ہیں اور دینی اعتبارات جو عالم بالا میں معین ہوتے ہیں وہ انسان کے ارادے کی حد تک پہونچ کر ساقط ہو جاتے ہیں،(آربلاسٹر، آنتھونی؛ ظہور وسقوط لبرلیزم؛ ص ۱۴۰) (۷) لالاند، آندرہ؛ گذشتہ حوالہ۔

کے منافی تھیں۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ انسان کو اپنی آزادی کو طبیعت وسماج میں تجربہ کرنا چاہیئے اور خود اپنی سرنوشت پر حاکم ہونا چاہیئے، یہ انسان ہے جو اپنے حقوق کو معین کرتا ہے نہ یہ کہ مافوق سے اس کے لئے احکام وتکالیف معین ہوں۔ اس نظریہ کے اعتبار سے انسان حق رکھتا ہے اس لئے اس پر کوئی تکلیف عائد نہیں ہوتی۔ بعض ہیومنزم مثلاً ''میکس ہرمان'' (۱) جس نے شخص پرستی کو رواج دیا تھا اس نے افراط سے کام لیا وہ معتقد تھا کہ: لوگوں کو اجتماعی قوانین کا جو ایک طرح سے علمی قوانین کی طرح ہیں پابند نہیں بنانا چاہیئے، (۲) وہ لوگ معتقد تھے کہ فقط کلاسیکل (ترقی پسند) ادبیات نے انسان کی شخصیت کو پوری طرح سے فکری اور اخلاقی آزادی میں پیش کیا ہے۔ (۳) اس لئے کہ وہ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ جیسا بھی عقیدہ ونظریہ رکھنا چاہتا ہے رکھ سکتا ہے اور دستورات اخلاقی وحقوقی کو ایک نسبی امر، قابل تغییر اور ناپایدار بتایا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ سیاسی، اخلاقی اور حقوقی نظام کو انسان اور اس کی آزادی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ وہ نہ صرف دینی احکام کو لازم الاجراء نہیں جانتے تھے بلکہ ہر طرح کا تسلط اور غیر ہیومنزم چیزیں منجملہ قرون وسطی کے بنیادی مراکز (کلیسا، شہنشاہیت (۴)، اور قبیلہ والی حکومتیں یا حکام ورعیت) کو بالکل اسی نقطۂ نگاہ کی بنا پر بے اہمیت وبے اعتبار جانتے تھے۔ (۵)

تساہل وتسامح

۱۶ اور ۱۷ ویں صدی کی دینی جنگوں کے نتیجہ میں صلح وآشتی کے ساتھ باہم زندگی گزارنے کے امکان پر مختلف ادیان کے ماننے والوں کے درمیان گفتگو اور تساہل وتسامح (سستی وچشم پوشی) کی تاکید ہوئی ہے، اور دینی تعلیمات کی وہ روش جو ہیومنزم کا احترام کرتی تھیں تساہل وتسامح کی روش سے بہت زیادہ متاثر ہوئیں، اس نظریہ میں تسامح کا مطلب یہ تھا کہ مذاہب ایک دوسرے سے

.....

(1)Herman,Max (4)imperial (5)Feudaism .

(۲) ڈیوس ٹونی؛ گذشتہ حوالہ، ص ۳۴۔ (۳) لالاند، آندرہ؛ گذشتہ حوالہ۔

اپنے اختلافات کو محفوظ رکھتے ہوئے باہم صلح وآتشی سے زندگی گذار سکیں، لیکن جدید انسان گرائی کے تساہل وتسامح سے اس فکر کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کے دینی اعتقادات اسی کی ذات کا سر چشمہ ہیں اور اس کے علاوہ کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ ان اعتقادات کے اندر، بنیادی اور اساسی چیز وحدت ہے کہ جس میں عالمی صلح کا امکان موجود ہے، ہیومنیسٹ اس دنیا کے اعتبار سے خدا کی یوں تفسیر کرتا ہے کہ: مسیح کا خدا وہی فلسفی بشر کی عقل ہے جو مذہب کی شکل میں موجود ہے۔(۱) اس زاویہ نگاہ سے مذاہب میں تساہل یعنی، مسالمت آمیز زندگی گزارنے کے علاوہ فلسفہ اور دین کے درمیان میں بھی تساہل موجود ہے، جب کہ یہ گذشتہ ایام میں ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ یہ چیز قدیم یونان اور اس کی عقل گرائی کی طرف رجوع کی وجہ نہیں تھی۔ یہ نظریہ جو ہر دین اور اہم نظام کی حقانیت اور سعادت کے انحصاری دعوے پر مبنی ہے کسی بھی اہم نظام اور معرفت کو حق، تسلیم نہیں کرتا اور ایک طرح سے معرفت اور اہمیت میں مخصوص نسبت کا پیروکار ہے اسی بنا پر ہر دین اور اہم نظام کی حکمرانی فقط کسی فرد یا جامعہ کے ارادہ اور خواہش پر مبنی ہے۔

سکولر یزم (۲)

اگر چہ ہیومنزم کے درمیان خدا اور دین پر اعتقاد رکھنے والے افراد بھی ہیں اور انسان مداری (انسان کی اصالت کا قائل ہونا) کو مومن اور ملحد میں تقسیم کرتے ہیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہیومنزم کو بے دین اور دشمن دین نہ سمجھیں تو کم از کم خدا کی معرفت نہ رکھنے والے اور منکر دین ضرور ہیں، اور ہیومنزم کی تاریخ بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ خدا کی اصالت کے بجائے انسان کو اصل قرار دینا ہی باعث بنا کہ ہیومنزم افراد قدم بہ قدم سکولر یزم اور الحاد نیز بے دینی کی طرف گامزن ہو جائیں۔ خدا اور دینی تعلیمات کی جدید تفسیر کہ جس کو ''لوٹر'' جیسے افراد نے بیان کیا ہے کہ خدا کو ماننا نیز خدا اور دین آسمانی کی مداخلت سے انکار

.....

(1)ibid (2)Secularism.

منجملہ مسیحی تعلیم سے انکار، طبیعی دین (مادّی دین) اور طبیعی خدا گرائی کی طرف مائل ہونا جسے ''ولٹر'' (۲) (۱۶۹۴۔۱۷۷۸) اور ''ہگل'' (۳) (۱۷۷۰۔۱۸۳۱) نے بھی بیان کیا ہے، اور ''ہیکسلی'' (۴) جیسے افراد کی طرف سے دین اور خدا کی جانب شکاکیت کی نسبت دینا اور ''فیوربیچ'' (۵) (۱۷۷۵۔۱۸۳۳) ''مارکس'' (۶) (۱۸۱۸۔۱۸۸۳) نیز ملحد اور مادہ پرستوں نے دین اور خدا کا بالکل انکار کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ یہ ایسے مراحل ہیں جنہیں ہیومنزم طے کر چکا ہے۔ البتہ غور وفکر کی بات یہ ہے کہ ہگل جیسے افراد کے نزدیک اس خدا کا تصور جو ادیان ابراہیمی میں ہے بالکل الگ ہے۔ دین اور خدا کی وہ نئی تفسیر جو جدید تناظر میں بیان ہوئی ہیں وہ ان ادیان کی روح سے سازگار نہیں ہے اور ایک طرح سے اندرونی طور پر دینی افکار واہمیت کی منکر اور انہیں کھوکھلا کرنے والی ہیں۔ بہر حال ہیومنزم کی وہ قسم جو مومن ہے اس کے اعتبار سے بھی خدا اور دین نقطہ اساسی اور اصلی شمار نہیں ہوتے بلکہ یہ انسانوں کی خدمت کے لئے آلہ کے طور پر ہیں، یہ انسان ہے جو اصل اور مرکزیت رکھتا ہے، ڈیوس ٹونی لکھتا ہے:

یہ کلمہ (ہیومنزم) انگلیڈ میں یکتا پرستی (۷) حتی خداشناسی سے ناپسندیدگی کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور یہ قطعا مسیحیوں اور اشراقیوں کی موقعیت سے سازگار نہیں تھا، عام طور پر یہ کلمہ الہی تعلیمات سے ایک طرح کی آزادی کا متضمن تھا۔ ت.ھ. ہیکسلی (۸) ڈارونیزم کا برجستہ مفکر اور چارلز بریڈلیف (۹) قومی سکولریزم کی انجمن کے مؤسس نے روح یعنی اصل ہیومنزم کی مدد کی اور اس کو فروغ بخشا تا کہ اس کے ذریعہ

.....

(1)Deism.(2)Voltaire.(3)Hegel,Friedrich.(4)Huxley,Julian.(5)Feuerbach, von Anseim
(6)Mark, karl.(8)Thomas,Henry,Hexley

(۷) یکتا پرستی یا توحید (Unitarianism) سے مراد مسیحیت کی اصلاح کرنے والے فرقہ کی طرف سے بیان کئے گئے توحید کا عقیدہ ہے جو کاٹولیک کلیسا کی طرف سے عقیدۂ تثلیث کے مقابلہ میں پیش کیا گیا ہے اور یہ ایک اعتبار سے مسیحیت کی نئی تفسیر تھی جو ظاہراً مقدس متون کی عبارتوں سے ناسازگار اور مسیحی مفکرین کی نظر میں دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے مترادف تھی۔ اور عام طور پر یہ کلمہ الہی تعلیمات سے آزادی کا متضمن تھا۔ (۹) وہ پارلیمنٹ کا ممبر اور National Reformer نشریہ کا مدیر اعلیٰ تھا جس نے قسم کھانے کی جگہ انجیل کی تائید کے سلسلہ میں مجلس عوام سے ۶۰ سال تک مقدمہ لڑا۔

سرسخت مسیحیت کے آخری توہمات کو بھی ختم کردے۔(۱)

نیز وہ اس طرح کہتا ہے کہ: ''اگسٹ کانٹ''(۲) کے مادی اور غیر مادی افکار کے اقسام سے عناد، عوام پسند ہیومنزم کے مفہوم کا یکتا پرستی یا الحاد اور سکولریزم میں تبدیلی کا باعث ہوا ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اور اس کی تحریک کو ۱۹ویں صدی میں تاسیس انجمنوں کے درمیان مشاہدہ کیا جاسکتا ہے (۳) مثال کے طور پر عقل گرا (اصالت عقل کے قائل) مطبوعاتی، اخلاقی اور قومی سکولریزم کی انجمنیں۔

''ڈیوس ٹونی'' اپنی کتاب کے دوسرے حصہ میں مسیحی ہیومنزم مومنین کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: مسیحیت اور ہیومنزم کا پیوند اختلافات سے چشم پوشی کر کے انجام پایا جس کی وجہ سے مسیحی ہیومنزم کی ناپایدار ترکیب میں فردی ہیومنزم کے نقش قدم موجود تھے۔ یعنی خداوند متعال جو ہر چیز پر قادر ہے اور کالون کی ہر چیز سے باخبر ہے اور فردی ارادہ کی آزادی کے درمیان تناقض، ایسے تناقض ہیں جو ''فیلیپ سیڈنی (۴)، اڈمونداسپنسر (۵) کریسٹوفر مارلو (۶)، جان ڈان (۷) اور جان ملٹن'' (۸) جیسے اصلاح گر ہیومنیسٹ کی عبارتوں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔(۹) محمد نقیب العطاس بھی لکھتا ہے: ''نطشے'' کا نعرہ ''کہ خدا مر گیا ہے'' جس کی گونج آج بھی مغربی دنیا میں سنی جاسکتی ہے اور آج مسیحیت کی موت کا نوحہ خصوصاً پروٹسٹوں یعنی اصلاح پسندوں کی طرف سے کہ جنہوں نے ظاہراً اس سرنوشت کو قبول کرتے ہوئے مزید آمادگی سے زمانے کے ساتھ ساتھ طریقۂ مسیحیت کی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اصلاح پسندوں نے ہیومنزم کے مقابلہ میں عقب نشینی کے ذریعہ مسیحیت کو درونی طور پر بدل دیا ہے۔ (۱۰) ''ارنسٹ کیسیرر'' دور حاضر میں اصلاحات (رسانس) پر جاری تفکر کی توصیف میں جو

.....

(۱) ڈیوس ٹونی، ہیومنزم؛ ص ۳۷۔ (۳) گذشتہ حوالہ، ص ۴۱۔

(2)August,conte (4)Philip,sidney (5)Edmund, spenser

(6)Chirs topher Marlowe (8)John,Don (9)John,Milton.

(۱۰) العطاس، محمد نقیب، اسلام و دینوی گری، ترجمہ احمد آرام؛ ص ۳ و ۴۔

ہیومنزم سے لیا گیا ہے اور اس سے ممزوج ومخلوط ہے لکھتا ہے: ایسا لگتا ہے کہ تنہا وسیلہ جو انسان کو تعبد اور پیش داوری سے آزاد اور اس کے لئے حقیقی سعادت کی راہ ہموار کرتا ہے وہ پوری طرح سے مذہبی اعتقاد اور اقدار سے دست بردار ہونا اور اس کو باطل قرار دینا ہے، یعنی ہر وہ تاریخی صورت کہ جس سے وہ وابستہ ہے اور ہر وہ ستون کہ جس پر اس نے تکیہ کیا ہے اس کی حاکمیت کی تاریخ اور عملی کارکردگی کے حوالے سے اس کے درمیان بہت گہرا فاصلہ ہے کہ جس کو ہیومنزم کے نظریہ پر اساسی و بنیادی تنقید تصور کیا جاتا ہے اور دور حاضر میں اصلاحات کی عام روش، دین میں شکوک اور تنقید کا آشکار انداز ہے۔(۱)

ہیومنزم کے نظریہ پر تنقید و تحقیق

فکر و عمل میں تناقض

فکر و عمل میں تناقض یعنی ایک فکری تحریک کے عنوان سے ہیومنزم کے درمیان اور انسانی معاشرہ پر عملی ہیومنزم میں تناقض نے انسان کی قدر و منزلت کو بلند و بالا کرنے کے بجائے اس کو ایک نئے خطرے سے دوچار کر دیا اور انسان پرستی کے مدعی حضرات نے اس کلمہ کو اپنے منافع کی تامین کے لئے غلط استعمال کیا ہے۔ شروع ہی میں جب حق زندگی، آزادی وخوشی اور آسودگی کے تحت ہیومنزم میں انسانی حقوق کے عنوان سے گفتگو ہوتی تھی تو ایک صدی بعد تک امریکہ میں کالوں کو غلام بنانا قانونی سمجھا جاتا تھا۔(۲) اور معاشرہ میں انسانوں کی ایک کثیر تعداد ماڈرن انسان پرستی کے نام سے قربان ہوتی تھی۔(۳) ''نازیزم''(۴) ''فاشیزم''(۵) اسٹالینزم(۶) امپریالیزم(۷) کی تحریکیں، ہیومنزم کی ہم فکر اور ہم خیال تھیں(۸) اسی بنا پر بعض مفکرین نے ضد بشریت، انسان مخالف تحریک

---

(۱) کیسیر ر، ارنسٹ؛ فلسفہ روشنگری؛ ترجمہ یداللہ موقن، ص ۲۱۰۔(۲) احمد، بابک؛ معمای مدرنیتہ؛ ص ۱۱۱۔ ڈیوس ٹونی؛ گذشتہ حوالہ ص ۳۶۔(۳) گذشتہ حوالہ، ص ۲۰(۸) ڈیوس ٹونی، وہی مدرک، ص ۹، ۵۴، ۶۴، ۸۴۔

(4)Nazism (5)Fascism. (6)Stalinism. (7)Imperialism.

دھوکا دینے والی باتیں، ذات پات کی برتری کی آواز جیسی تعبیروں کو نازیزم اور فاشیزم کی ایجاد جانا ہے اور ان کو انسان مخالف طبیعت کو پرورش دینے نیز مراکز قدرت کی توجیہ کرنے والا بتایا ہے۔(۱) اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی جرم ایسا ہو جو انسانیت کے نام سے انجام نہ پایا ہو۔(۲)

ہیومنزم کے ناگوار نتائج اور پیغامات ایسے تھے کہ بعض مفکرین نے اس کو انسان کے لئے ایک طرح کا زندان وگرفتاری سمجھا اور اس سے نجات پانے کے لئے لائحہ عمل بھی مرتب کیا ہے۔(۳)

فکری حمایت کا فقدان

ہیومنزم کے دعوے کا اور ان کے اصول کا بے دلیل ہونا، ہیومنزم کا دوسرا نقطہ ضعف ہے۔ ہیومنیسٹ اس سے پہلے کہ دلیلوں و براہین سے جس کا دعویٰ کر رہے تھے نتیجہ حاصل کرتے، کلیسا کی سربراہی کے مقابلہ میں ایک طرح کے احساسات وعواطف میں گرفتار ہو گئے، چونکہ فطرت پرستی سے بے حد مانوس تھے لہٰذا روم وقدیم یونان کے فریفتہ وگرویدہ ہو گئے۔ ''ٹامس جفرسن''(۴) نے امریکا کی آزادی کی تقریر میں کہا ہے کہ: ہم اس حقیقت کو بدیہی مانتے ہیں کہ تمام انسان مساوی خلق ہوئے ہیں۔(۵)

''ڈیوس ٹونی'' لکھتا ہے کہ: عقلی دور (ترقی پسند زمانہ) کا مذاق اڑانے والی اور نفوذ والی کتاب جس نے محترم معاشرہ کو حتی حقوق بشر کی کتاب سے زیادہ ناراض کیا ہے، وہ مقدس کتاب ہے جو عالم آخرت کے حوادث اور سرزنش سے بھری ہوئی ہے، اس کا طریقہ اور سیاق وسباق تمام مسخروں اور مذاق اڑانے والوں کا مسخرا کرنا ہے۔ بعض اومانٹسٹ حضرات نے بھی ہیومنزم کی حاکمیت کی توجیہ کی اور اسے اپنے منافع کی تامین کا موقع ومحل سمجھا۔

.....

(۱) ملاحظہ ہو گذشتہ حوالہ ص ۲۷۔۳۶، ۴۵۔۴۶، ۵۴، ۶۲۔۶۴، ۸۴۔۹۴، ۱۴۷۔۱۷۸ واحدی، با بک گذشتہ حوالہ ص ۹۱۔۹۳، ۱۱۰، ۱۲۲۔ (۲) احمدی، با بک، گذشتہ حوالہ ص ۱۱۲۔ (۳) ڈیوس ٹونی، گذشتہ حوالہ، ۱۷۸۔ (۵) گذشتہ حوالہ، ص ۱۱۰۔

(4)Thomas, Jeferson.

ہیومنیسٹ کی طرف سے بیان کئے گئے کلی مفاہیم کے بارے میں ''ڈیوس ٹونی'' یہ جانتے ہوئے کہ اس کو منافع کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے لکھتا ہے کہ: اس میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیشہ خود سے سوال کرے کہ: اس عظیم دنیا میں بلند مفاہیم کے پشت پردہ کون سا شخصی اور محلی فائدہ پوشیدہ ہے؟ (۱) مجموعی طور پر ہیومنیسٹ، انسان کی قدر و منزلت اور فکری اصلاح کے لئے کوئی پروگرام یا لائحہ عمل طے نہیں کرتے تھے بلکہ گذشتہ معاشرہ کی سرداری کے لئے بہت ہی آسان راہ حل پیش کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے... ''لیونارڈو برونی'' (۲) نے لکھا تھا کہ: تاریخی تحقیق ہمیں اس بات کا سبق دیتی ہے کہ کیسے اپنے بادشاہوں اور حاکموں کے حکم اور عمل کا احترام کریں اور بادشاہوں، حاکموں کو اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ کیسے اجتماعی مسائل کا لحاظ کریں تا کہ اپنی قدرت کو اچھی طرح سے حفظ کر سکیں، (۳) غرض کہ ہر وہ چیز جو قرون وسطی کی نفی کرے یہ لوگ اس کا استقبال کرتے تھے اور اس کی تاکید بھی کرتے تھے۔ کلیسا کی حاکمیت، خدا و دین کا نظریہ انسان کا فطرۃً گناہگار اور بد بخت ہونا، معنوی ریاضت نیز جسمانی لذتوں سے چشم پوشی اور صاحبان عقل و خرد سے بے اعتنائی یہ ایسے امور تھے جو قرون وسطی میں معاشرہ پر سایہ فکن تھے۔ اور ہیومنیسٹوں نے کلیسا کی قدرت و حاکمیت سے مقابلہ کرنے کے لئے، خدا محوری اور اعتقادات دینی کو پیش کیا اور انسان کی خوش بختی، جسمانی لذتوں اور صاحبان خرد کو اہمیت دینے نیز حقوق اللہ اور اخلاقی شرط و شروط سے انسان کو آزاد کرنے کے لئے آستین ہمت بلند کی۔ (۴) وہ لوگ علی الاعلان کہتے تھے کہ: قرون وسطی کے زمانے میں کلیسا نے جو حقوق و اقدار انسان سے سلب کر لئے تھے، ہم اس کو ضرور پلٹائیں گے۔ (۵)

---

(۱) ڈیوس ٹونی؛ گذشتہ حوالہ ص، ۳۶۔ (2)Leonardo Bruni(5)Abagnano,Nicola,ibid (۳) احمد، بابک، گذشتہ حوالہ؛ ص، ۹۱ و ۹۳ (۴) ویل ڈورانٹ لکھتا ہے کہ ہیومنیسٹوں نے دھیرے دھیرے اٹلی کی عوام کو خوبصورتی سے شہوت کے معنی سمجھائے جس کی وجہ سے ایک سالم انسانی بدن کی کھلی ہوئی تہذیب (خواہ مرد ہو یا عورت خصوصاً برہنہ) پڑھے لکھے طبقوں میں رائج ہوگی۔ ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن، ج ۵ ص ۹۷۔۹۸. جان ہرمان بھی لکھتا ہے کہ: قرن وسطی کے اواخر میں بھی بہت سی گندی نظموں کا سلسلہ رائج ہو گیا تھا جو زندگی کی خوشیوں سے بطور کامل استفادہ کی تشویق کرتی تھی۔ رنڈل جان ہرمان، سیر تکامل عقل نوین، ص ۱۲۰۔

بہر حال انسان محوری (اصالت انسان) کے عقیدے نے ہر چیز کے لئے انسان کو میزان و مرکز بنایا اور ہر طرح کی بدی اور مطلق حقائق کی نفی، نیز فطرت سے بالاتر موجودات کا انکار منجملہ خدا اور موت کے بعد کی دنیا (آخرت) کے شدت سے منکر تھے۔ آخر وہ کس دلیل کی بنا پر اتنا بڑا دعویٰ پیش کرتے ہیں؟ ان کے پاس نہ ہی معرفتِ وجود اور نہ ہی انسانوں کی کاملا آزادی واختیار(۱) پر کوئی دلیل ہے اور نہ ہی خدا کے انکار اور اس کے قوانین اور وحی سے بے نیازی پر کوئی دلیل ہے اور نہ ہی شناخت کی اہمیت کے سلسلہ میں کوئی پروف ہے۔ اور نہ ہی بشر کے افکار وخیالات، آرزوؤں، خواہشوں نیز حقوقی واخلاقی اہمیتوں پر کوئی ٹھوس ثبوت ہے اور نہ ہی فلسفی اور عقلی مسائل کو بعض انسان پرست فلاسفہ کی نفسیاتی تحلیلوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ عقلی اور نقلی دلیلیں نیز شواہد وتجربات اس کے خلاف دلالت کرتے ہیں، اگر چہ انسان اسلامی تعلیمات اور ادیان ابراہیمی کی نگاہ میں مخصوص منزلت کا حامل ہے اور عالم خلقت اور کم از کم اس مادی دنیا کو انسان کامل کے توسط سے انسانوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اس کی تابع ہے۔ لیکن جیسا کہ متعدد دلیلوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کا سارا وجود خدا سے وابستہ اور اس کے تکوینی اور تشریعی تدبیر کے ماتحت ہے اور اسی کا محتاج ہے اور اس کی مدد کے بغیر تکوینی اور تشریعی حیثیت سے انسان کی سعادت غیر ممکن ہے۔

فطرت اور مادہ پرستی

قریب بہ اتفاق اکثر ہیومنزم کے ماننے والوں نے فطرت پسندی کو انسان سے مخصوص کیا ہے

---

(۱) انسان محوری کا نظریہ رکھنے والوں میں سے بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان بہت زیادہ اختیارات کا حامل ہے ان کا کہنا ہے کہ انسان جس طریقہ سے چاہے زندگی گذار سکتا ہے۔ ژان پل، سارٹر کہتا ہے کہ: اگر ایک مفلوج انسان دوڑ میں ممتاز نہ ہو سکتا ہو تو یہ خود اس کی غلطی ہے، اسی طرح وہ لوگ اعمال کے انجام دینے (عامل خارجی کو بغیر مدنظر رکھتے ہوئے خواہ حقوقی، سنتی، اجتماعی، سیاسی، غیر فطری افعال) میں انسان کی ترقی سمجھتے ہیں۔

اوراس کوایک فطری موجوداور حیوانات کے ہم پلہ بتایا ہے۔حیوانوں (چاہے انسان ہو یا انسان کے علاوہ) کے درجات کو فقط فرضی مانتے ہیں۔(۱) انسان کے سلسلہ میں اس طرح کے فکری نتائج اور ایک طرف فائدہ کا تصور، مادی لذتوں کا حقیقی ہونا اور دنیائے مغرب کی تباہی اور دوسری طرف سے ہر طرح کی اخلاقی قدر ومنزلت، معنوی حقوق، معنوی کمالات اور ابدی سعادت کی نفی کی ہے۔

ہم آئندہ مباحث میں ثابت کریں گے کہ نہ تو انسان حیوانوں کے برابر ہے اور نہ ہی مادی اور فطری اعتبار سے منحصر ہے اور نہ ہی اس کی دنیا صرف اسی مادی دنیا سے مخصوص ہے، انسان ایک جہت سے غیر مادی پہلو رکھتا ہے اور دوسری جہت سے انسان موت سے نابود نہیں ہوتا اور اس کی زندگی مادی زندگی میں محدود نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا آخری کمال خدا سے قریب ہونا اور خدا جیسا ہونا ہے جس کی کامل تجلی گاہ عالم آخرت ہے جیسا کہ وجودشناسی کے مباحث میں ثابت ہو چکا ہے، خدا صرف ایک فرضی موجود اور انسان کی آرزو، خیالات اور فکری محصول نہیں ہے بلکہ اس کا ایک حقیقی وواقعی وجود ہے نیز وہ تمام وجود کا مرکز اور قدر ومنزلت کی خواہشوں کی آماجگاہ ہے سارے عالم کا وجود اس سے صادر ہوا ہے اور اسی سے وابستہ ہے اور اس کی تکوینی وتشریعی حکمت وتدبیر کے ماتحت ہے۔

ہیومنزم اور دینی تفکر

عقل وخرد، خدائی عطیہ ہے اور روایات کی روشنی میں باطنی حجت ہے جو خدا کی ظاہری حجت یعنی انبیاء کے ہمراہ ہے، لہٰذا ہیومنزم کی مخالفت کو، عقل وصاحبان خرد کی مخالفت نہیں سمجھنا چاہیئے، وہ چیزیں جو ہیومنزم کی تنقید کے سلسلہ میں بیان ہوتی ہیں وہ عقل کو اہمیت دینے میں افراط، خدا اور عقل کو برابر سمجھنا یا عقل کو خدا پر برتری دینا اور عقل پرستی کو خدا پرستی کی جگہ قرار دینا ہے۔دین کی نگاہ میں عقل انسان کو خدا کی طرف ہدایت کرتی ہے اور اس کی معرفت وعبادت کی راہ ہموار

---

(۱) فولادوند، عزت اللہ؛ ''سیر انسان شناسی در فلسفہ غرب از یونان تا کنون'' نگاہ حوزہ؛ شمارہ ۵۳و۵۴، ص ۱۰۴۔۱۱۱.

کرتی ہے، امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "العَقلُ مَا عُبدَ بِه الرَّحمٰن و اکتسِبَ بِه الجنَان "(۱) عقل وہ ہے جس کے ذریعہ خدا کی عبادت ہوتی ہے اور بہشت حاصل کی جاتی ہے اور ابن عباس سے بھی نقل ہوا ہے کہ فرمایا: "رَبّنَا یعرفُ بالعقلِ و یُتوسل إلَیه بالعَقلِ"(۲) ہمارا خدا عقل کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے اور عقل ہی کے ذریعہ اس سے رابطہ برقرار ہوتا ہے۔

عقل کا صحیح استعمال، انسان کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ یوں ہی آزاد نہیں ہے بلکہ اللہ کی ربوبیت کے زیر سایہ ہے۔ نیز اخلاقی اقدار اور حقوقی اہمیت کے اصول، عقل اور الٰہی فطرت کی مدد سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن عقل کی رہنمائی اور توانائی کی یہ مقدار جیسا کہ وہ لوگ خود بھی اس بات پر شاہد ہیں کہ نہ ہی ہیومنزم کی فرد پرستی کا مستلزم ہے اور نہ ہی انسان کی حقیقی سعادت کے حصول کے لئے کافی ہے، وہ چیزیں جو عقل ہمارے اختیار میں قرار دیتی ہے وہ کلی اصول اور انسان کی ضرورتوں کی مبہم تأمین اور افراد کے حقوق اور عدالت کی رعایت نیز انسان کی بلند و بالا قدر و منزلت، آزادی اور آمادگی اور اس کی قابلیت کی سیرابی ہے۔ لیکن حقیقی سعادت کے لئے بیان کئے گئے میزان وحدود اور اس کے مصادیق و موارد کا پہچاننا ضروری ہے۔ وہ چیزیں جو عقل بشر کی دسترس سے دور ہیں وہ ہیومنزم نظریے خصوصاً ہیومنزم تجربی (اوما نیز کی ایک قسم ہے) کے حامی اس سلسلہ میں یقینی معرفت کے عدم حصول کی وجہ سے مختلف ادیان و مکاتب کے ہر فرضی نظریہ کو پیش کرتے ہیں اور معرفت و سماجی پلورالیزم کے نظریہ کو قبول کرتے ہیں۔(۳) تاریخی اعتبار سے اس طرح کے فلسفہ اور نظریات، نوع بشر کو آزادی اور سعادت کی دعوت دینے کے بجائے خوفناک حوادث و مصائب کی سوغات پیش کرتے ہیں۔(۴) اور ان نتائج کو فقط ایک امر اتفاقی اور اچانک وجود میں آنے والا حادثہ نہیں سمجھنا چاہیئے،

(۱) مجلسی، محمد باقر؛ بحار الانوار ج۱، ص ۱۱۶ و ۱۷۰۔ (۲) گذشتہ مدرک ص ۹۳ (۴) ملاحظہ ہو؛ معمای مدرنیتہ؛ فصل ہفتم۔ (۳) مومٹنگ کہتا ہے کہ: "ہم کو تجربہ کے ذریعہ حقیقت تک پہونچنا چاہیئے، لیکن دنیا حتی انسان کے بارے میں یقین حاصل کرنا مشکل ہے اور یہ تمام چیزیں منجملہ اخلاقی اصول خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہمیں تمام آداب و رسوم کا احترام کرنا چاہیئے اور پلورالیزم معاشرہ کو قبول کرنا چاہیئے" (فولادوند، عزت اللہ؛ گذشتہ مدرک)

اگر انسان کو خود اسی کی ذات پر چھوڑ دیا جائے اس طرح سے کہ وہ کسی دوسری جگہ سے رہنمائی اور زندگی ساز ضروری پیغام دریافت نہ کرے تو قوت عاطفہ، غضبیہ اور شہویہ جو فطری طور سے فعال رہتی ہیں اور ہمیشہ تکامل کی طرف گامزن ہیں ساتھ ہی ساتھ اس کی خواہش بھی اس پر حاکم ہو جائے گی اور اس کی عقل سلیم نہ فقط ان امور کے ماتحت ہو جائے گی بلکہ ناپسندیدہ اعمال کی انجام دہی کے لئے عقلی بہانے تراشتی پھرے گی۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ: ﴿إنّ الانسَان لیَطغیٰ أن رَاهُ استَغنَی﴾ (۱) یقیناً انسان سرکشی کرتا ہے اس لئے کہ وہ خود کو بے نیاز سمجھتا ہے۔

بے قید و شرط آزادی

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ ہیومنزم کے ماننے والے معتقد تھے کہ: انسانی اقدار، حمایت اور طرفداری کے لئے بس فلسفی قوانین ہیں، دینی عقاید و اصول اور انتزاعی دلیلیں انسانی اقدار اور اس کی اہمیت کو پیش کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ (۲) انسان کو چاہیئے کہ خود اپنی آزادی کو طبیعت (مادہ) اور معاشرہ میں تجربہ کرے ایک نئی دنیا بنانے اور اس میں خاطر خواہ تبدیلی اور بہتری لانے کی صلاحیت انسان کے اندر پوری پوری موجود ہے۔ (۳) ایسی بکھری ہوئی اور بے نظم آزادی جیسا کہ عملاً ظاہر ہے بجائے اس کے کہ انسان کی ترقی کی راہیں اور اس کی حقیقی ضرورتوں کو تامین کریں انسان پرستم اور اس کی حقیقی قدر و منزلت اور حقوق سے چشم پوشی کا ذریعہ ہو گئی اور مکتب فاشیزم و نازیزم کے وجود کا سبب بنی۔ ''ہارڈی'' کتاب ''بازگشت بہ وحی'' کا مصنف اس کے نتیجہ کو ایک ایسے سانحہ سے تعبیر کرتا ہے کہ جس کا ہدف غیر متحقق ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ: بے وقفہ کمال کی جانب ترقی اور پھر اچانک اس راہ میں شکست کی طرف متوجہ ہونا ۱۹ ویں صدی میں یہی وہ موقعہ ہے جس کو ''سانحہ'' سے

---

(۱) سورۂ علق/۶ و ۷.

(2)Encyclopedia Britanica. (3)Abbagnona, Nicola,ibid.

تعبیر کیا گیا ہے جو ماڈرن (ترقی پسند) ہونے کی حیثیت سے مشخص ہے۔(۱)

حقیقی اور فطری تمایل کی وجہ سے وجود میں آئی ہوئی انسان کی خود پسندی میں تھوڑا سا غور وخوض ہمیں اس نتیجہ تک پہونچاتا ہے کہ اگر انسان کی اخلاقی اور حقوقی آزادی دینی تعلیمات کی روشنی میں مہار نہ ہو، تو انسان کی عقل، ہوس پرستی اور بے لگام حیوانی خواہشات کے زیر اثر آکر ہر جرم کو انجام دی سکتی ہے۔(۲) قرآن مجید اور اسلامی روایات بھی اس نکتہ کی طرف تاکید کرتے ہیں کہ وحی سے دور رہ کر انسان خود اور دوسروں کی تباہی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ نیز خود کو اور دوسروں کو سعادت ابدی سے محروم کرنے کے علاوہ اپنی دنیاوی زندگی کو بھی تباہ و برباد کرتا ہے(۳) یہی وجہ ہے کہ قرآن انسان کو (ان شرائط کے علاوہ جب وہ خود کو خدائی تربیت و تعلیم کے تحت قرار دیتا ہے) خسارت والا اور شقی سے تعبیر کرتا ہے ﴿إنَّ الإنسَانَ لَفِی خُسرٍ إلاّ الَّذِینَ آمنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالحَاتِ وَ تَوَاصَوا بِالحقِّ وَ تَواصَوا بِالصَّبرِ﴾(۴) یقیناً انسان خسارے میں ہے مگر وہ افراد جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کرتے ہیں" اور دوسری طرف ہیومنزم کی بے حد وحصر آزادی کہ جس میں فریضہ اور عمومی مصالح کی رعایت اور ذمہ داری کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، اس نظریہ میں ہر انسان کے حقوق (واجبات کے علاوہ) کے بارے میں بحث ہوتی ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے حق کو بجالائے نہ کہ اپنی تکلیف اور ذمہ داری کو، اس لئے کہ اگر کوئی تکلیف اور ذمہ داری ہے بھی تو حق کے سلسلہ ادائگی میں اسے آزادی ہے۔(۵)

---

(۱) ڈیوس ٹونی؛ گذشتہ حوالہ، ص ۴۴ و ۴۵۔ (۲) ڈیوس ٹونی کہتا ہے: ایسا لگتا ہے کہ جفرسون اور اس کے مددگار ۱۷۷۶ کے بیانیہ میں مندرج عمومی آزادی کو اپنے غلاموں یا ہمسایوں میں بھی رواج دیتے تھے۔(۳) اس سلسلہ میں قرآن کے نظریہ کی وضاحت آئندہ مباحث میں ذکر ہوگی (۴) سورۂ عصر/۲و۳۔(۵) ہم یہاں اس مسئلہ کو ذکر کرنا نہیں چاہتے کہ انسان کا مکلف ہونا بہت ہی معقول اور فائدہ مندشی ہے یا اسی طرح حق بین اور حق پسند ہونا بھی معقول ہے. لیکن ہم مختصراً بیان کریں گے کہ اجتماعی تکالیف اور دوسروں کے حقوق کے درمیان ملازمت پائے جانے کی وجہ سے الٰہی اور دینی تکالیف مورد قبول ہونے کے علاوہ اسے مستحکم عقلی حمایت حاصل ہے دنیاوی فائدہ اور افراد معاشرہ کے حقوق کی تامین کے اعتبار سے ہیومنزم حق پرستی پر برتری رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس معتبر نظام میں جب کہ ہر فرد اپنا حق چاہتا ہے اس کے باوجود اگر کوئی دوسروں کے حقوق کی رعایت کے مقابلہ میں احساس مسئولیت کرتا ہے تو وہ خود کو خداوند منان کی بارگاہ میں جواب گو سمجھتا ہے۔

اجتماعی صورت میں ہیومنزم کے ماننے والوں کی آزادی یعنی جمہوریت نیز حقوقی، اجتماعی قوانین کے حوالے سے نسبی آزادی کے قائل ہیں جو دینی نظریہ سے مناسبت نہیں رکھتے۔

ہمارے دینی نظریہ کے مطابق سبھی موجودات کا وجود خدا کی وجہ سے ہے اور تمام انسان مساوی خلق ہوئے ہیں نیز ہر ایک قوانین الٰہی کے مقابلہ میں ذمہ دار ہے اور حاکمیت کا حق صرف خدا کو ہے۔ پیغمبر، ائمہ اور ان کے نائبین، ایسے افراد ہیں جن کو ایسی حاکمیت کی اجازت دی گئی ہے۔ حقوقی اور اخلاقی امور جو اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور معین ہوئے ہیں ثابت اور غیر متغیر ہیں۔ دین کی نگاہ میں اگر چہ افراد کے حقوق معین و مشخص ہیں جس کو عقل اور انسانی فطرت کلی اعتبار سے درک کرتی ہے لیکن حدوحصر کی تعیین اور ان حقوق کے موارد اور مصادیق کی تشخیص خدا کی طرف سے ہے اور تمام افراد، الٰہی تکلیف کے عنوان سے ان کی رعایت کے پابند ہیں، ہیومنزم کی نظر میں انسانوں کی آزادی کے معنی اعتقادات دینی کو پس پشت ڈالنا اور اس کے احکام سے چشم پوشی کرنا ہے لیکن اسلام اور ادیان آسمانی میں انسانوں کے ضروری حقوق کے علاوہ بعض مقدسات اور اعتقادات کے لئے بھی کچھ خاص حقوق ہیں جن کی رعایت لازم ہے مثال کے طور پر انسان محوری کا عقیدہ رکھنے والے کے اعتبار سے جس نے بھی اسلام قبول کیا ہے اسلام کو چھوڑ کر کافر و مشرک ہونے یا کسی دوسرے مذہب کے انتخاب کرنے میں بغیر کسی شرط کے وہ آزاد ہے۔ لیکن اسلام کی رو سے وہ مرتد ہے (اپنے خاص شرائط کے ساتھ) جس کی سزا قتل یا پھانسی ہے جیسا کہ پیغمبرؐ اور معصومین علیہم السلام کو ناسزا (سب) کہنے کی سزا پھانسی ہے لیکن ہیومنزم کی نگاہ میں ایسی سزا قابل قبول نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک پیغمبرؐ و ائمہ معصومین اور دیگر افراد کے درمیان کوئی تفاوت نہیں ہے۔

تسامح وتساہل

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ انسان محوری کا عقیدہ رکھنے والے مطلقا تساہل وتسامح کی حمایت و طرف داری کرتے ہیں اور اس کو قرون وسطی کے رائج تہذیب سے مبارزہ کی نشانی اور قدیم یونان وروم

کی طرف بازگشت نیز آزادی اور انسانی قدر ومنزلت کا تقاضا جانتے ہیں۔انہوں نے تمام کامیابیوں کو انسانی کارنامہ اور فکر بشر کا نتیجہ سمجھا ہے، شناخت کے حوالے سے، شکاکیت ونسبیت کے نظریہ سے وابستہ ہیں۔ وہ لوگ اعتبارات، ضروریات اور افکار کے ایک خاص مجموعہ کی تائید نیز حاکمیت اور اس سے دفاع کو ایک غیر معقول بات تصور کرتے ہیں۔

یہ نظریہ مذاہب آسمانی کی تعلیمات خصوصاً اسلام سے مختلف جہتوں میں نہ صرف یہ کہ سازگار نہیں ہے بلکہ متضاد بھی ہے، ایک طرف تسامح وتساہل کے اصول (انسان اور اعتبارات و معرفت کے درمیان رابطہ) دینی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے اور دینی تفکر میں خداوند عالم کی ذات نقطۂ کمال ہے نہ کہ انسان کی ذات اور یہ اہمیت ومنزلت یقینی معرفت کی حمایت سے مزین ہے اور دوسری طرف اسلام ہر دین کے (حتی ادیان غیر الٰہی) اور اس کے ماننے والوں کے ساتھ تساہل و تسامح کو قبول نہیں کرتا بلکہ کفر والحاد کے مقابلہ میں صلح وآشتی کو ناقابل تسلیم جانتا ہے۔(۱) خاص طور سے دوسرے الٰہی ادیان کے ماننے والوں کے سلسلہ میں اسلام، نرمی کا برتاؤ بھی معقول انداز ہی میں کرتا ہے، اور اسلامی معاشرہ میں نیز مسلمانوں کے درمیان دوسرے مذاہب کی تبلیغ قابل قبول نہیں ہے، ان لوگوں کو حکومت اسلامی کے قوانین کے خلاف کسی عمل کے انجام دینے اور علنی طور پر محرمات اسلام کے مرتکب ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ ان قوانین کے حصار میں اسلام نہ فقط دوسرے ادیان کے ماننے والوں سے نرمی کے برتاؤ کی تاکید کرتا ہے بلکہ ان سے نیکی کی وصیت کرتا ہے اور قید وبند اور ظلم سے انسانوں کو رہائی دلانے کے لئے اپنی تلاش جاری رکھتا ہے اور ان لوگوں کی فریاد رسی کرتا ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں انصاف چاہتے ہیں نیز یہ مسلمانوں کی علامتوں اور وظائف میں سے ہے کہ وہ مظلوموں کی فریاد رسی کریں۔

---

(۱) البتہ وہ فکر واندیشہ جو ایک درونی اور غیر اختیاری فعل ہے ہماری بحث سے خارج ہے، اور کسی ایمان وفکر سے وابستہ ہونا اور اس کا نشر کرنا یا بعض تفکرات کے لئے اختیار کا زمینہ فراہم کرنا یا اس کو باقی رکھنا یہ ہے کہ وہ امر اختیاری ہو۔

خلاصہ فصل

۱۔ انسان کی واقعی شخصیت اور اس کی قابلیت اور توانائی کے سلسلہ میں دو کاملاً متفاوت نظریے موجود ہیں: ایک نظریہ انسان کو پوری طرح سے مستقل، مختار اور ہر طرح کی ذمہ داری سے عاری موجود جانتا ہے اور دوسرا نظریہ اس کو خدا سے وابستہ نیز خدا کی طرف اس کے محتاج ہونے کا قائل ہے اور پیغمبروں کی مدد سے خدا کی مخصوص ہدایت سے برخوردار اور خدوند عالم کے قوانین کے انجام دینے کا اس کو ذمہ دار مانتا ہے۔

۲۔ انسان محوری کا عقیدہ رکھنے والوں (نظریہ اول کے ماننے والوں) نے انسان کو ہر چیز کا معیار قرار دے کر کلیسا کی تعلیمات اور مسیحیت کے قدیمی دین کو خرافات تصور کیا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق فکری نمونہ تلاش کرنے کے لئے روم وقدیم یونان کے افکار کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

۳۔ انسان محوری کا نظریہ رکھنے والے افراد قدیم یونان سے استفادہ کرتے ہوئے مسیحیت کی نفی کرنے لگے اور ''دین اور خدا کی نئی تفسیر، دین اور تعلیمات مسیحیت کی نفی، خدا کا اقرار اور ہر خاص دین کی نفی، دین میں شکوک اور آخر کار دین اور خدا سے مکمل طور پر انکار کر دیا ہے''۔

۴۔ انسان محوری اور انسان مداری جو شروع میں ایک ادبی، فلسفی تحریک تھی آہستہ آہستہ فکری، سماجی تحریک میں تبدیل ہو گئی جو سبھی علمی، ہنری، فلسفی، اخلاقی حتی دینی نظام اور قوانین پر حاوی ہو گئی اور کمیونیزم، پریگماٹیزم، لبرلیزم اور پروٹسٹنٹ (اصلاح پسند مسیحیت) کو وجود میں لانے کا سبب بن گئی۔ اسی بنا پر آج انسان مدار حضرات، ملحد انسان مدار اور موحد انسان مدار میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

۵۔ ہیومنزم کے بنیادی خمیر کا عقل گرائی کی حد سے زیادہ تجربات پر اعتماد کرنا، نیز آزادی خواہی کے مسئلہ میں افراط سے کام لینا، تساہل وتسامح اور سکولریزم جیسے اجزاء تشکیل دیتے ہیں۔

۶۔ ہیومنزم کے بنیادی اجزاء، افراطی پہلوؤں کی وجہ سے میدان عمل میں، فاشیزم اور

نازیزم کے نظریات سے جا ملے، جس کی وجہ سے یہ موضوع، بشر دوستی اور مطلقا خواہشات انسانی کی اہمیت اوراس کی اصالت کے قائل ہونے نیز عقل کے خطاپذیر ہونے کا یہ طبیعی نتیجہ ہے۔

۷۔انسان کوخدا کی جگہ تسلیم کرنا، مضبوط فکری تکیہ گاہ کا نہ ہونا، حد سے زیادہ تجربہ اورانسانی عقل کواہمیت دینا اور شناخت کی قدر ومنزلت اور شناخت کی معرفت میں نسبیت کا قائل ہونا یہ ایسے سست ستون ہیں جن سے ہیومنزم دوچار ہے۔

تمرین

اس فصل سے مربوط اپنی معلومات کومندرجہ ذیل سوالات وجوابات کے ذریعہ آزمائیں:

۱۔ہیومنزم اور شخص پرستی کے درمیان نسبت کو بیان کریں؟

۲۔اسلام کی نظر میں ایمان، اعمال اوراعتبارات میں تساہل وتسامح کا کیا مقام ہے؟ مثال کے ذریعہ واضح کریں؟

۳۔"آتیتکم بالشریعة السهلة السّمحَة "سے مراد کیا ہےاور سہولت اور سماحت کے درمیان کیا فرق ہے؟

۴۔ان آیات میں سے دو آیت جوخود ہمارے اور دوسرے الٰہی ادیان کے ماننے والوں سے مسلمانوں کے نرم برتاؤ کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں بیان کریں؟

۵۔حقیقی راہ سعادت کے حصول میں انسانی عقل کی ناتوانی پر ایک دلیل پیش کریں؟

۶۔آزادی اوراستقلال، تساہل، بے توجہی اور نرمی کا برتاؤ، مغربی عقل پرستی، ہیومنزم اور دینی اصول میں عقل پر بھروسہ کرنے کے درمیان تفاوت کو بیان کریں؟

مزید مطالعہ کے لئے:

۔احمدی، بابک (۱۳۷۷) معمای مدرنیتہ، تہران: نشر مرکز۔

۔احمدی، بابک؛ مدرنتیہ واندیشہ انتقادی، تہران: نشر مرکز۔

۔بلیسٹر، آر (بی تا) ظہور وسقوط لیبرالیزم؛ ترجمہ عباس مخبر، تہران: نشر مرکز (بی تا).

۔بیوراکہارٹ، جیکب، (۱۳۷۶) فرہنگ رنسانس درایتالیا، ترجمہ محمد حسن لطفی، تہران، انتشارات طرح نو

۔ڈیوس ٹونی (۱۳۷۸) لیبرالیزم ترجمہ عباس مخبر، تہران: چاپ مرکز.

۔رجبی، فاطمہ (۱۳۷۵) لیبرالیزم، تہران: کتاب صبح۔

۔رنڈال، جان ہرمن (۱۳۷۶) سیر تکامل عقل نوین، ترجمہ ابوالقاسم پاینده، تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، ایران۔

۔سلیمان پناہ، سید محمد؛ ''دین وعلوم تجربی، کدامین وحدت؟'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ. شمارہ ۱۹، ص ۱۱، ۵۲.

۔صانع پور، مریم (۱۳۷۸) نقدی برمبانی معرفت شناسی ہیومنیستی. تہران: اندیشہ معاصر.

۔فولادوند، عزت اللہ؛ ''سیر انسان شناسی درفلسفہ غرب از یونان تا کنون'' مجلّہ نگاہ حوزہ، شمارہ ۵۳ و ۵۴۔

۔کیسیرر، ارنست (۱۳۷۰) فلسفہ روشنگری؛ ترجمہ یداللہ موقن، تہران: نیلوفر۔

۔لبرلیزم سے مربوط کتابیں، روشنگری (رنسانس) وپسامدرنیزم، ہیومنزم کی ترکیبات وانسان مداران کی تالیفات۔

۔گیڈنز، انتھونی (۱۳۷۷) فرہنگ علمی انتقادی فلسفہ. ترجمہ غلام رضا وثیق، تہران: فردوسی ایران۔

۔نوذری، حسین علی (۱۳۷۹) صورتبندی مدرنیتہ وپست مدرنیتہ، تہران، چاپخانہ علمی وفرہنگی ایران۔

۔نہادنمایندگی رہبری دردانشگاہہا، بولتن اندیشہ. شمارہ ۲ و ۳۔

۔واعظی، احمد (۱۳۷۷) ''لیبرالیزم'' مجلّہ معرفت، شمارہ ۲۵ ص ۲۵۔۳۰، قم: موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔

۔ویل ڈورانٹ (۱۳۷۱) تاریخ تمدن، ترجمہ صفدر تقی زادہ وابو طالب صارمی، جلد پنجم، تہران، انتشارات وآموزشی انقلاب اسلامی، ایران۔

ملحقات

ہیومنزم کے سلسلہ میں دانشمندوں کے مختلف نظریات، اس کے عناصر اور اجزاء میں اختلاف کی بنا پر ہے جو ہیومنزم کے نتائج اور موضوعات کے درمیان موجود ہیں اور اس کے ماننے والوں کے نظریات میں نسبتاً زیادہ تنوع کی وجہ ان کی نظری، اجتماعی اور سماجی وضعیت نیز ہیومنزم کے سلسلہ میں دانشمندوں کی طرف سے متفاوت نظریات پیش ہوئے ہیں۔

ایک طرف تو ایسے دانشمند ہیں جو اس نظریہ کو ایک ضد انسانی تحریک سمجھتے ہیں جو بشر کے لئے سوائے خسارے کے کوئی پیغام نہیں دیتی اور اس کے بارے میں ان کی تعبیرات یوں ہیں ''دھوکہ دینے والا مفہوم، قوم کی برتری اور غیر قابل توجیہ فرد کی حکمرانی کی آواز، سبعیت کی توجیہ اور تخفیف نیز ماڈرن دور کی آشکار انداز میں نابرابری، شخصی آزادی خواہی اور فردی منافع کا متحقق ہونا، نازیزم و فاشیزم کی بے ہودہ پیداوار اور ان کا وجود، محیط زیست کو ویران کرنے والی ضد انسانی عادتوں اور فطری قوتوں پر حملہ آور قوتوں کو پرورش دینا جو آخری کار انسان کی ویرانی پر ختم ہوتا ہے، خوفناک اور ویران کرنے والی قوت جو آرام وسکون کا برتاؤ نہیں کرتی ہیں، خیالی اور جھوٹے دعوے، امپریالیزم کے ہم رتبہ وہم مرتبہ، اسٹالینزم کی ایک دوسری تعبیر اور مسیحیت کے بعد کے احوال کے لئے ایک خطرناک چیز، آخری قرن میں ایک بناوٹی مفہوم جو ایک عظیم دستور کے عنوان سے تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دینے کے لائق ہے، معاشرے کے بلند طبقے نیز قدرت واقتدار کے مرکز کی تاویل وتوجیہ، شاہانہ فکر جو ایک خاص طبقہ کے منافع کی تاکید کرتی ہے اور جس کو اپنی آغوش میں لے کر اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے، ہر جرم کا نتیجہ، متناقض معانی اور مختلف پیغامات سے پر، ایسے سانحہ کا پیش خیمہ جس کا ہدف متحقق ہونے والا نہیں ہے۔(۱)

(۱) ملاحظہ ہو: ڈیوس ٹونی؛ گذشتہ حوالہ، ص ۲۷، ۳۶، ۴۵، ۴۶، ۵۴، ۶۲، ۶۴، ۸۴، ۹۴، ۱۴۷، ۱۷۸. احمدی، بابک گذشتہ حوالہ، ص ۹۱، ۹۳، ۱۱۰، ۱۲۲۔

دوسری طرف ہیومنزم کا دفاع کرنے والے ہیں جن کی کوشش انسان اور اس کی صلاحیت کو کمال بخشنا ہے، نیز فکری اور اخلاقی آزادی کو تامین کرنا، انسان کی زندگی کو عقلانی بنانا، انسان کی آزادی اور شرافت کی حمایت کرنا اور اس کی ترقی کی راہ ہموار کرنا اور کاملاً مبارزہ کرنے والا اور جہل و خرافات کے مقابلہ میں کامیاب ہونے والا بتایا ہے۔(۱)

اگر چہ ہیومنزم کے بعض منفی پہلوؤں کو انسان مداری کا دعویٰ کرنے والوں کی غلط برداشت سمجھنا چاہیئے'' لیکن یہ تحریک جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ کم از کم اس طرح کی ناپسندیدہ حوادث کے واقع ہونے کے لئے ایک مناسب ذریعہ تھی اور اس کا دعویٰ کرنے والوں کی کثیر تعداد اور ان کی بعض تاریخ، منفی پہلو سے آمیختہ تھی۔

عوامی عقل کو محور قرار دینا اور ایسے دینی و اخلاقی اقدار کی مخالفت جو معاشرے کے افراد کو معنوی انحرافات، دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور فساد پر کنٹرول کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں، جس کا نتیجہ ماڈرن اسباب و امکانات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ غیر شایستہ افراد کے وجود میں آنے کی راہ ہموار کرنا اور ناگوار حوادث کے جنم لینے کا سبب نیز ان حوادث کی عقلی توجیہ بھی کرنا ہے۔

ہیومنزم کے نظریات میں اختلافات اور ہیومنزم کی تعریف میں مشکلات کا سبب اس کے ماننے والوں کے مختلف نظریات ہیں، بعض افراد مدعی ہوئے ہیں کہ ان مختلف نظریات کے درمیان کوئی معقول وجہِ اشتراک نہیں ہے اور ان نظریات کو ہیومنزم کے کسی ایک نمونہ یا سلسلہ سے نسبت نہیں دی جاسکتی ہے اسی بناء پر ہیومنزم کی تعریف کے مسئلہ کو ایک سخت مشکل سے روبرو ہونا پڑا اور وہ لوگ معتقد ہیں کہ ہمارے پاس ایک ہیومنزم نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیومنزم کے مختلف انواع کو مندرجہ ذیل عناوین سے یاد کرتے ہیں:

.....

(۱) ملاحظہ ہو: ڈیوس ٹونی؛ گذشتہ حوالہ، ص۹۔

۱۵ویں صدی میں اٹلی کے مختلف شہری ریاستوں کا مدنی و معاشرتی ہیومنزم، ۱۶ویں صدی میں یورپ کے پروٹسٹل فرقہ کا ہیومنزم، ماڈرن آزاد و روشن خیال انقلاب کا فردی ہیومنزم، یورپ کے سرمایہ دار طبقے کا رومینٹک ہیومنزم، انقلابی ہیومنزم جس نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا، لیبرل ہیومنزم جو انقلابی ہیومنزم کو رام کرنے کے درپے تھا، نازیوں کا ہیومنزم، نازیوں کے مخالفین کا ہیومنزم، ہیڈگر، انسان مخالف ہیومنزم، فوکو اور آلٹوسر کی انسان گرائی کے خلاف ہیومنزم وغیرہ ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مختلف ہیومنزم کے مشترکات کو ایک نظریہ میں سمویا جا سکتا ہے کہ جس میں ہر ایک، ہیومنزم کے مختلف درجات کے حامل ہیں اور ہم نے اس تحقیق میں ہیومنزم کے مشترکات اور ان کے مختلف نتائج اور آثار کو مورد توجہ قرار دیا ہے۔

۳

خود فراموشی

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات:

۱۔ بے توجہی کے مفہوم کی اختصار کے ساتھ وضاحت کریں؟

۲۔ بے توجہی کے مسئلہ میں قرآن کریم کے نظریات کو بیان کریں؟

۳۔ بے توجہ انسان کی خصوصیات اور بے توجہی کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے کم از کم پانچ موارد کی طرف اشارہ کریں؟

۴۔ فردی اور اجتماعی بے توجہی کے سد باب کے لئے دین اور اس کی تعلیمات کے کردار کو بیان کریں؟

۵۔ بے توجہی کے علاج میں عملی طریقوں کی وضاحت کریں؟

دوسری فصل میں ہم نے بیان کیا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے دوسرے حصہ میں اٹلی اوراس کے بعد یورپ کے دوسرے ملکوں میں ادبی، ہنری، فلسفی اور سیاسی تحریک وجود میں آئی جو انسان کی قدر ومنزلت کی مدعی تھی جب کہ قرون وسطی میں انسان جیسا چاہیئے تھا مورد توجہ قرار نہیں پاسکا اوراس دور میں بھی انسان ایک طرح سے بے توجہی کا شکار ہوا ہے، ان لوگوں نے اس دور کے (نظام کلیسائی) موجودہ دینی نظام سے دوری اور روم وقدیم یونان کے صاحبان عقل کی طرف بازگشت کو ان حالات کے لئے راہ نجات مانا ہے اوراس طرح ہیومنزم ہر چیز کے لئے انسان کو معیار ومحور قرار دینے کی وجہ سے ایک کلی فکر کے عنوان سے مشہور ہوا ہے۔

گذشتہ فصل میں ہیومنزم کی پیدائش، اس کی ترکیبات وضروریات، مقدار انطباق اوراس کی دینی اوراسلامی تعلیمات سے سازگاری کی کیفیت کے سلسلہ میں گفتگو کی تھی اوراس فصل میں ہمارا ارادہ ہیومنزم کی بنیادی چیزوں میں سے ایک یعنی بے توجہی کے مسئلہ کو بیان کرنا ہے جو بعد کی صدیوں میں بہت زیادہ مورد توجہ رہا ہے یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو ہیومنسٹوں نے نادرست تصور کیا ہے اور بعض نے اس مسئلہ کو اس دور کے ہیومنزم کی غلط تحریک کی ایجاد بتایا ہے۔

مفہوم بے توجہی

ہماری دنیا کی ملموسات ومحسوسات میں سے فقط انسان ہی کا وجود وہ ہے جو اپنی حقیقی شخصیت کو بدل سکتا ہے، چاہے تو خود کو بلندی بخشے یا خود کو ذلت اور پستی میں تبدیل کردے اس طرح

فقط انسان کی ذات ہے جو اپنی حقیقی شخصیت کو علم حضوری کے ذریعہ درک کرتا ہے یا اپنے سے غافل ہو کر خود کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنی حقیقی شخصیت یعنی اپنے ضمیر کو بیچ کر بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔(۱)

انسان شناسی کے مہم ترین مسائل میں سے ایک انسان کا خود سے بے توجہ ہو جانا ہے جو علوم انسانی کے مختلف موضوعات میں بھی مورد توجہ رہا ہے، یہ مفہوم جو یورپ کی زبانوں میں Alienation سے یاد کیا جاتا ہے جامعہ شناسی، نفسیات، فلسفی اعتبارات (اخلاقی اور حقوقی) حتی ماہرین نفسیات کے مفہوم سے سمجھا جاتا ہے اور زیادہ تر علوم انسانی کے مختلف شعبوں میں اسی کے حوالے سے گفتگو ہوئی ہے۔ کبھی اس مفہوم کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ ''ڈورکھیم'' کہتا ہے: انسان کی بے نظمی Anomic معرفت نفس اور اس کے مثل، شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو شامل ہوتی ہے اور کبھی اس نکتہ کی تاکید ہوتی ہے کہ بے توجہی کے مفہوم کو ان مفاہیم سے ملانا نہیں چاہیئے۔(۲)

یہ لفظ Alienation (۳) ایک عرصہ تک کبھی مثبت پہلو کے لئے اور زیادہ تر منفی اور مخالف پہلو

.....

(۱) خودفراموشی کا مسئلہ انسان کی ثابت اور مشترک حقیقت کی فرع ہے اور جو لوگ بالکل انسانی فطرت کے منکر ہیں وہ اپنے نظریہ اور مکتب فکر کے دائرے میں خودفراموشی کے مسئلہ کو منطقی انداز میں پیش نہیں کر سکتے ہیں۔

(۲) اس کلمہ کے مختلف و متعدد استعمالات اور اس میں عقیدہ کثرت کی روشنی میں بعض مدعی ہیں کہ یہ مفہوم فاقد المعنی یا مہمل ہو گیا ہے۔

(۳) یہ کلمہ اور اس کے مشتقات انگریزی زبان میں مبادلہ، جدائی، دوری، عقل کا فقدان، ہزیان بکنا، جن زدہ ہونا، خراب کرنا، پراکندہ کرنا اور گمراہ کرنے کے معنی میں ہے اور فارسی میں اس کلمہ کے مقابلہ میں بہت سے مترادف کلمات قرار دیئے گئے ہیں جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

خودفراموشی، ناچاہنا، بے رغبتی، خود سے بے توجہی، بے توجہی کا درد، خود سے غافل ہونا، سست ہونا، جن زدہ ہونا، بیگانہ ہونا، بیگانوں میں گرفتار ہونا، دوسروں کو اپنی جگہ قرار دینا، دوسروں کو اپنا سمجھنا اور خود کو غیر سمجھنا وغیرہ؛ اس مقالہ میں رائج مترادف کلمہ ''خود کو بھول جانا'' انتخاب کیا گیا ہے، اگرچہ ہم ''دوسرے کو اپنا سمجھنا'' والے معنی ہی کو مقصود کے ادائگی میں دقیق سمجھتے ہیں۔

کے مفہوم سے وابستہ تھا۔(۱) کلمۂ حقیقی (۲) ''ہگل'' ''فیوربیچ'' اور ''ہس'' (۳) کے ماننے والوں کی وجہ سے ایک سکولریزم مفہوم سمجھا گیا ہے۔ وہ چیزیں جو آج سماجی اور علمی محافل میں مشہور ہے اور یہاں پر جو مدنظر ہے وہ اس کا منفی پہلو ہے، اس پہلو میں انسان کی ایک حقیقی اور واقعی شخصیت مدنظر ہوتی ہے کہ جس کے مخالف راہ میں حرکت اس کی حقیقی ذات سے فراموشی کا سبب بن جاتی ہے اور اس حقیقی شخصیت سے غفلت انسان کو پرائی قوتوں کے زیر اثر قرار دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے سے ماسواء کو اپنا سمجھتا ہے اور اس کی اپنی ساری تلاش اپنے غیر کے لئے ہوتی ہے۔ خود سے بے توجہی، مختلف گوشوں سے دانشمندوں کی توجہ کا مرکز ہوگئی ہے۔ جس میں اختیار یا جبر، فطری یا غیر فطری، مختلف شکلیں، ایجاد کرنے والے عناصر اور اس کے نتائج کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔ اس کے تمام گوشوں، نظریات نیز اس کے دلائل کی تحقیق وتنقید کو اس کتاب میں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ضروری، لہٰذا ان موارد میں ایک سرسری اشارہ کرنے پر ہی اکتفاء کریں گے۔

''خودفراموشی'' کے مسائل کو بنیادی طور پر ادیان آسمانی کی تعلیمات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ ادیان آسمانی ہی ہیں کہ جنھوں نے ہر مکتبہ فکر سے پہلے اس مسئلہ کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے نیز اس کے خطرے سے آگاہ کیا ہے اور اس کی علامتوں کو بیان کرتے ہوئے اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی عملی حکمت پیش کی ہے۔ اس کے باوجود انسانی واجتماعی علوم کے مباحث میں فنی علمی طریقہ سے ''خودفراموشی'' کے مفہوم کی وضاحت اور تشریح کو ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی عیسوی کے بعض

(۱) غنوصیوں نے میلاد مسیح سے پہلے قرن اول میں اور میلاد مسیح کے بعد قرن دوم میں نیز ''وون کاسٹل'' (۱۱۳۷۔۱۰۸۸،م) نے اس کو نفس انسان کی گمراہی سے رہائی، نیرنگی اور دوبارہ تولد کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ہگل بھی مثبت ومنفی خودفراموشی کا قائل ہے، لیکن دوسرے مفکرین وادیان الٰہی اور اس کے ماننے والے خودفراموشی کو منفی وغیر اخلاقی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: بدوی، عبدالحمن؛ موسوعۃ الفلسفۃ، طہ فرج، عبدالقادر؛ موسوعۃ علم النفس والتحلیل النفسی۔

(2)Pauer (3) Hess

دانشمندوں خصوصاً ''ہگل، فیور بیچ اور مارکس'' کی طرف نسبت دی گئی ہے (۱) دین اور ''خود فراموشی'' کے درمیان رابطہ کے سلسلہ میں ان تینوں مفکروں کے درمیان وجہ اشتراک یہ ہے کہ یہ تینوں خود دین کو انسان کی خودفراموشی کی وجہ مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ: جب دین کو درمیان سے ہٹادیا جائے تو انسان ایک دن اپنے آپ کو درک کرلے گا۔ اور کم از کم جب تک دین انسان کی فکر پر حاوی ہے انسان ''خودفراموشی'' کا شکار ہے۔ (۲) یہ بات ٹھیک ادیان آسمانی کے تفکر کا نقطہ مقابل ہے خصوصاً خودفراموشی کے مسئلہ میں اسلام وقرآن کے خلاف ہے، بہرحال حقیقی طور پر دینی نقطہ نظر سے ''خودفراموشی'' کا مسئلہ ایک مستقل شکل میں مسلمان مفکرین کے نزدیک موردتوجہ قرار نہیں پایا ہے لہٰذا صاحبان فکر کی جستجو کا طالب ہے۔

(۱) مذکورہ تین مفکروں کے علاوہ تھامس ہابز (Thomas Hobbes ۱۵۸۸_۱۶۷۹) بینڈکٹ اسپیونزا (Benedict Spinoza ۱۶۳۲_۱۶۷۷) جان لاک (John locke ۱۶۳۲_۱۷۰۴) ژان ژاک روسو (Jean Jacquess Rousseau ۱۷۱۲_۱۷۷۸) میکس اسکلر (Max Scheler ۱۰۸۵_۱۸۰۹) جوہان فشے (Johann Fichte ۱۷۶۲_۱۸۴۱) ولفگیگ گوئٹے (Wolfgang Goethe ۱۷۴۹_۱۸۳۲) ویلیم وون ہمبولٹ (Wilhelm Von Humboldt ۱۷۶۷_۱۸۳۵) سورن کیرکیگارڈ (soren kier kegaard ۱۸۱۳_۱۸۵۵) پال ٹیلیچ (Paul Tillich ۱۸۸۶_۱۹۶۵) منجملہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خودفراموشی کے مسئلہ کو بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: زورنٹال و...، الموسوعۃ الفلسفیۃ؛ ترجمہ سمیر کرم، بدوی، عبدالرحمن، موسوعۃ الفلسفۃ۔ زیادہ، معن، الموسوعۃ الفلسفیۃ العربیۃ۔ (۲) گرچہ ہگل نے دوطرح کے دین کی طرف اشارہ کیا ہے: ایک وہ دین جو انسان کو ذلیل وخوار کرکے خداؤں کے حضور میں قربانی کرتا ہے جیسے یہودیت اور دوسرا دین وہ ہے جو انسان کو حیات اور عزت دیتا ہے۔ پہلے قسم کا دین خودفراموشی کی وجہ سے ہے لیکن دوسرے قسم کے دین کی خصوصیات حقیقی ادیان پر منطبق نہیں ہے، صرف ایک عرفانی نظریہ اور معارف دینی کے ذریعہ ان دونوں کو ایک حد تک ایک دوسرے سے منطبق سمجھا جاسکتا ہے، اگرچہ ہگل، خدا اور روح وعقل کے بارے میں ایک عمومی بحث کرتا ہے لیکن ہگل کا خدا، عام طور پر ان ادیان کے خدا سے جس کا مومنین یقین رکھتے ہیں بالکل الگ ہے اور وہ خدا کو عالی ومتعالی، عظیم، خالق ماسوا، انسان پر مسلط اور انسانوں کے اعمال کے بارے میں سوال کرنے والا موجود نہیں سمجھتا ہے۔

قرآن کی روشنی میں ''خودفراموشی'' کے مسئلہ کواس ارادہ سے بیان کیا گیا ہے تا کہ ہم بھی ایک ایسا قدم بڑھائیں جو اسلام کے نظریہ سے اس کی تحلیل وتحقیق کے لئے نقطۂ آغاز ہو، اس لئے ہم بعض قرآنی آیات کی روشنی میں ''خودفراموشی'' کے مسئلہ پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

قرآن اور خودفراموشی کا مسئلہ

بحث شروع کرنے سے پہلے اس نکتہ کی یادآوری ضروری ہے کہ ''خودفراموشی'' کا مسئلہ بیان کرنا، اس خاکہ سے کاملاً مربوط ہے جسے انسان کی شخصیت وحقیقت کے بارے میں مختلف مکاتب فکر نے پیش کیا ہے اور مختلف مکاتب میں اس خاکہ کی تحقیق وتحلیل اس کتاب کے امکان سے خارج ہے اسی لئے فقط اشارہ ہورہا ہے کہ قرآن کی روشنی میں انسان کی حقیقت کو اس کی ابدی روح ترتیب دیتی ہے جو خدا کی طرف سے ہے اور اسی کی طرف واپس ہوجائے گی، انسان کی حقیقت ''اسی سے'' اور ''اس کی طرف'' ﴿إنّا لِلّٰهِ وَ إنَّا إلَيهِ رَاجعُونَ﴾(۱) ہے، اسلامی نکتہ نگاہ سے انسان کی صحیح ودقیق شناخت، خدا سے اس کے رابطہ کو مدنظر رکھے بغیر ممکن نہیں ہے، انسان کا وجود خدا سے ملا ہوا ہے اس کو خدا سے جدا اور الگ کرنا گویا اس کے حقیقی وجود کو پردۂ ابہام میں ڈال دینا ہے، اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے غیر الٰہی مکتب میں غفلت برتی گئی ہے یا اس سے انکار کیا گیا ہے دوسری طرف انسان کی حقیقی زندگی عالم آخرت میں ہے جسے انسان اس دنیا میں اپنی مخلصانہ تلاش اور ایمان کے ساتھ آمادہ کرتا ہے، لہٰذا قرآن کی نگاہ میں ''خودفراموشی'' کے مسئلہ کو اسی تناظر میں موردتوجہ قرار دینا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں دوسرا نکتہ جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ''خودفراموشی'' کا نام دینے والوں نے انسان اور اس کی زندگی کو دنیاوی زندگی میں اور مادی ومعنوی ضرورتوں کو بھی دنیاوی زندگی میں محصور کردیا ہے اور مسئلہ کے سبھی گوشوں پر اسی حیثیت سے نگاہ دوڑائی ہے، مزید یہ کہ ان میں سے بعض دنیا پرستوں کے فلسفی اصولوں کو قبول کرکے ایک آشکار اختلاف میں گرفتار ہوگئے اور انسان کو دوسری غیر

(۱) سورۂ بقرہ، ۱۵۶۔

مادی اشیاء کی حد تک گر کر مسئلہ کو بالکل نادرست اور غلط بیان کیا ہے، ایسی حالت میں جو چیز غفلت کا شکار ہوئی ہے وہ انسان کا حقیقی وجود ہے اور حقیقت میں اس کی ''خودفراموشی'' کا مفہوم ہی مصداق اور ''خودفراموشی'' کا سبب بھی ہے۔

قرآن مجید نے بارہا غفلت اور خود کو غیر خدا کے سپرد کرنے کے سلسلہ میں انسان کو ہوشیار کیا ہے اور بت پرستی، شیطان اور خواہشات نفس کی پیروی نیز آباؤ واجداد کی چشم بستہ تقلید کے بارے میں سرزنش کی ہے۔ انسان پر غلبۂ شیطان کے سلسلہ میں بارہا قرآن مجید میں آگاہ کیا گیا ہے، اور جن و انس، شیاطین کے وسوسہ سے انسان کے خطرۂ انحراف کی تاکید ہوئی ہے۔(۱) اسلامی نظریہ اور انسانی معاشرہ میں بیان کئے گئے مفاہیم سے آشنائی قابل قبول اور لائق درک وفہم ہیں، جب کہ اگر ان پر ''خودفراموشی'' کے مسئلہ کی روشنی میں توجہ دی جائے تو معلومات کے نئے دریچہ کھلیں گے، لیکن ''خود فراموشی'' خودفروشی اور ضرر جیسے مفاہیم جو بعض آیات میں ذکر ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی مہم مفاہیم ہیں جن پر مزید توجہ کی ضرورت ہے اور انسان کو دقت کے لئے مجبور کرتے ہیں، لیکن کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ انسان ''خودفراموشی'' کا شکار ہوجائے اور خود کو بھول جائے یا یہ کہ خود کو بیچ دے؟! کیا خود کو ضرر پہونچانا بھی ممکن ہے؟ انسان ضرر اٹھاتا ہے اور اس کا ضرر موجودہ امکانات کے کھودینے کے معنی میں ہے، لیکن خود کو نقصان پہونچانے کا کیا مفہوم ہوسکتا ہے اور کس طرح انسان اپنی ذات کے حوالے سے ضرر سے دوچار ہوتا ہے؟! قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے کہ:

﴿وَ لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُم أَنفُسَهُم﴾

اوران جیسے نہ ہوجاؤ جو خدا کو بھول بیٹھے تو خدا نے بھی ان کو انہیں کے نفسوں سے غافل کردیا۔(۲)

---

(۱) یہ مفاہیم روایات میں بھی مذکور ہیں، ان مفاہیم سے مزید آگاہی کے لئے نہج البلاغہ کی طرف رجوع کریں مطہری، مرتضی؛ سیری در نہج البلاغہ، ص ۲۹۱۔۳۰۶۔ (۲) سورۂ حشر ۱۹

اور دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

﴿بِئسَمَا اشتَرَوا بِهِ أَنفُسَهُم﴾ کتنی بری ہے وہ چیز جس کے مقابلہ میں ان لوگوں نے اپنے نفسوں کو بیچ دیا۔(۱)

سورۂ انعام کی ۱۲ویں اور ۲۰ویں آیت میں فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم فَهُم لَا يُؤمِنُونَ﴾ جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا وہ لوگ تو ایمان نہیں لائیں گے۔

اس طرح کی آیات میں بعض مفسرین نے کوششیں کی ہیں کہ کسی طرح مذکورہ آیات کو انسان سے مربوط افعال، خودفراموشی، خودفروشی اور خسارے میں تبدیل کردیا جائے تاکہ عرف میں رائج مفہوم کے مطابق ہوجائے، لیکن اگر خود انسان کی حقیقت کو مدنظر رکھا جائے اور ''خودفراموشی'' کے زاویہ سے ان آیات کی طرف نظر کی جائے تو یہ تعبیریں اپنے ظاہر کی طرح معنی ومفہوم پیدا کرلیں گی، بہت سے لوگوں نے دوسرے کو اپنا نفس سمجھتے ہوئے اپنی حقیقت کو فراموش کردیا یا خود کو غفلت میں ڈال دیا ہے اور اپنی حقیقت سے غفلت، ترقی نہ دینا بلکہ اسے گرانا یعنی یہ اپنا نقصان ہے اور جو بھی اس عمل کو مثال کے طور پر کسی لالچ اور حیوانی خواہشات کے لئے انجام دیتا ہے اس نے خود کو بیچ دیا اور اپنے آپ کو حیوانوں سے مشابہ کرلیا ہے البتہ قرآن کی نظر میں مطلقاً خودفراموشی کی نفی کی گئی ہے لیکن خودفراموشی کی ملامت اس وجہ سے ہے کہ انسان خود کو تھوڑے سے دنیاوی فائدہ کے مقابلہ میں بیچ دیتا ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ''خودفراموشی'' کے مسئلہ میں قرآن کا نظریہ اور اس کے موجدوں (ہگل، فیوربیچ اور مارکس) کی نظر میں بنیادی تفاوت ہے۔ جیسا کہ بیان ہوچکا ہے کہ ان تینوں نظریات میں ''خودفراموشی'' کے اسباب میں سے ایک، دین ہے اور دین کو انسان کی زندگی سے الگ کرنا ہی

---

(۱) سورۂ بقرہ ۹۰

اس مشکل کے لئے راہ نجات ہے، لیکن قرآن کی روشنی میں مسئلہ بالکل اس قضیہ کے برخلاف ہے۔ انسان جب تک خدا کی طرف حرکت نہ کرے اپنے آپ کو نہیں پاسکتا، نیز خودفراموشی میں گرفتار رہے گا۔ آئندہ ہم دوبارہ اس موضوع پر گفتگو کریں گے اور ایک دوسرے زاویہ سے اس مسئلہ پر غور کریں گے۔

بہرحال قرآن کی روشنی میں خودفراموشی ایک روحی، فکری، اسباب وعلل اور آثار وحوادث کا حامل ہے۔ بے توجہ انسان جو دوسروں کو اپنی ذات سمجھتا ہے وہ فطری طور پر دوسرے کے وجود کو اپنا وجود سمجھتا ہے اور یہ وجود جیسا بھی ہو "خودفراموش" انسان خود ہی اس کے لئے مناسب مفہوم مرتب کرلیتا ہے، اکثر جگہوں پر یہ دوسرا مفہوم ایک ایسا مفہوم ہے جو خودفراموش انسان کی فکر کے اعتبار سے مرتب ہے۔(۱)

اس حصہ میں ہم خودفراموشی کے بعض نتائج پر گفتگو کریں گے:

خودفراموشی کے نتائج

غیر کو اصل قرار دینا

خودفراموش، اپنے تمام یا بعض افعال میں دوسرے کو اصل قرار دیتا ہے۔(۲) اور آزمائشوں، احساس درد، مرض کی تشخیص، مشکلات وراہ حل، ضرورتوں اور کمالات میں دوسروں کو اپنی جگہ قرار دیتا ہے۔ اور اپنے امور کو اسی کے اعتبار سے قیاس کرتا ہے اور اس کے لئے قضاوت وانتخاب کرتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے، قرآن مجید سود خور انسانوں کے سلسلہ میں کہتا ہے کہ:

---

(۱) قرآن مجید اور روایات میں جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کے خود اپنے نفس سے رابطہ کے سلسلہ میں متعدد و مختلف مفاہیم بیان ہوئے ہیں مثال کے طور پر خودفراموشی، خود سے غافل ہونا، اپنے بارے میں کم علمی و جہالت، خود فروشی اور خود کو نقصان پہونچانا وغیرہ ان میں سے ہر ایک کی تحقیق وتحلیل اور ایک دوسرے سے ان کا فرق اور خود فراموشی سے ان کے روابط کو بیان کرنے کے لئے مزید وقت وتحقیقات کی ضرورت ہے۔

(۲) کبھی انسان بالکل خود سے غافل ہوجاتا ہے اور کبھی اپنے بعض پہلوؤں اور افعال کے سلسلہ میں خودفراموش کا شکار ہوجاتا ہے اسی بنا پر کبھی مکمل اور کبھی اپنے بعض پہلوؤں میں حقیقت کو غیروں کے حوالہ کردیتا ہے۔

﴿الَّذِینَ یَأکُلُونَ الرِّبا لَایقُومُونَ إلاّ کَمَا یَقُومُ الّذِی یَتخَبَّطُهُ الشَیطَانُ مِنَ المَسِّ ذٰلِکَ بِأنَّهُم قَالُوا إِنَّمَا البَیعُ مِثلُ الرِّبَا...﴾(۱)

جولوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہ ہوسکیں گے (کوئی کام انجام نہیں دیتے ہیں)(۲) مگر اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے لپٹ کے (ضرر پہونچا کر) مخبوط الحواس بنادیا ہو (اس کی استقامت کو ختم کردیا ہو) یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگ اس بات کے قائل ہوگئے کہ جس طرح خرید وفروش ہے اسی طرح سود بھی ہے

آیت شریفہ کے مفاد میں تھوڑی سی فکر بھی پڑھنے والے کو اس نتیجہ پر پہونچاتی ہے کہ آیت میں سود اور سود کھانے والوں کو محور بنانے کی بنیاد پر اس بحث کی فطری انداز کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کہا جائے: سود کھانے والوں کے لئے ایسے حالات پیدا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ سود کھانے والے یہ کہتے تھے کہ سود، خرید وفروش کی طرح ہے اور اگر خرید وفروش میں کوئی حرج نہیں ہے تو سود میں بھی کوئی حرج نہیں ہے لیکن جیسا کہ ملاحظہ ہوا ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: سود کھانے والوں نے کہا خرید وفروش ربا کی طرح ہے، اس سخن کی توجیہ وتوضیح میں بعض مفسروں نے کہا ہے: یہ جملہ معکوس سے تشبیہ اور مبالغہ کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی گفتگو کا تقاضا یہ تھا کہ ربا کو خرید وفروش سے تشبیہ دی جاتی، مبالغہ کی وجہ سے قضیہ اس کے برعکس ہوگیا اور خرید وفروش کی ربا سے تشبیہ ہوگئی ہے۔ (۳) بعض مفسرین معتقد

.....

(۱) بقرہ ۲۷۵۔ (۲) ﴿لَایقُومُونَ إلاّ کَمَا یَقُومُ ...﴾ جملہ کے مراد میں دو نظریے ہیں: جیسا کہ اس مقالہ میں ذکر ہوا ہے، پہلا نظریہ یہ ہے کہ آیت دنیا میں رباخوار انسان کے رفتار وکردار کو بیان کررہی ہے اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ آخرت میں رباخواروں کے رفتار وکردار کی نوعیت کو بیان کرنا مقصود ہے، اکثر مفسرین نے دوسرے نظریہ کو انتخاب کیا ہے لیکن رشید رضا نے ''المنار'' میں اور مرحوم علامہ طباطبائی نے ''تفسیر المیزان'' میں پہلے نظریہ کو انتخاب کیا ہے. ملاحظہ ہو: رشید رضا؛ تفسیر المنار، ج۳ ص۹۴، علامہ طباطبائی؛ المیزان ج۲ ص۴۱۲۔۴۱۳۔ (۳) آیہ شریفہ کے ذیل میں شیعہ وسنی تفاسیر منجملہ روح المعانی ومجمع البیان کی طرف رجوع کریں۔

ہیں کہ چونکہ سودخوراپنے اعتدال کوکھوبیٹھا ہے لہٰذااس کے لئے خریدوفروش اوررباميں کوئی فرق نہیں ہےاور یہ کہہ سکتا ہے کہ ربا،خریدوفروش کی طرح ہےاسی طرح ممکن ہے یہ بھی کہے خریدوفروش ربا کی طرح ہے۔اس نے ان دونوں کے درمیان مساوات برقرارکیا ہے۔(۱)

ان دوتوجیہوں میں مناقشہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ توضیح وتبیین سے بہتر یہ ہے کہ خود سے بےتوجہی اوردوسروں کواصل قراردینے کے اعتبار سے مطلب کی وضاحت کی جائے خودسے بےتوجہ انسان جودوسرے کواصل قراردیتا ہے دوسروں کے شان واحترام کے لئے بھی اصل کا قائل ہےاورسبھی فرعی مسائل اورگوشوں میں اصل دوسروں کوبناتا ہے،سودخورانسان کی نگاہ میں سودخوری اصل ہےاورخریدوفروش بھی ربا کی طرح ہے جب کہ حقیقت میں وہ یہ سوچتا ہے کہ ربا میں نہ فقط کوئی حرج ہے بلکہ سودحاصل کرنے کا صحیح راستہ رباخوری ہے نہ کہ خریدوفروش ہے،خریدوفروش کوبھی فائدہ حاصل کرنے میں رباسے مشابہ ہونے کی وجہ سے جائز سمجھا جاتا ہے۔سودخورانسان کوایسا حیوان سمجھتا ہے جو جتنا زیادہ دنیا سے فائدہ اٹھائے اور بہرہ مند ہووہ کمال اور ہدف سے زیادہ نزدیک ہےاورسود خوری اس بہرہ مندی کا کامل مصداق ہے لہٰذاخریدوفروش کی بھی اسی طرح توجیہ ہونا چاہیئے !۔

روحی تعادل کادرہم برہم ہونا

اگرانسان اپنے آپ سے بےتوجہ ہوجائے اوراپنے اختیارکی باگ ڈوردوسرے کے ہاتھ سپردکردےتووہ دودلیلوں سے اپنے تعادل کوکھودے گا: پہلی دلیل یہ ہے کہ دوسرے کا طرزعمل چونکہ اس کے وجود کے مطابق نہیں ہے لہٰذاعدم تعادل سے دوچارہوجائے گااوردوسری دلیل یہ ہے کہ دوسرا مختلف اورمتعددموجودات کا حامل ہے لہٰذااگردوسرا موجودات کی کوئی خاص نوع ہومثال کے طور پر انسانوں میں بہت سے مختلف افراد ہیں ،یہ مختلف موجودات یا متعدد افرادکم ازکم مختلف ومتضاد

.....

(۱) ملاحظہ ہو: علامہ طباطبائی،المیزان ج۲ص۴۱۵

خواہشات کے حامل ہیں جو اپنے آپ سے بے توجہ انسان کے تعادل کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔

قرآن مجید مشرکین کو اپنے آپ سے بے توجہ مانتے ہوئے کہتا ہے:

﴿ءَ أَربابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيرٌ أَمِ اللّٰهُ الوَاحِدُ القَهَّارُ﴾

کیا جدا جدا معبود اچھے ہیں یا خدائے یکتا وغلبہ پانے والا (۱)

مزید یہ بھی فرماتا ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيهِ شُرَكَآءُ مُتَشَاكِسُونَ وَ رَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ هَل يَستَوِيَانِ مَثَلاً...﴾ (۲)

خدا نے ایک مثل بیان کی ہے کہ ایک شخص ہے جس میں کئی (مالدار) جھگڑالو شریک ہیں اور ایک غلام ہے جو پورا ایک شخص کا ہے کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟

﴿لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُم عَن سَبِيلِهِ﴾ (۳)

اور دوسرے راستوں (راہ توحید کے علاوہ جو کہ مستقیم راہ ہے) پر نہ چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے تتر بتر کر دیں گے۔

سورۂ بقرہ کی ۲۷۵ ویں آیت بھی جیسا کہ ذکر ہو چکی ہے سود خور انسان کے اعمال کو اس مرگی زدہ انسان کی طرح بتاتی ہے جس میں تعادل نہیں ہوتا ہے اور اس کے اعمال میں عدم تعادل کو فکری استقامت اور روحی تعادل کے نہ ہونے کی وجہ بیان کیا ہے۔ (۴)

.....

(۱) یوسف، ۳۹ (۲) زمر، ۲۹

(۳) انعام ۱۵۳۔

(۴) رباخوار انسان کے رفتار و کردار کے متعادل نہ ہونے کے بارے میں اور اس کے تفکرات کے سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے. ملاحظہ ہو: علامہ طباطبائی؛ المیزان ج ۲ ص ۴۱۳ و ۴۱۴۔

ہدف ومعیار کا نہ ہونا

گذشتہ بیانات کی روشنی میں، خودفراموش انسان بے ہدفی سے دوچار ہوتا ہے، وہ خود معقول اور معین شکل میں کسی ہدف کو انتخاب نہیں کرتا ہے اور اپنی زندگی اور اعمال کے سلسلہ میں متردد ہوتا ہے۔ قرآن منافقین کے بارے میں جو خودفراموش لوگوں کا ایک گروہ ہے اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿مُذَبذَبِينَ بَينَ ذَالِکَ لَا إِلَىٰ هٰولآءِ وَ لآ إِلىٰ هٰولآءِ وَ مَن يُضلِلِ اللّٰهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلاً﴾(۱)

ان کے درمیان کچھ مردّد ہیں، نہ وہ مومنین میں سے ہیں اور نہ ہی وہ کافروں میں سے ہیں جسے خدا گمراہی میں چھوڑ دے اس کی تم ہرگز کوئی سبیل نہیں کرسکتے۔(۲)

ایسے لوگ حضرت علیؑ کے فرمان کے مطابق ''يَمِيلونَ معَ كُل رِيح'' کے مصداق ہیں (جس سمت بھی ہوا چلتی ہے حرکت کرتے ہیں) اور دوسرے جزء کے بارے میں کہا گیا ہے کہ متعدد وپراکندہ ہیں، ان کا کوئی معیار نہیں ہے بیگانوں کی کثرت بے معیاری اور بے ہدفی انسان کے لئے فراہم کرتی ہے۔

حالات کی تبدیلی کے لئے آمادگی وقدرت کا نہ ہونا

خودفراموش انسان جو خود کو غیر سمجھتا ہے وہ اپنی حقیقت سے غافل ہے یا اپنی موجودہ حالت کو مطلوب سمجھتے ہوئے اپنی حالت میں کسی بھی تبدیلی کے لئے حاضر نہیں ہے، اور اس کے مقابلہ میں مقاومت کرتا ہے یا اپنی اور مطلوب حالت سے غفلت کی بنا پر تبدیلی کی فکر میں نہیں ہے۔

(۱) سورۂ نساء ۱۴۳۔(۲) خداوند عالم کا انسان کو گمراہ کرنا اس کی خواہش کے بغیر جبری طور پر نہیں ہے بلکہ یہ انسان ہے جو اپنے غلط انتخاب کے ذریعہ ایسی راہ انتخاب کرتا ہے جس میں داخل ہونے سے ضلالت وگمراہی سے دچار ہوتا ہے اسی بنا پر دوسری آیات میں مذکور ہے کہ خداوند عالم ظالمین (۲۷/ابراہیم) فاسقین (۲۶/بقرہ)، اسراف کرنے والے، بالکل واضح حقائق میں شک کرنے والوں (۳۴/غافر) اور کافروں (۷۴/غافر) کو گمراہ کرتا ہے۔

نتیجتاً اپنی حالت کی تبدیلی پر قدرت نہیں رکھتا ہے، چونکہ یہ سب اس کی دانستہ اختیار وانتخاب کی وجہ سے ہے لہٰذا ملامت کے لائق ہے، بہت سی آیات جو کافروں اور منافقوں کی ملامت کرتے ہوئے ان کی راہ ہدایت کو مسدود اور ان کی دائمی گمراہی کو حتمی بتاتے ہیں مثال کے طور پر ﴿وَ مَن يُضلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِن هَادٍ ﴾(۱) ''جس کو خدا گمراہ کردے اس کے لئے کوئی ہادی نہیں ہے'' یہی واقعیت ہے کہ جس کی بنا پر یہ لوگ پیغمبروں کی روشن اور قاطع دلیلوں کے مقابلہ میں اپنے تھوڑے سے علم پر خوش ہیں:

﴿فَلَمَّا جَاءَ تهُم رُسُلُهُم بِالبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِنَ العِلمِ﴾

پھر جب پیغمبر (الٰہی) ان کے پاس واضح وروشن (ان کی طرف) معجزہ لے کر آئے تو جو (تھوڑا سا) علم ان کے پاس تھا اس پر نازاں ہو گئے۔(۲)

اور دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿وَ مَن أَظلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِأيَاتِ رَبِّهِ فَأَعرَضَ عَنهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَت يَدَاهُ إِنَّا جَعَلنَا عَلىٰ قُلُوبِهِم أَكِنَّةً أَن يَفقَهُوهُ وَ فِي ءَاذَانِهِم وَقراً وَ إِن تَدعُهُم إِلىٰ الهُدىٰ فَلَن يَهتَدُوا إِذاً أَبَداً﴾(۳)

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو خدا کی آیتیں یاد دلائی جائیں اور وہ ان سے روگردانی کرے اور اپنے پہلے کرتوتوں کو جو اس کے ہاتھوں نے کئے ہیں بھول بیٹھے ہم نے خود ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ (قرآن) کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کردی ہے (تا کہ اس کو نہ سن سکیں) اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ بھی تو یہ ہرگز کبھی روبراہ ہونے والے نہیں ہیں۔

آئندہ ہم کہیں گے کہ گذشتہ اعمال کو فراموش کرنا اور ان سے استفادہ نہ کرنا، خود فراموشی

.....

(۱) سورہ رعد، ۳۳۔ زمر، ۲۳ و ۳۶۔ غافر، ۳۳۔ (۲) غافر، ۸۳ (۳) سورۂ کہف، ۵۷

کااہم سبب ہے، اس آیت میں بھی حالات کی اصلاح اور تبدیلی پر قادر نہ ہونا خودفراموشی کی نشانی کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔

مادہ اور مادیات کی حقیقت

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ انسان کے حقیقی وجود کو اس کا روحانی اور معنوی پہلو مرتب کرتا ہے، لیکن اگر انسان خود کو غیر سمجھے گا تو ظاہر ہے کہ اس نے دوسرے فرد کے وجود کو اپنا وجود سمجھا ہے۔ قرآن کے اعتبار سے بعض خودفراموش افراد ہمیشہ اپنی حقیقی جگہ، حیوانیت کو بٹھاتے ہیں اور جب حیوانیت انسانیت کی جگہ قرار پا جائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ جو بھی ہے یہی جسم اور مادی نعمتیں ہیں، تو ایسی صورت میں انسان مادی جسم اور حیوانی خواہشات کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس کی دنیا بھی مادی دنیا کے علاوہ کچھ نہیں ہے، ایسے حالات میں خودفراموش انسان کہے گا ﴿وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً﴾(۱) ''میں گمان نہیں کرتا تھا کہ قیامت بھی ہے'' اور کہے گا کہ: ﴿مَا هِيَ إِلاَّ حَيَاتُنَا الدُّنيَا نَمُوتُ وَ نَحيَا وَ مَا يُهلِكُنَا إِلاَّ الدَّهرُ﴾(۲) ''ہماری زندگی تو بس دنیا ہی ہے، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو تو بس زمانہ ہی مارتا ہے''

اس فکر کے اعتبار سے اس انسان کی ضرورتیں بھی حیوانی ضرورتوں کی طرح ہو جائیں گی جیسے کھانا، پینا، اوڑھنا، پہننا اور دوسرے دنیاوی لذتوں سے بہرہ مند ہونا ﴿وَ الَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَ يَأكُلُونَ كَمَا تَأكُلُ الأَنعَامُ﴾(۳) اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں جانوروں کی طرح کھاتے ہیں اور دنیاوی لذتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں جیسے کہ ان کا کمال اسی مادی بہرمندی و دنیاوی کمالات اور اسی مسرت بخش لذتوں کا حصول ہے۔ ﴿وَ فَرِحُوا بِالحَيَاةِ الدُّنيَا﴾(۴) ایسے انسان کے لئے ذرا سی جسمانی بیماری بہت ہی اہم اور بے تابی کا سبب بن جاتی ہے ﴿إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً﴾(۵) ''جب اسے تکلیف چھو بھی گئی تو گھبرا گیا'' لیکن معنوی تنزل کی کثرت

(۱) کہف، ۳۶ (۲) جاثیہ، ۲۴ (۳) محمد، ۱۲ (۴) رعد، ۲۶ (۵) معارج، ۲۰۔

جس سے وہ دوچار ہوا ہے اور روحی وجسمانی بیماری کا پہاڑ جس سے وہ جاں بلب ہے درک نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اعمال جو بیماری اور سقوط کا ذریعہ ہیں انہیں اچھا سمجھتا ہے اس لئے کہ اگر حیوان ہے تو یقیناً یہ چیزیں اس کے لئے بہتر ہیں اور ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ خود کو حیوان سمجھتا ہے۔

﴿قُل هَل نُنَبِّئُكُم بِالأَخسَرِينَ أعمَالاً ☆ الَّذينَ ضَلَّ سَعيُهُم فِيالحَياةِ الدُّنيَا وَ هُم يَحسَبُونَ أَنَّهُم يُحسِنُونَ صُنعاً﴾(۱)

تم کہدو کہ کیا ہم ان لوگوں کا پتہ بتادیں جو لوگ اعمال کی حیثیت سے بہت گھاٹے میں ہیں، وہ لوگ جن کی دنیاوی زندگی کی سعی وکوشش سب اکارت ہوگئی اور وہ اس خام خیال میں ہیں کہ وہ یقیناً اچھے اچھے کام کررہے ہیں۔

ایسا انسان اگر کسی درد کو حیوان کا درد سمجھے، تو علاج کو بھی حیوانی علاج سمجھتا ہے اور سبھی چیزوں کو مادی زاویہ سے دیکھتا ہے، حتی اگر خدا اس کو سزا دے تو عبرت وبازگشت کے بجائے اس سزا کی بھی مادی تجزیہ وتحلیل کرتا ہے۔

﴿وَ مَا أَرسَلنَا فِی قَريَةٍ مِن نَبِیٍّ إلاّ أَخَذنَا أهلَهَا بِالبَأسَاءِ وَ الضَّرَّاءِ لَعَلَّهُم يَضَّرَّعُونَ ☆ ثُمَّ بَدَّلنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الحَسَنَةَ حَتّیٰ عَفَوا وَّ قَالُوا قَد مَسَّ ءَ اٰبَاءَ نَا الضَّرَّاءُ وَ السَّرَّاءُ فَأَخَذنَاهُم بَغتَةً وَ هُم لا يَشعُرُونَ﴾(۲)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر وہاں کے رہنے والوں کو سختی اور مصیبت میں مبتلا کیا تا کہ وہ لوگ گڑگڑائیں، پھر ہم نے تکلیف کی جگہ آرام کو بدل دیا یہاں تک کہ وہ لوگ بڑھ نکلے اور کہنے لگے کہ اس طرح کی تکلیف وآرام تو

.....

(۱) کہف، ۱۰۳و۱۰۴۔

(۲) اعراف، ۹۴و۹۵۔

ہمارے آباء واجداد کو پہونچ چکی ہے تب ہم نے بڑی بولی بولنے کی سزا میں گرفتار کیا اور وہ بالکل بے خبر تھے۔

عقل ودل سے استفادہ نہ کرنا

جو بھی خودفراموشی کا شکار ہوتا ہے وہ شیطان، حیوان یا کسی دوسرے وجود کو اپنی ذات سمجھتا ہے اور اس کے زیر اثر ہو جاتا ہے اور خود کو اسی دنیا اور اس کی لذتوں میں منحصر کر لیتا ہے، آخر کار اپنے انسانی عقل وقلب کی شناخت کے اسباب پر مہر لگا کر حقیقت کی راہوں کو اپنے لئے بند کر لیتا ہے۔

﴿ذٰلکَ بِأنَّهُمُ استَحَبُّوا الحَیَاةَ الدُّنیَا عَلیٰ الآخِرَةِ وَ أنَّ اللّٰهَ لا یَهدِی القَومَ الکَافِرِینَ ☆ أولٰئِکَ الَّذِینَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلیٰ قُلُوبِهِم وَسَمعِهِم وَ أبصَارِهِم وَ أولٰئِکَ هُمُ الغَافِلُونَ﴾(۱)

اس لئے کہ ان لوگوں نے دنیا کی چند روزہ زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور وہ اس وجہ سے کہ خدا کافروں کو ہرگز منزل مقصود تک نہیں پونچایا کرتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور ان کی آنکھوں پر خدا نے علامت مقرر کر دی ہے جب کہ وہ لوگ بے خبر ہیں۔

قلب وسماعت اور ان کی آنکھوں پر مہر لگانا حیوانی زندگی کے انتخاب اور اسی راہ پر گامزن ہونے سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ سب حیوانی زندگی کے انتخاب کا نتیجہ ہے اسی بنا پر ایسا انسان حیوان سے بہت پست ہے ﴿أولٰئِکَ کَالأنعَامِ بَل هُم أضَلُّ أولٰئِکَ هُمُ الغَافِلُونَ﴾(۲) اس لئے کہ حیوانات نے حیوانیت کا انتخاب نہیں کیا ہے بلکہ حیوان خلق ہوئے ہیں اور ان کی حیوانیت کی راہ میں خودفراموشی نہیں ہے لیکن انسان جو انسان بنایا گیا ہے اگر حیوانیت کو انتخاب کرے تو یہ اس کے خودفراموش ہونے کی وجہ ہے۔

---

(۱) نحل، ۱۰۷ و ۱۰۸ (۲) اعراف، ۱۷۹

خودفراموشی اور حقیقی توحید

ممکن ہے کہ کہا جائے کہ مومن انسان بھی خدا کو اپنے آپ پر حاکم قرار دیتا ہے، اس کی خواہش کو اپنی خواہش سمجھتا ہے اور جو بھی وہ کہتا ہے عمل کرتا ہے اور توحید و ایمان کا نقطہ اوج بھی سراپا اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کرنا اور خود کو فراموش کرنا ہے، اس طرح سے تو موحد انسان بھی خودفراموش ہے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ انسان کے لئے ایک الٰہی واقعیت و حقیقت ہے جس سے وہ وجود میں آیا ہے اور اسی کی طرف پلٹایا جائے گا، تو اس کی حقیقت و شخصیت، خود خدا سے مربوط اور اسی کے لئے تسلیم ہونا ہی اپنے آپ کو پالینا ہے، خدا ہی ہماری حقیقت ہے اور ہم خدا کے سامنے تسلیم ہو کے اپنی حقیقت کو پالیں گے۔

ع: ہر کس کہ دور ماند از اصل خویش باز جوید روزگار وصل خویش

جو بھی اپنی حقیقت سے دور ہو گیا وہ ایک دن اپنی حقیقت کو ضرور پالے گا۔

﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيهِ رَاجِعُونَ﴾(۱) ''ہم خدا کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے'' اگر خود کو درک کرلیا تو خدا کو بھی درک کرلیں گے، اگر اس کے مطیع ہو گئے اور خدا کو درک کرلیا تو خود کو گویا پالیا ہے۔ ''در دو چشم من نشستی کہ از من من تری'' اگر تم میری آنکھوں میں سما گئے ہو تو گویا تم میں مجھ سے زیادہ منیت ہے۔ اس اعتبار سے حدیث ''مَن عَرفَ نَفسَه فَقَد عَرفَ رَبَّه'' ''جس نے خود کو پہچانا یقیناً اس نے اپنے رب کو پہچان لیا'' اور آیت ﴿وَ لا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُم أَنفُسَهُم﴾(۲) کے لئے ایک نیا مفہوم اور معنی ظاہر ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض آیات میں خود کو اہمیت دینے کی ملامت سے مراد اپنے نفس کو اہمیت دینا اور آخرت سے غافل ہونا اور خدا کے وعدوں پر شک کرنا ہے جیسے یہ آیت:

.....

(۱) سورۂ بقرہ ۱۵۶ (۲) حشر، ۱۹

﴿وَ طَائِفَةٌ قَد أَهَمَّتهُم أَنفُسُهُم يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيرَ الحَقِّ ظَنَّ الجَاهِلِيَّةِ﴾ اورایک گروہ جن کو (دنیاوی زندگی) اوراپنی جان کی فکرتھی خدا کے ساتھ زمانہ جاہلیت جیسی بدگمانیاں کرنے لگے۔(۱)

اجتماعی اورسماجی بےتوجہی (اجتماعی حقیقت کا فقدان)

خودفراموشی کبھی فردی ہےاور کبھی اجتماعی ہوتی ہے، جو کچھ بیان ہو چکا ہے فردی خودفراموشی سے مربوط تھا۔لیکن کبھی کوئی معاشرہ یا سماج خودفراموشی کا شکار ہوجاتا ہےاور دوسرے معاشرہ کواپنا سمجھتا ہے، یہاں بھی دوسرے معاشرہ کی حقیقت کواپنی حقیقت سمجھتا ہےاور دوسرے معاشرہ کواصل قراردیتا ہے۔

تقی زادہ جیسے افراد کہتے ہیں :ہمارے ایرانی معاشرہ کی راہ ترقی یہ ہے کہ سراپا انگریز ہوجائیں،ایسے ہی افراد ہمارے معاشرہ کوخودفراموش بنادیتے ہیں،اوراسی طرح کے لوگ مغربی معاشرہ کواپنے لئے اصل قراردیتے ہیں اورمغرب کی مشکلات کواپنے سماج ومعاشرہ کی مشکل اور مغرب کے راہ حل کواپنے معاشرہ کے لئے راہ حل سمجھتے ہیں لیکن جب مغربی لوگ آپ کی مشکل کا حل پیش نہ کرسکےتو یہ کہدیا کہ یہ مہم نہیں ہے کیوں کہ مغرب میں بھی ایسا ہی ہے بلکہ ایسا ہونا بھی چاہیئے اور ایک ترقی یافتہ معاشرہ کا یہی تقاضا ہےاورایسے مسائل تو ترقی کی علامت شمار ہوتے ہیں!۔

جب اجتماعی وسماجی مسائل ومشکلات کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی ہےتو وہ چیزیں جومغرب میں اجتماعی مشکل کے عنوان سے بیان ہوئی ہیں انہیں اپنے معاشرہ کی مشکل سمجھتے ہیں اور جب کسی مسئلہ کوحل کرنا چاہتے ہیں تو مغرب کے راہ حل کوتلاش کرتے ہیں اوراس کوکاملاً قبول کرتے ہوئے اس کی نمائش کرتے ہیں حتی اگر یہ کہا جائے کہ شاید ہمارا معاشرہ مغربی معاشرہ سے جداہےتو کہتے ہیں پرانی تاریخ نہ دہراؤ، وہ لوگ تجربہ اور خطا

.....

(۱) آل عمران،۱۵۴۔

کے مرحلہ کوانجام دے چکے ہیں، ایسے افراداعتبارات، خوداعتمادی، دینی تعلیمات حتی کہ قومی اقدارکومعاشرہ کی شناخت میں اوراجتماعی مسائل اوراس کے بحران سے نکلنے کی راہ میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔

جومعاشرے دوسرے معاشرہ کواپنی جگہ قرار دیتے ہیں وہ دوسرے کے آداب ورسوم میں گم ہوجاتے ہیں، انتخاب واقتباس نہیں کرتے، کاپی کرتے ہیں، فعال نہیں ہوتے بلکہ فقط اثر قبول کرتے ہیں۔اقتباس وہاں ہوتا ہے جہاں اپنائیت ہو، اپنے رسم ورواج کو پیش کر کے موازنہ کیا گیا ہواوراس میں بہترین کا انتخاب کیا گیا ہو، لیکن اگر کوئی معاشرہ خودفراموش ہوجائے تواپنے ہی آداب ورسوم کو نقصان پہونچاتا ہے، تمام چیزوں سے چشم پوشی کرتا ہےاورخودکوبھول جاتا ہے۔

استکباری معاشروں کا ایک کام یہی ہے کہ ایک معاشرہ کوخودفراموشی کا شکار بنادیں، جب کوئی معاشرہ خودفراموشی کا شکار ہوجائے تواس کے آداب ورسوم پر یلغار کی ضرورت نہیں ہے۔ثقافتی تفاہم کی صورت میں بھی دوسروں کے آداب ورسوم اپنائے جاتے ہیں۔وہ چیزیں جوآداب ورسوم پہ حملہ کا سبب واقع ہوتی ہیں وہ معاشرہ کے افراد ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہیں۔چہ جائیکہ شرائط ایسے ہوں کہ دشمن فتح وغلبہ کے لئے یعنی آداب ورسوم کومنتقل کرنے کے لئے نہ سبھی عناصر بلکہ اپنے پست عناصر کے لئے منظّم پروگرام اور پلان رکھتے ہوں توایسی صورت میں اس معاشرہ کی تباہی ونابودی کے دن قریب آچکے ہیں اورآداب ورسوم واقتدارمیں سے کچھ بھی نہیں بچاہے جب کہ اس کے افراد موجود ہیں اوروہ معاشرہ اپنی ساری شخصیت کھوچکا ہےاورمسخ ہوگیا ہے۔(۱)

ابنای روزگار بہ اخلاق زندہ اند　　قومی کہ گشت فاقد اخلاق مردنی است

دنیاکےلوگ اپنے اخلاق کی وجہ سے زندہ ہیں، جوقوم اخلاق سے عاری ہووہ نابودہونے والی ہے۔

.....

(۱) اقبال لاہوری؛امام خمینی اور مقام معظم رہبری کی دینی اوراجتماعی دانشور کی حیثیت سے استقلال وپائداری کی تقویت کے حوالے سے بہت زیادہ تاکید نیز اپنی تہذیب وثقافت کوباقی رکھنا بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

اپنے نئے انداز کے ساتھ علم پرستی (۱) انسان پرستی (۲) مادہ پرستی (۳) نیز ترقی اور پیشرفت کوصرف صنعت اورٹکنالوجی میں منحصر کرنا آج کی دنیا اور معاشرے میں خودفراموشی کی ایک جدید شکل ہے۔(۴)

خودفراموشی کا علاج

خودفراموشی کے گرداب میں گرنے سے بچنے اوراس سے نجات کے لئے تنبیہ اور غفلت سے خارج ہونے کے بعد تقوی کے ساتھ ماضی کے بارے میں تنقیدی جستجو سودمند ہے، اگر فرد یا کوئی معاشرہ اپنے انجام دیئے گئے اعمال میں دوبارہ غور وفکر نہ کرے اور فردی محاسبہ نفس نہ رکھتا ہواور معاشرہ کے اعتبار سے اپنے اور غیر کے آداب ورسوم میں کافی معلومات نہ رکھتا ہو نیز اپنے آداب و رسوم میں غیروں کے آداب ورسوم کے نفوذ کر جانے کے خطرے سے آگاہ اور فکرمند نہ ہوتو حقیقت سے دور ہونے کا امکان بہت زیادہ ہے اور یہ دوری اتنی زیادہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسان خود کو نیز اپنی تہذیب کوفراموش کردے اور خودفراموشی کا شکار ہوجائے ایسے حالات میں اس کیلئے خودفراموشی سے کوئی راہ نجات ممکن نہیں ہے، قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلتَنظُر نَفسٌ مَا قَدَّمَت لِغَدٍ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ إنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعمَلُونَ ☆ وَ لا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأنسَاهُم أَنفُسَهُم أولٰئِکَ هُمُ الفَاسِقُونَ ﴾(۵)

اے ایماندارو! خدا سے ڈرو، اور ہر شخص کو غور کرنا چاہیئے کہ کل کے واسطے اس نے

---

(1)Scientism. (2)Humanism. (3)Materialism.

(۴) اگرچہ معاشرتی تہذیب سے بیگانگی، انسانی اقدار کے منافی ہے لیکن توجہ رکھنا چاہیئے کہ قومی اور معاشرتی تہذیب خود بہ خود قابل اعتبار نہیں ہوتی بلکہ اسی وقت قابل اعتبار ہے جب اس کے اعتبارات اور راہ وروش انسان کی حقیقی سعادت اور عقلی و منطقی حمایت سے استوار ہوں۔(۵) سورۂ حشر، ۱۸و۱۹۔

پہلے سے کیا بھیجا ہے اور خدا سے ڈرتے رہو بیشک جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے، اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھلا بیٹھے تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے، یہی لوگ تو بدکردار ہیں۔

خودفراموشی کی مشکل سے انسان کی نجات کے لئے اجتماعی علوم کے مفکرین نے کہا ہے کہ: جب انسان متوجہ ہو جائے کہ خودفراموشی کا شکار ہو گیا ہے تو اپنے ماضی میں دوبارہ غور و فکر اور اس کی اصلاح کرے کیونکہ وہ اپنے ماضی پر نظر ثانی کئے بغیر اپنی مشکل کے حل کرنے کے سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا ہے، اور آیت میں یہ سلسلہ بہت ہی دقیق اور منظّم بیان ہوا ہے جس میں تقوی کو نقطۂ آغاز مانا ہے ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اگر زندگی کا محور تقوی الٰہی ہو تو خدا کے علاوہ انسان پر کوئی دوسرا حاکم نہیں ہوگا اور انسان خودفراموشی کے حوالے سے ضروری تحفظ سے برخوردار ہے۔ دوسرا مرحلہ: ان اعمال میں دوبارہ غور فکر ہے جسے اپنی سعادت کے لئے انجام دیا ہے۔ انسان اس وقت جب وہ کوئی کام خدا کے لئے انجام دیتا ہے ہو سکتا ہے کہ کوئی پوشیدہ طور پر اس پر حاکم ہو جائے لہٰذا ان اعمال میں بھی جس کو خیر سمجھتا ہے دوبارہ غور و فکر کرے اور کبھی اس غور و فکر میں بھی انسان غفلت اور خود فریبی سے دوچار ہو جاتا ہے، اسی بنا پر قرآن دوبارہ فرماتا ہے کہ: ﴿و اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اللہ سے ڈرو'' قرآن مجید کے مایۂ ناز مفسرین اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں کہ: آیت میں دوسرے تقوی سے مراد، اعمال میں دوبارہ غور و فکر ہے، اگر انسان اس مرحلہ میں بھی صاحب تقوی نہ تو خودفریبی سے دوچار اور خودفراموشی کی طرف گامزن ہو جائے گا، قرآن مجید فرماتا ہے کہ اے مومنو! ایسا عمل انجام نہ دو جس کی وجہ سے خودفراموشی سے دوچار ہو کر خدا کو بھول جاؤ، اس لئے فقط اعمال میں دوبارہ غور و فکر کافی نہیں ہے، قرآن کی روشنی میں گذشتہ اعمال کا محاسبہ تقوی الٰہی کے ہمراہ ہونا چاہیئے تا کہ مطلوب نتیجہ حاصل ہو سکے۔

آخری اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شاید ماضی میں افراد یا معاشرے خود اپنے لئے پروگرام بنایا

کرتے تھے اور اپنے آپ کو خودفراموشی کی دشواریوں سے نجات دیتے تھے یا اپنے آپ کو فراموش کر دیتے تھے، لیکن آج جب کہ انسانوں کا آزادانہ انتخاب اپنی جگہ محفوظ ہے تو معمولاً دوسرے لوگ انسانی معاشرے کے لئے پروگرام بناتے ہیں، اور یہ وہی (اسلامی) تہذیب پر حملہ ہے جو ہمارے دور کا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے، یہ تصور نہ ہو کہ جب ہم اپنے آپ سے غافل و بے خبر ہیں تو ہمارے خلاف سازشیں نہیں ہو رہی ہیں ہمیشہ اس عالمی ممالک کے اجتماعی گروہ، سیاسی پارٹیاں، استعماری عوامل اور جاہ طلب قدرتیں اپنے مادی اہداف کی وجہ سے اپنے مقاصد کے حصول اور اس میں مختلف معاشروں اور افراد سے سوء استفادہ کے لئے سازشیں رچتے ہیں۔ یہ سمجھنا بھولے پن کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ انسان کی آرزوؤں، حقوق بشر اور انسان دوستانہ اہداف کے لئے دوسرے انسانوں اور معاشروں سے جنگ یا صلح کرتے ہیں، ایسے ماحول میں ان سازشوں اور غیروں کے پروگرام اور پلان سے غفلت، خطرہ کا باعث ہے اور اگر ہم اس ہلاکت سے نجات پانا چاہتے ہیں تو ہمیں امیر المومنین علیؑ کے طریقہ عمل کو مشعل راہ بنانا چاہیئے آپ فرماتے ہیں:

فَما خَلقتُ ليشغلنِي أكل الطيّبات كَالبَهيمةِ المربُوطة همّها علفهَا ...وَ تلهو عمّا يراد بِها(۱)

''میں اس لئے خلق نہیں ہوا ہوں کہ مادی نعمتوں کی بہرہ مندی مجھ کو مشغول رکھے اس گھریلو جانور کی طرح، جس کا اہم سرمایہ اس کی گھاس ہے...اور جو کچھ اس کے لئے مرتب کیا گیا ہے اس سے غافل ہے۔''

اسی بنا پر کبھی انسان خود بے توجہ ہوتا ہے اور کبھی یہ غفلت دوسروں کے پروگرام اور ان کی حکمت عملی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کبھی خود کسی دوسرے کو اپنی جگہ قرار دیتا ہے اور خود سے بے توجہ اور غافل ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے افراد اس کی سرنوشت طے کرتے ہیں، اور اس سے سوء استفادہ کی فکر

---

(۱) نہج البلاغہ، کلام ۴۵۔

میں لگے رہتے ہیں اور اپنے اہداف کی مناسبت سے خودی کا رول ادا کرتے ہیں۔ اجتماعی امور میں بھی جو معاشرہ خود سے غافل ہو جاتا ہے، استعمار اس کے آداب و رسوم کی اہمیت کو بیان کرتا ہے اور اس کے لئے نمونہ عمل مہیا کرتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جتنی مقدار میں فردی خود فراموشی ضرر پہونچاتی ہے اتنی ہی مقدار میں انسان کا اپنی تہذیبی اور معاشرتی روایات سے بے توجہ ہونا بھی نقصان دہ ہے ان دو بڑے نقصان سے نجات پانے کے لئے اپنی فردی اور اجتماعی اہمیت و حقیقت کا پہچاننا اور اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا عَلَيكُم أَنفُسَكُم لا يَضُرُّكُم مَن ضَلَّ إذا اهتَدَيتُم﴾

اے ایمان والو! تم اپنی خبر لو جب تم راہ راست پر ہو تو کوئی گمراہ ہوا کرے تم کو نقصان نہیں پہونچا سکتا ہے۔(۱)

.....

(۱) سورۂ مائدہ، ۱۰۵۔

خلاصہ فصل

۱۔انسان کی خودفراموشی انسان شناسی کے مہم ترین مسائل میں سے ہے جوانسانی علوم کے مختلف موضوعات میں موردتوجہ رہی ہے۔

۲۔انسانی اوراجتماعی علوم کے مباحث میں علمی اورفنی طریقہ سے خودفراموشی کی توضیح وتحلیل کو۱۸ویں اور۱۹ویں صدی عیسوی کے بعض مفکرین مخصوصاً ہگل ، فیورنیچ اور مارکس کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

۳۔دین اورخود سے بےتوجہی کے رابطہ میں ان تین مفکروں کا وجہ اشتراک یہ ہے کہ دین، بشر کی بےتوجہی کی وجہ سے وجود میں آیا ہے، یہ گفتگوخودفراموشی کے مسئلہ میں ادیان آسمانی مخصوصا اسلام اورقرآن کے تفکر کا نقطۂ مقابل ہے۔

۴۔قرآن کی روشنی میں انسان کی حقیقت کواس کی دائمی روح ترتیب دیتی ہے جوخدا سے وجود میں آئی ہےاوراسی کی طرف پلٹ کرجائے گی۔انسان کی حقیقی زندگی عالم آخرت میں ہے جسے اس دنیا میں اپنے ایمان اور سچی تلاش سے تعمیر کرتا ہے۔لہٰذاانسان کا خداشناسی سے غفلت درحقیقت واقعیت سے غفلت ہےاوروہ انسان جوخدا کوفراموش کردے گویااس نے اپنے وجودکوفراموش کیا ہے اوراپنے آپ سے بےتوجہ ہے۔

۵۔قرآن کی نظر میں دوسرے کواپنا نفس تسلیم کرتے ہوئے اسے اصل قرار دینا، روحی تعادل کادرہم برہم ہونا، بے ہدفی ، بےمعیاری، بیہودہ حالات کی تغییر، پرقدرت اورآمادگی کانہ ہونا، مادہ اورمادیات کواصل قراردینااورعقل ودل سے استفادہ نہ کرناوغیرہ خودفراموشی کے اسباب ہیں۔

۶۔خودفراموش معاشرہ؛وہ معاشرہ ہے جواپنے اجتماعی حقیقت کوفراموش کردے اورزندگی کے مختلف گوشوں میں اپنے سے پست معاشرہ کویااپنے غیرکواپنے لئے نمونہ عمل بناتا ہے۔

۷۔خودفراموشی کے بحران سے بچنے کی راہ، اپنی حقیقت کو سمجھنا اور خود کو درک کرنا ہے، اور خودفراموشی کا علاج؛ ماضی کی تحلیل و تحقیق اور خود کو درک کرنے سے وابستہ ہے۔

تمرین

۱۔وہ مختلف مفاہیم جو ہمارے دینی آداب و رسوم میں فردی اور اجتماعی خودفراموشی پر نظارت رکھتے ہیں، کون کون سے ہیں اور ان کے درمیان کیا نسبت ہے؟

۲۔بکواس، خرافات، شکست خوردگی، دوسروں کے رنگ میں ڈھل جانا، سیاسی بے توجہی، بدنظمی غرب پرستی، علمی نشر، ٹکنالوجی، اندھی تقلید وغیرہ کا فردی اور اجتماعی خودفراموشی سے کیا نسبت ہے؟

۳۔فردی اور اجتماعی خودفراموشی سے بچنے کے لئے دین اور اس کی تعلیمات کا کیا کردار ہے؟

۴۔چند ایسے دینی تعلیمات کا نام بتائیں جو خودفراموشی کے گرداب میں گرنے سے روکتی ہیں؟

۵۔اعتبارات کے سلسلہ میں تعصب، عقیدتی اصول سے نئے انداز میں دفاع، خدا پر بھروسہ اور غیر خدا سے نہ ڈرنے وغیرہ کا خودفراموشی کے مسئلہ میں کیا کردار ہے اور کس طرح یہ کردار انجام پانا چاہیئے؟

۶۔خودفراموشی کے مسئلہ میں خواص (برگزیدہ حضرات) جوانوں، یونیورسٹیوں اور مدارس کا کیا رول ہے؟

۷۔ہمارے معاشرے میں اجتماعی و فردی خودفراموشی کو دور کرنے اور دفاع کے لئے آپ کا موردنظر طریقۂ عمل کیا ہے؟

۸۔اگر یہ کہا جائے کہ: انسان مومن بھی خدا کو اپنے آپ پر حاکم قرار دیتا ہے لہٰذا خودفراموش ہے، اس نظریہ کے لئے آپ کی وضاحت کیا ہوگی؟

مزید مطالعہ کے لئے

.آرن ریمن (۱۳۷۰) مراحل اساسی اندیشہ در جامعہ شناسی ؛ ترجمہ باقر پرہام، تہران : انتشارات آموزش انقلاب اسلامی۔

.ابراہیمی، پرتیچہر (پاییز ۱۳۶۹) نگاہی بہ مفہوم ازخود بیگانگی؛ رشد آموزش علوم اجتماعی، سال دوم۔

.اقبال لاہوری، محمد (۱۳۷۵) نوای شاعر فردایا اسرار خودی ورموز بی خودی؛ تہران: موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی۔

. پاپنہام، فریتز (۱۳۷۲) عصر جدید: بیگانگی انسان ؛ ترجمہ مجید صدری، تہران: فرہنگ، کتاب پانزدہم ،موسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی۔

.جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۶) تفسیر موضوعی قرآن ؛ ج۵ تہران: رجاء

.دریابندی، نجف (۱۳۶۹) دردبی خویشتنی ؛ تہران، نشر پرواز۔

.روزنثال و... (۱۳۷۸) الموسوعۃ الفلسفیۃ ؛ ترجمہ سمیر کرم؛ بیروت: دارالطبیعہ ۔

.زیادہ معن (۱۹۸۶) الموسوعۃ الفسفیۃ العربیۃ ؛ بیروت: معھد الانماء العربی.

.سوادگر، محمد رضا (۱۳۵۷) انسان واز خود بیگانگی (بی نا) (بی جا)

.طہ فرج عبدالقادر (۱۹۹۳) موسوعۃ علم النفس والتحلیل النفسی ؛ کویت: دارسعادۃ الصباح

.قائم مقامی، عباس؛ (خرداد و تیر ۱۳۷۰) از خود آگاہی تا خدا آگاہی؛ کیہان اندیشہ.

.کوزر، لویس (۱۳۶۸) زندگی واندیشہ بزرگان جامعہ شناسی ؛ ترجمہ محسن ثلاثی، تہران: انتشارات علمی.

. مان، (۱۴۱۴) موسوعۃ العلوم الاجتماعیہ ؛ ترجمہ عادل مختار الہواری و...؛ مکتبۃ الفلاح، الامارات

العربیۃ المتحدۃ۔
محمد تقی مصباح (۱۳۷۷) خودشناسی برای خودسازی؛قم: آموزشی وپژوهشی امام خمینیؒ۔
مطہری، مرتضی (۱۳۵۴) سیری درنہج البلاغہ؛قم: دارالتبلیغ اسلامی.
نقوی، علی محمد (۱۳۶۱) جامعہ شناسی غرب گرایی، تہران: امیر کبیر۔

ملحقات

خودفراموشی کے موجدین کے نظریات

خودفراموشی کے مسئلہ کوایجادکرنے والوں کے نظریات سے آشنائی کے لئے ہم ہگل، فیور بیچ اور مارکس کے نظریات کومختصراً بیان کریں گے۔

فرڈرِیچ ویلیم ہگل (۱) (۱۸۳۱۔۱۷۷۰)

ہگل معتقد ہے کہ یونانی شہر میں شہری (فرد) اور حکومت (معاشرہ) کا جورابطہ ہے وہ افراد کی حقیقی شخصیت ہے، یہ وہ برابری اور مساوات کا رابطہ ہے جوخودفراموشی کے مسئلہ سے عاری ہے۔ لیکن یونانی شہرومعاشرہ کے زوال کے ساتھ ہی اپنے اور دوسرے شہری رابطہ کا عقل سے رابطہ ختم ہوگیا ہے، اس مساوات اور برابری کودوبارہ متحقق کرنے کے لئے فردی وذاتی آزادی سے چشم پوشی کرنے کے علاوہ کوئی راہ نہیں ہے اور یہ وہی خودفراموشی ہے۔ ہگل خودفراموشی کی حقیقت کواس نکتہ میں پوشیدہ مانتا ہے کہ انسان احساس کرتا ہے کہ اس کی شخصی زندگی اس کی ذات سے خارج بھی ہے یعنی معاشرہ اور حکومت میں ہے۔ وہ خودفراموشی کے خاتمہ کوزمانہ روشن فکری میں دیکھتا ہے کہ جس میں خودفراموشی کوتقویت دینے والے حقائق کی کمی ہوجاتی ہے، خارجی انگیزہ ایک حقیقی چیز ہے جوسوفیصدی مادی، محسوس اور ملموس ہے۔ دینی مراکز اور حکومت خوف واضطراب پیدا کرنے والی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ مادی دنیا کا بعض حصہ ہیں

.....

(1)Georg Wilhilm Friedrich

جس میں تحلیل اور علمی تحقیق ہوتی ہے۔اس طرح وجود مطلق (خدا) صرف ایک بے فائدہ مفہوم ہوگا اس لئے کہ مادی امور میں علمی تحقیق کے باوجود کوئی وصف اس (خدا) کے لئے نہیں ہے اور نہ ہی کشف کیا جاسکتا ہے اور خدائے آفرینش، خدائے پدر، اور خدائے فعال کا مرحلہ یہیں پر ختم ہوجاتا ہے اور ایسی عظیم موجود میں تبدیل ہوجاتا ہے جس کو کسی وصف سے متصف ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح انسان کی ذات ایک اہم حقیقت اور امور کا مرکز ہوجائے گی۔ہگل معتقد تھا کہ بادشاہی اور کلیسا (حکومت ودین) کو اپنے صحیح مقام پر لانے کے لئے اصلاحی افکار نے انسان کو حاکم بنایا کہ جس نے صحیح راستہ انتخاب کیا ہے۔لیکن انسان کی حقیقت سے برتر نفس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی اور خطا میں گرفتار ہوگئے ہیں۔لیکن اس بات کا یقین ہے کہ خودفراموشی اس وقت پوری طرح سے ختم ہوگی جب قدیم آداب واخلاق نابود ہوجائیں گے۔ایسی انسانی شخصیت کو ہم نہ مانیں جو مسیحیت میں بیان ہوئی ہیں بلکہ ایسے سرمایہ داری والے معاشرہ کو ایجاد کریں جو انسانی حقوق کا علمبردار ہیں۔(۱)

فیورنیچ (۲) (۱۸۳۲-۱۷۷۵)

فیورنیچ معتقد تھا کہ انسان، حق، محبت اور خیر چاہتا ہے چونکہ وہ اس کو حاصل نہیں کرسکتا لہٰذا اس کی نسبت ایک بلندوبرتر ذات کی طرف دیتا ہے کہ جس کو انسان خدا کہتا ہے، اور اس میں ان صفات کو مجسم کرتا ہے اور اس طرح خودفراموشی سے دوچار ہوجاتا ہے، اسی بنا پر دین انسان کی اجتماعی، معنوی، مادی

---

(۱) میدان اقتصاد میں بھی ہگل نے خودفراموشی کو مدنظر رکھا وہ معتقد تھا کہ عمل کی تقسیم اور اس کا اختلاف، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اس چیز کا وہ محتاج ہوتا ہے جس کو وہ ایجاد کرتا ہے اور اپنے غیر پر اعتماد کا سبب (غیروں کی صنعت وٹکنیک) اور اس پر مسلط اور انسان سے بہتر ایسی قوت کے ایجاد کا سبب ہے جو اس کے حیز امکان سے خارج ہے اور اس طرح غیر اس پر مسلط ہوجاتا ہے۔مارکس نے اس تحلیل کو ہگل سے لیا ہے اور اس میں کسی چیز کا اضافہ کئے بغیر اپنی طولانی گفتگو سے واضح کیا ہے۔ اور اس تحلیل سے فقط بعض اقتصادی نتائج کو اخذ کیا ہے۔ملاحظہ ہو: زیادمعن؛ الموسوعة الفلسفية العربية۔

(2)Anselm Von FeuerBach.

ترقی کی راہ میں حائل سمجھا جاتا ہے، وہ معتقد ہے کہ انسان اپنی ترقی کی راہ میں دین اور خودفراموشی کی تعبیر سے بچنے کے لئے تین مرحلوں کو طے کرتا ہے یا طے کرنا چاہیئے۔ پہلے مرحلہ میں: خدا اور انسان دین کے حوالے سے باہم ملے ہوئے ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں: انسان خدا سے جدا ہونا جاتا ہے تا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے اور تیسرے مرحلہ میں: کہ جس کے حصول کے لئے فیورنیچ سبھی کو دعوت دیتا ہے وہ انسانی علم کا مرحلہ ہے جس میں انسان اپنی حقیقت کو پالیتا ہے اور اپنی ذات کا مالک ہو جاتا ہے ایک اعتبار سے انسان، انسان کا خدا ہوتا ہے اور خدا و انسان کے رابطہ کے بجائے ایک اعتبار سے انسان کا انسان سے رابطہ بیان ہوتا ہے۔(۱)

کارل مارکس (۲) (۱۸۱۸_۱۸۸۳)

کارل مارکس جو کسی بھی فعالیت کے لئے بلند و بالا مقام کا قائل ہے وہ کہتا ہے کہ انسان خدائی طریقہ سے یا عقل کے ذریعہ اپنی حقیقت کو نہیں پاتا ہے بلکہ نایاب فعل کے ذریعہ دنیا سے اتحاد برقرار رکھتے ہوئے، کردار ساز افعال نیز ہماہنگی و حقیقی اجتماعی روابط سے اپنی ذات کو درک کرتا ہے، لیکن سرمایہ داری کے نظام میں مزدوروں کا کام ہر طرح کے انسانی احترام سے خالی ہے۔ مزدور اپنے عمل کو بیچ کر فائدہ حاصل کرنے والے اسباب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نہ تو وہ اپنے فعل میں خود کو پاتا ہے اور نہ ہی دوسرے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اس فعل کا موجد ہے۔ اس طرح اس کے کام سے اس کی زندگی کے افعال اور اس کی انسانی حقیقت جدا ہے غرض یہ کہ خودفراموش ہو جاتا ہے۔

---

(۱) فیورنیچ نے انسان کا ہدف معرفت، محبت اور ارادہ بیان کیا ہے اور بعض تحریف شدہ تعلیماتِ دین سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحلیل میں کہتا ہے کہ کس طرح دین، انسان کے ارادہ، محبت اور عقل کو صحیح راہ سے منحرف اور فاسد کر دیتا ہے اور اس کو انسان کے مادی منافع کی تامین میں بے اثر بنا دیتا ہے، مارکس کے نظریہ میں دینی تعلیمات کے حوالے سے تحریف شدہ مطالب سے استفادہ کا ایک اہم کردار ہے۔

(2)Karl marx.

''فیورنیچ'' کی طرح مارکس کا یہ نظریہ ہے کہ انسان کی ساری ترقی و پیشرفت کی راہ میں دین بھی حائل ہے نیز انسان کی ناکامی کے علاوہ اس کی بے توجہی کا سبب بھی ہے، دین وہ نشہ ہے جو لوگوں کو عالم آخرت کے وعدوں سے منقلب اور ظالم حکومتوں کی نافرمانی سے روکتا ہے اور انسان کی حقیقی ذات کے بجائے ایک خیالی انسان کو پیش کرتا ہے اور اس طرح خود فراموش بنا دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ انسان پر منحصر ہے کہ دین کو نابود کر کے خود فراموشی سے نجات اور حقیقی سعادت کے متحقق ہونے کے بنیادی شرط کو فراہم کرے!(۱)

مذکورہ نظریوں کی تحقیق و تحلیل کے لئے جداگانہ فرصت و محل کی ضرورت ہے کیونکہ یہ نظریہ اپنے اصولوں کے لحاظ سے اور مذکورہ مسائل کی جو تحلیل پیش کی گئی ہے اس کے اعتبار سے اور ان نظریات میں پوشیدہ انسان شناسی کا تفکر بھی اپنے اسباب و نتائج کے اعتبار سے سخت قابل تنقید ہے لیکن اس تھوڑی سی فرصت میں ان گوشوں کی تحقیق ممکن نہیں ہے البتہ یہاں صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ تینوں نظریے اور اس سے مشابہ نظریہ ایک طرف تو انسان کو فقط اس مادی دنیا کی زندگی میں محدود کرتے ہیں اور دوسری طرف خدا کو دانستہ یا نادانستہ بشر کے ذہن کی پیداوار سمجھتے ہیں جب کہ یہ دونوں مسئلے کسی بھی استدلال و برہان سے خالی ہیں اور ان دونوں بنیادی مسائل کے ختم ہونے کے بعد ان پر مبنی تحلیلیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

.....

(۱) ملاحظہ ہو:

.بدوی، عبدالرحمٰن، موسوعۃ الفلسفۃ

.آرن، ریمن؛ مراحل اساسی اندیشہ در جامعہ شناسی، ترجمہ باقر پرہام، ج۱ ص۱۵۱، ۲۳۲۔

.زیادہ معن، موسوعة الفلسفة العربية .

.ان، مائکل، موسوعة العلوم الاجتماعية.

.کوزر، لوئیس؛ زندگی و اندیشہ بزرگان جامعہ شناسی؛ ترجمہ محسن ثلاثی؛ ص۷۵، ۱۳۱۔

۴

انسان کی خلقت

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات :

۱۔ قرآن مجید کی تین آیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے خلقت انسان کی وضاحت کریں؟

۲۔ انسان کے دو بعدی ہونے پر دلیلیں ذکر کریں؟

۳۔ روح و جسم کے درمیان اقسام رابطہ کے اسماء ذکر کرتے ہوئے ہر ایک کے لئے ایک مثال پیش کریں؟

۴۔ وہ آیات جو روح کے وجود و استقلال پر دلالت کرتی ہیں بیان کریں؟

۵۔ انسان کی واقعی حقیقت کو (جس سے انسانیت وابستہ ہے) واضح کریں؟

ہم میں سے کوئی بھی یہ شک نہیں کرتا ہے کہ وہ ایک زمانہ میں نہ تھا اور اس کے بعد وجود میں آیا جس طرح انسانوں کی خلقت کا سلسلہ زاد و ولد کے ذریعہ ہم پر آشکار ہے اور دوسری طرف تھوڑے سے تامل و تفکر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جسم و جسمانیات کے ماسواء کچھ حالات اور کیفیات مثلاً غور و فکر کرنا، حفظ کرنا، یاد کرنا وغیرہ جو ہمارے اندر پیدا ہوتی ہیں پوری طرح جسمانی اعضاء سے متفاوت ہیں، یہ عمومی و مشترک معلومات انسان کے لئے متعدد و متنوع سوالات فراہم کرتی ہیں جس میں سے بعض سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ موجودہ انسانوں کی نسل کا نکتہ آخر کہاں ہے اور سب سے پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا ہے؟

۲۔ ہم میں سے ہر ایک کی آفرینش کے مراحل کس طرح تھے؟

۳۔ ہمارے مادی حصہ کے علاوہ جو کہ سبھی دیکھ رہے ہیں کیا کوئی دوسرا حصہ بنام روح بھی موجود ہے؟

۴۔اگر انسانوں میں کئی جہتیں ہیں تو انسان کی واقعی حقیقت کو ان میں سے کون سی جہت ترتیب دیتی ہے؟

اس فصل کے مطالب اور تحلیلیں مذکورہ سوالات کے جوابات کی ذمہ دار ہیں:

انسان، دو بعدی مخلوق

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جاندار انسان بے جان موجود سے متفاوت ہوتا ہے اس طرح کہ زندہ موجود میں کوئی نہ کوئی چیز بے جان موجود سے زیادہ ہے۔آدمی جب مرجاتا ہے تو مرگ کے بعد کا وہ لمحہ موت سے پہلے والے لمحہ سے مختلف ہوتا ہے، اس مطلب کو روح کے انکار کرنے والے بھی قبول کرتے ہیں، لیکن اس کی بھی مادی لحاظ سے توجیہ کرتے ہیں۔ہم آئندہ بحث میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ کریں گے کہ روح اور روحی چیزیں مادی توجیہ قبول نہیں کرتیں ہیں۔بہر حال روح کا انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ گذشتہ زمانہ سے ادیان الٰہی کی تعلیمات اور دانشوروں کے آثار میں انسان کا دو پہلو ہونا اور اس کا روح و بدن سے مرکب ہونا نیز روح نامی عنصر کا اعتقاد جو کہ بدن سے جدا اور ایک مستقل حیثیت کا حامل ہے بیان کئے گئے ہیں۔ اس عنصر کے اثبات میں بہت سی عقلی و نقلی دلیلیں پیش کی گئی ہیں، قرآن مجید بھی وجود انسانی کے دو پہلو ہونے کی تائید کرتا ہے اور جسمانی جہت کے علاوہ جس کے بارے میں گذشتہ آیات میں گفتگو ہو چکی ہے، بہت سی آیات میں انسان کے لئے نفس و روح کا پہلو مورد توجہ واقع ہوا ہے۔

اس فصل میں سب سے پہلے جسمانی پہلو اور اس کے بعد روحانی پہلو کی تحقیق کریں گے۔

اولین انسان کی خلقت

ان آیات کی تحلیل جو انسان کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ان نتائج کو ہمارے اختیار میں قرار دیتی ہیں کہ موجودہ انسانوں کی نسل، حضرت آدمؑ نامی ذات سے شروع ہوئی ہے۔

حضرت آدمؑ کی خلقت خصوصاً خاک سے ہوئی ہے۔اور روئے زمین پر انسانوں کی خلقت کو بیان کرنے والی آیات کے درمیان مندرجہ ذیل آیات بہت ہی واضح اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ موجودہ نسل حضرت آدمؑ اوران کی زوجہ سے شروع ہوئی ہے۔

﴿یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّکُمُ الَّذِی خَلَقَکُم مِن نَفسٍ وَاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنهَا زَوجَهَا وَ بَثَّ مِنهُمَا رِجَالاً کَثِیراً وَ نِسَاءً﴾(۱)

اے لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو (وہ پروردگار) جس نے تم سب کو ایک شخص سے پیدا کیا اور اس سے اس کی ہمسر (بیوی) کو پیدا کیا اور انھیں دو سے بہت سے مرد وعورت (زمین میں) پھیل گئے۔

اس آیت میں ایک ہی انسان سے سبھی لوگوں کی خلقت کو بہت ہی صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔(۲)

﴿وَ بَدَأَ خَلقَ الإِنسَانِ مِن طِینٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسلَهُ مِن سُلالَةٍ مِن مَّاءٍ مَهِینٍ﴾

اور انسان کی ابتدائی خلقت مٹی سے کی پھر اس کی نسل گندے پانی سے بنائی۔(۳)

اس آیت میں بھی انسان کا نکتہ آغاز مٹی ہے اور اس کی نسل کو مٹی سے خلق ہوئے انسان کے نجس قطرہ سے بتایا ہے یہ آیت ان آیات کے ہمراہ جو حضرت آدمؑ کی خلقت کو (سب سے پہلے انسان کے عنوان سے) خاک ومٹی سے بیان کرتی ہے موجودہ نسل کے ایک فرد (حضرت آدم) تک منتہی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

﴿یَا بَنِی آدَمَ لا یَفتِنَنَّکُمُ الشَّیطَانُ کَمَا أَخرَجَ أَبَوَیکُم مِنَ الجَنَّةِ ...﴾(۴)

اے اولاد آدم! کہیں تمہیں شیطان بہکانہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں،

---

(۱) سورۂ نساء/۱ (۲) یہی مفاد آیت دوسری آیات میں بھی مذکور ہے جیسے اعراف ۱۸۹۔انعام، ۹۸۔زمر، ۶

(۳) سورۂ سجدہ/۷و۸۔(۴) سورۂ اعراف/۲۷

باپ کو بہشت سے نکلوادیا۔(۱)

یہ آیت بھی صراحت کے ساتھ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو نسل انسانی کا ماں، باپ بتاتی ہے۔خاک سے حضرت آدم کی استثنائی خلقت بھی قرآن کی بعض آیات میں ذکر ہے جن میں سے تین موارد کی طرف نمونہ کے طور پر اشارہ کیا جارہا ہے۔

۱. ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾

خدا کے نزدیک جیسے حضرت عیسی کا واقعہ ہے (حیرت انگیز خلقت) ویسے ہی آدم کا واقعہ بھی ہے ان کو مٹی سے پیدا کیا پھر کہا ہو جا پس وہ ہو گئے۔(۲)

حدیث، تفسیر اور تاریخی منابع میں آیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں نصاری نجران نے اپنے نمائندوں کو مدینہ بھیجا تا کہ پیغمبر اسلام سے گفتگو اور مناظرہ کریں، وہ لوگ مدینہ کی مسجد میں آئے پہلے تو اپنی عبادت بجالائے اور اس کے بعد پیغمبر سے بحث کرنے لگے:

۔جناب موسی کے والد کون تھے؟

۔عمران

آپ کے والد کون ہیں؟

۔عبداللہ

۔جناب یوسفؑ کے والد کون تھے؟

۔یعقوب

۔جناب عیسیٰؑ کے والد کون تھے؟

---

(۱) بعض لوگوں نے آیت ''ذر'' نیز ان تمام آیات سے جس میں انسانوں کو ''یابنی آدم'' کی عبارت سے خطاب کیا گیا ہے اس سے انسانی نسل کا نکتہ آغاز حضرت آدمؑ کا ہونا استفادہ کیا ہے۔(۲) سورۂ آل عمران/۵۹۔

پیغمبر تھوڑا ٹھہرے، اس وقت یہ آیت ﴿إِنَّ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ...﴾ نازل ہوئی۔(۱)

مسیحی کہتے تھے چونکہ عیسی کا کوئی انسانی باپ نہیں ہے لہٰذا ان کا باپ خدا ہے، آیت اس شبہ کے جواب میں نازل ہوئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ کیا تم معتقد نہیں ہو کہ آدم بغیر باپ کے تھے؟ عیسی بھی انہیں کی طرح ہیں، جس طرح آدم کا کوئی باپ نہیں تھا اور تم قبول بھی کرتے ہو کہ وہ خدا کے بیٹے نہیں ہیں اسی طرح عیسی بھی بغیر باپ کے ہیں اور حکم خدا سے پیدا ہوئے ہیں۔

مذکورہ نکات پر توجہ کرتے ہوئے اگر ہم فرض کریں کہ حضرت آدمؑ، انسان و خاک کے مابین ایک درمیانی نسل سے وجود میں آئے مثال کے طور پر ایسے انسانوں سے جو بے عقل تھے تو یہ استدلال تام نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ نصاری نجران کہہ سکتے تھے کہ حضرت آدمؑ ایک اعتبار سے نطفہ سے وجود میں آئے جب کہ عیسی اس طرح وجود میں نہیں آئے، اگر اس استدلال کو تام سمجھیں جیسا کہ ہے، تب ہم یہ قبول کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ حضرت آدمؑ کسی دوسرے موجود کی نسل سے وجود میں نہیں آئے ہیں۔

۲. ﴿وَ بَدَأَ خَلقَ الإنسَانِ مِن طِينٍ ☆ ثُمَّ جَعَلَ نَسلَهُ مِن سُلالَةٍ مِن مَاءٍ مَهِينٍ﴾

ان دو آیتوں میں سے پہلی آیت حضرت آدمؑ کی خاک سے خلقت کو بیان کرتی ہے اور دوسری آیت ان کی نسل کی خلقت کو نجس پانی کے ذریعہ بیان کرتی ہے، حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کی خلقت کا جدا ہونا اور ان کی نسل کا آب نجس کے ذریعہ خلق ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جناب آدمؑ کی خلقت استثنائی تھی ورنہ تفکیک وجدائی بے فائدہ ہوگی۔(۲)

(۱) مجلسی، محمد باقر؛ بحار الانوار، ج۲۱ ص۳۴۴۔ (۲) منطق کی کتابوں میں کہا گیا ہے کہ تقسیم میں ہمیشہ فائدہ کا ہونا ضروری ہے یعنی اقسام کا خصوصیات اور احکام میں ایک دوسرے سے متفاوت ہونا چاہیئے ورنہ تقسیم بے فائدہ ہوگی، آیہ شریفہ میں بھی تمام انسانوں کو سب سے پہلے انسان اور اس کی نسل میں تقسیم کیا ہے، لہٰذا اگر ان دو قسموں کا حکم خلقت کے اعتبار سے ایک ہی ہے تو تقسیم بے فائدہ اور غلط ہوگی۔

۳۔ بہت سی آیات جو خاک سے حضرت آدمؑ کی خلقت کا واقعہ اور ان پر گذشتہ مراحل؛ یعنی روح پھونکنا، خدا کے حکم سے فرشتوں کا سجدہ کرنا اور شیطان کا سجدہ سے انکار کو بیان کرتی ہیں جیسے:

﴿وَ إذ قَالَ رَبُّکَ لِلمَلائِکَةِ إنِّی خَالِقٌ بَشَراً مِن صَلصَالٍ مِن حَمَأٍ مَّسنُونٍ ☆ فَإِذَا سَوَّیتُهُ وَ نَفَختُ فِیهِ مِن رُّوحِی فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِینَ﴾

اور (یاد کرو کہ) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک آدمی کو خمیر دی ہوئی مٹی سے جو سوکھ کر کھن کھن بولنے لگے پیدا کرنے والا ہوں تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا۔(۱)

یہ بات واضح ہے کہ تمام انسان ان مراحل کو طے کرتے ہوئے جو آیات میں مذکور ہیں (خاک، بدبودار مٹی، چپکنے والی مٹی، ٹھکرے کی طرح خشک مٹی) صرف خشک مٹی سے خلق نہیں ہوئے ہیں اور فرشتوں نے ان پر سجدہ نہیں کیا ہے بلکہ مذکورہ امور فقط پہلے انسان سے مخصوص ہے یعنی حضرت آدمؑ جو استثنائی طور پر خاک (مذکورہ مراحل) سے خلق ہوئے ہیں۔(۲)

قرآن کے بیانات اور ڈارون کا نظریہ

نظریہ تکامل اور اس کے ترکیبی عناصر کے ضمن میں بہت پہلے یہ نظریہ بعض دوسرے متفکرین کی طرف سے بیان ہو چکا تھا لیکن ۱۸۵۹ء میں ڈاروین نے ایک عام نظریہ کے عنوان سے اسے پیش کیا.

---

(۱) سورۂ حجر، ۲۸و۲۹۔ (۲) اس نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے اس لئے کہ حضرت آدمؑ کی خلقت کو بیان کرنے والی آیات بہت زیادہ ہیں اور چونکہ ان کی خلقت کے بہت سے مراحل تھے، لہٰذا بعض آیات میں جیسے آل عمران کی ۵۹ ویں آیت اس کی خلقت کے ابتدائی مرحلہ کو خاک، اور دوسری آیات جیسے سورۂ انعام کی دوسری آیت؛ ۱۱/صافات؛ ۲۶/حجر اور ۱۴/الرحمٰن کی آیتوں میں ایک ایک یا چند مرحلوں کے نام بتائے گئے ہیں، جیسے کہ سورۂ سجدہ کی ۷و۸ ویں آیت کی طرح آیات میں خاک سے حضرت آدمؑ کی خلقت بیان کرتے ہوئے آدمؑ کی نسل اور ذریت کی خلقت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

چارلز ڈارون (۱) نے انسان کی خلقت کے سلسلہ میں اپنے نظریہ کو یوں پیش کیا ہے کہ انسان اپنے سے پست حیوانوں سے ترقی کر کے موجودہ صورت میں خلق ہوا ہے اور انسان کی خلقت کے سلسلہ میں اس کے نظریہ نے مسیحیت اور جدید علم کے نظریات کے درمیان بہت ہی پیچیدہ مباحث کو جنم دیا اور بعض نے اس غلط نظریہ کی بنا پر علم اور دین کے درمیان اختلاف سمجھا ہے۔(۲) ڈارون کا دعویٰ تھا کہ مختلف نباتات وحیوانات کے اقسام اتفاقی اور دھیرے دھیرے تبدیلی کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں جو کہ ایک نوع کے بعض افراد میں فطری عوامل کی بنیاد پر پایا جاتا ہے، جو تبدیلیاں ان افراد میں پیدا ہوئی ہیں وہ وراثت کے ذریعہ بعد والی نسل میں منتقل ہوگئی ہیں اور بہتر وجود، فطری انتخاب اور بقا کے تنازع میں محیط کے مطابق حالات ایک جدید نوعیت کی خلقت کے اسباب مہیا کرتے ہیں۔ وہ اسی نظریہ کی بنیاد پر معتقد تھا کہ انسان کی خلقت بھی تمام اقسام کے حیوانات کی طرح سب سے پست حیوان سے وجود میں آئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان گذشتہ حیوانوں کے اقسام میں سب سے بہتر ہے۔

ڈارون کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی یہ نظریہ سخت متنازع اور تنقید کا شکار رہا اور ''اڈوار مک کریڈی''(۳) اور ''ریون''(۴) جیسے افراد نے اس نظریہ کو بالکل غلط مانا ہے۔(۵) اور ''الفریڈ رسل ویلیس''(۶) جیسے بعض افراد نے اس نظریہ کو خصوصاً انسان کی خلقت میں نا درست سمجھا

.....

(1)Charles Robert Darwin.(3) E.Mc Crady.(4)Raven.

(6)Alfred Russel Wallace.

(۲) ڈارون نے خود صراحتاً اعلان کیا ہے کہ ''میں اپنے فکری تحولات میں وجود خدا کا انکار نہ کرسکا''، زندگی و نامہ ای چارلز ڈارون؛ ج۱ص۳۵۴ (پیرس، ۱۸۸۸) بدوی عبدالرحمٰن سے نقل کرتے ہوئے؛ موسوعۃ الفلسفۃ. ڈارون نے فطری قوانین کو ایسے اسباب وعلل اور ثانوی ضرورت کے عنوان سے گفتگو کی ہے کہ جس کے ذریعہ خداوند عالم تخلیق کرتا ہے۔ گرچہ انسان کے ذہن نے اس باعظمت استنباط کو مشکوک کر دیا ہے۔(ایان باربور، علم ودین؛ ص۱۱۲)۔

(۵) ایان باربور، علم ودین؛ ص۴۱۸و۴۲۲۔

ہے(۱) یہ نظریہ ایک خاص جرح وتعدیل کے باوجود بھی علمی اعتبار سے نیز صفات شناسی اور ژنٹیک کے لحاظ سے ایک ایسے نظریہ میں تبدیل نہیں ہوسکا کہ جس کی بے چوں چرا تثبیت ہو جائے اور متفکرین نے تصریح کی ہے کہ آثار اور موجودات شناسی کے ذریعہ انسان کے حسب ونسب کی دریافت کسی بھی طریقہ سے صحیح وواضح نہیں ہے اور انسانوں جیسے ڈھانچوں کے نمونے اور ایک دوسرے سے ان کی وابستگی، نظریہ تکامل کے طرفداروں کے مورد استناد ہونے کے باوجود ان کے نظریات میں قابل توجہ اختلاف ہے۔

''ایان باربور'' کی تعبیر یہ ہے کہ ایک نسل پہلے یہ رسم تھی کہ وہ تنہا نکتہ جو جدید انسانوں کے نسب کو گذشتہ بندروں سے ملاتا تھا، احتمال قوی یہ ہے کہ انسان اور بندر کی شباہت ایک دوسرے سے ان کے اشتقاق پر دلالت کرتی ہو اور ہوسکتا ہے کہ نئا ندرتال انسان سے ایسی نسل کی حکایت ہو جو اپنے ابتدائی دور میں بغیر نسل کے رہ گئی ہو نیز منقطع ہوگئی ہو۔(۲) اوصاف شناسی کے اعتبار سے معمولی تبدیلیوں میں بھی اختلاف نظر موجود ہے بعض دانشمندوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگرچہ معمولی تحرک قابل تکرار ہے لیکن وہ وسیع پیمانہ پر تحرک وفعالیت جو نظریہ تکامل کے لئے ضروری

(۱) گذشتہ حوالہ: ص ۱۱۱۔۱۱۴، اگرچہ نظریہ ڈارویس پر وارد تنقیدوں کے مقابلہ میں اس کے مدافعین کی طرف سے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں لیکن آج بھی بعض تنقیدیں قانع جوابات کی محتاج ہیں مثال کے طور پر ''والٹر'' جو ''ڈارون'' سے بالکل جدا، فطری طور پر سب سے پہلے انتخاب کو نظام سمجھتا ہے اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اور بندر کی عقل کے درمیان موجودہ فاصلہ کو جیسا کہ ڈارون نے اس سے پہلے ادعا کیا تھا، بدوی قبائل پر حمل نہیں کرسکتے ہیں اس لئے کہ ان کی دماغی قوت ترقی یافتہ متمدن قوموں کی دماغی قوت کے مطابق تھی لہٰذا فطری انتخاب انسان کی بہترین دماغی توانائی کی توجیہ نہیں کرسکتا ہے۔اس کا عقیدہ ہے کہ بدوی قوموں کی عقلی توانائیاں ان کی سادہ زندگی کی ضرورتوں سے زیادہ تھی، لہٰذا ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس سے چھوٹا مغز بھی کافی تھا۔فطری انتخاب کے اعتبار سے بندروں سے زیادہ انسان کو دماغ دینا چاہیئے جب کہ ایسے انسانوں کا دماغ ایک فلسفی کے دماغ سے چھوٹا ہے۔(ایان باربور؛ علم ودین؛ ص ۱۴۴ و ۱۱۵) (۲) ایان باربور؛ گذشتہ حوالہ: ص ۴۰۲ و ۴۰۳۔

ہیں بہت کم ہے۔اور مردم شماری کے قوانین کے اعتبار سے قابل پیش بینی نہیں ہے، اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ تجربہ گاہوں کے مطالعات ایک طرح کی اندرونی تبدیلیوں کی تائید کریں، لیکن تدریجی تبدیلیوں کے زیر اثر جدید اقسام کے وسیع حلقوں کی تشکیل کے اثبات سے ناتواں ہیں، اور ایک متحرک فرد کا کسی اجتماعی حلقہ اور بڑے گروہ میں تبدیل ہو جانا، ایک سوالیہ نشان ہے اور اس وسیع افعال پر کسی بھی جہت سے واضح دلائل موجود نہیں ہیں۔(۱) دوسری مشکل صفات کا میراثی ہونا ہے جب کہ ان کا اثبات معلومات واطلاعات کے فراہم ہونے سے وابستہ ہے جس کو آئندہ محققین بھی حاصل نہیں کرسکیں گے یا موجودہ معلومات واطلاعات کی وضاحتوں اور تفاسیر سے مربوط ہے جس کو اکثر ماہرین موجودات شناسی نے قبول نہیں کیا ہے۔(۲) بہر حال ان نظریات کی تفصیلی تحقیق وتنقید اہم نہ ہو نے کی وجہ سے ہم متعرض نہیں ہوں گے، مختصر یہ کہ انسان کے بارے میں ڈارون کا نظریہ تنقیدوں، مناقشوں اور اس میں تناقض کے علاوہ صرف ایک ظنی اور تھیوری سے زیادہ، کچھ نہیں ہے (۳) مزید یہ کہ اگر اس نظریہ کو قبول بھی کرلیا جائے تو کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس میں خدا کے ارادہ کے باوجود کسی ایک شئ میں بھی فطری حرکت غیر عادی طریقہ سے نقض نہ ہوئی ہو، اور حضرت آدمؑ فقط خاک سے خلق نہ ہوئے ہوں، اس کے باوجود یہ نظریہ ڈاروین کی تھیوری کے مطابق فقط انسانوں کی خلقت کے امکان کو ثابت کرتا ہے، اس راہ سے موجودہ نسل کی خلقت کی ضرورت والتزام کو ثابت نہیں کرتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے انسان اس راہ سے وجود میں آئے ہوں اور نسل منقطع ہوگئی ہو، لیکن موجودہ نسل جس طرح قرآن بیان کرتا ہے اسی طرح روئے زمین پر خلق ہوئی ہے، قابل ذکر ہے کہ قرآن

.....

(۱) گذشتہ حوالہ: ص ۴۰۳۔(۲) گذشتہ حوالہ: ص ۴۰۴۔

(۳) کارل پاپر(Karl Raimond Popper)''جستجوی ناتمام'' کتاب میں لکھتا ہے: نئے نظریہ تکامل کے ماننے والوں نے زندگی کے دوام کو انطباق یا ماحول کی سازش کا نتیجہ بتایا ہے، ایسے ضعیف نظریہ کے تجربہ کا امکان تقریباً صفر ہے (ص ۲۱۱)

ایسے انسانوں کے خلق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں جن کی موجودہ نسل ان تک نہیں پہونچتی ہے نیز ان کی خلقت کی کیفیت کے بارے میں، خاموش ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر چہ سب سے پہلے انسان کی خلقت سے مربوط آیات کے مفاہیم، انسان کے سلسلہ میں ڈاروین کی تھیوری کے مطابق نہیں ہے لہٰذا جن افراد نے قرآن کریم کے بیانات سے دفاع کے لئے مذکورہ آیات کی توجیہ کی ہے انہیں توجہ رکھنا چاہیئے کہ ایسی توجیہیں صحیح نہیں ہیں بلکہ ''تفسیر بالرای'' ہے، اس لئے کہ ایسے نظریات جو ضروری اور صحیح دلیلوں نیز تائیدوں سے خالی ہوں وہ مذکورہ آیات کی توجیہ پر دلیل نہیں بن سکتے ہیں، چہ جائے کہ توجیہ اور ظاہر آیات کے مفہوم سے استفادہ نہ کرنا فقط ایک قطعی اور مذکورہ آیات کے مخالف فلسفی یا غیر قابل تردید علمی نظریہ کی صورت میں ممکن ہے جب کہ ڈاروین کا نظریہ ان امتیازات سے خالی ہے۔

تمام انسانوں کی تخلیق

نسل انسان کی آفرینش زاد و ولد کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں گذشتہ ادوار سے آج تک پانچ نظریات بیان ہوئے ہیں۔

ارسطو نے بچہ کی خلقت کو خون حیض کے ذریعہ تسلیم کیا ہے اور اس سے ماسبق فلاسفہ نے مرد کی منی سے متولد جنین کی رشد کے لئے شکم مادر کو فقط مزرعہ سمجھا ہے۔

تیسرا نظریہ جو ۱۸ ویں صدی عیسوی کے نصف تک رائج تھا، خود بخود خلقت کا نظریہ تھا (۱) جس کے ولیم حاروے جیسے ماہرینِ وظائف اعضاء، مدافع تھے۔ (۲) چوتھا نظریہ جو ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدی میں بیان ہوا وہ نظریہ تکامل تھا (۳) جس کے لائب نیٹز، ہالر اور بونہ جیسے افراد سرسخت طرفدار تھے، یہ لوگ معتقد تھے کہ انسان کی اولاد بہت ہی چھوٹی موجود کی صورت میں انڈے یا

.....

(1)Spontaneous Generation. (2)William Harvey.(3)Evolution.

نطفہ میں موجود رہتی ہے، ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ان چھوٹے اور متداخل موجودات کی کروروں تعداد اولین مرد یا عورت کے تناسلی اعضاء میں موجود تھی اور جب ان میں سے سب سے باریک اور آخری حصہ خارج ہو جائے گا تب نسل بشر ختم ہو جائے گی، اس نظریہ کے مطابق تناسل وتولد میں نئے اور جدید موجود کی خلقت و پیدائش بیان نہیں ہوئی ہے بلکہ ایسے موجود کے لئے رشد ونمو، آغاز وجود ہی سے موجود ہے۔

پانچواں نظریہ ۱۷ویں صدی میں ذرہ بین کے اختراع اور انسانی حیات شناسی کی آزمائشوں اور تحقیقوں کے انجام کے بعد خصوصاً ۱۸ویں صدی میں نطفہ شناسی کے عنوان سے بیان ہوا جس کی وجہ سے مفکرین اس نکتہ پہ پہونچے ہیں کہ نطفہ کی خلقت میں مرد وعورت دونوں کا کردار ہے اور نطفہ کامل طور پر مرد کی منی اور عورت کے مادہ میں نہیں ہوتا ہے، مرد وعورت کے نطفہ کے ملنے کی کیفیت ۱۸۷۵ صدی میں مشاہدہ سے واضح ہو چکی ہے کہ بچہ کے ابتدائی نطفہ کی تخلیق میں مرد وعورت دونوں موثر ہیں۔ اور ۱۸۸۳ صدی میں نطفہ کی تخلیق میں دونوں کا مساوی کردار ثابت ہو چکا ہے، مختلف تبدیلیوں کے مراحل سے مرتبط اور مختلف شکلوں میں رحم کی دیواروں سے نطفہ کا معلق ہونا اور اس کا رشد نیز نطفہ کا مخلوط ہونا اور دوسری مختلف شکلیں جو نطفہ اختیار کرتا ہے یہ وہ چیزیں ہیں جس کی تحقیق ہو چکی ہے۔(۱)

قرآن مجید نے بہت سی آیات میں تمام انسانوں (نسل آدم) کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کی خلقت کے مختلف مراحل بیان کئے ہیں اس حصہ میں ہم ان مراحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے ابتدائی دو مراحل کی تحقیق کریں گے۔

بعض آیات میں خدا فرماتا ہے کہ: خداوند عالم نے انسان کو خلق کیا جب کہ اس سے پہلے وہ

---

(۱) ملاحظہ ہو: شاکرین، حمید رضا، قرآن وروان شناسی؛ ص ۲۲۔ ۲۵۔ طبارہ، عبد الفتاح، خلق الانسان دراسۃ علمیۃ قرآنیۃ؛ ج ۲، ص ۶۶۔ ۷۴۔

کچھ نہ تھا﴿أَوَ لا يَذكُرُ الإنسَانُ أَنَّا خَلَقنَاهُ مِن قَبلُ وَ لَم يَكُ شَيئاً﴾(۱) کیا انسان بھول گیا کہ ہم نے اس وقت اسے خلق کیا جب وہ کچھ نہ تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ آیت میں قبل سے مراد ابتدائی (فلسفی اصطلاح میں خلقت جدید) مادہ کے بغیر انسان کی خلقت نہیں ہے اس لئے کہ بہت سی آیات میں ابتدائی مادہ کی بنا پر انسان کی خلقت کی تاکید ہوئی ہے، اس آیت میں یہ نکتہ مورد توجہ ہے کہ انسان کا مادہ وخاکہ، انسانی وجود میں تبدیل ہونے کے لئے ایک دوسرے (روح یا انسانی نفس وجان) کے اضافہ کا محتاج ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ابتدائی مادہ انسان کے مقابلہ میں روح کے بغیر قابل ذکر وقابل اہمیت نہیں ہے، اسی بنا پر ہم سورہ ''انسان'' کی پہلی آیت میں پڑھتے ہیں کہ﴿هَل أَتَىٰ عَلَى الإنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهرِ لَم يَكُن شَيئاً مَذكُوراً﴾ کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گذرا جس میں وہ قابل ذکر شی بھی نہ تھا۔

دوسرے گروہ کی آیات میں انسان کی خلقت کے ابتدائی مادہ کو زمین (۲) خاک (۳) مٹی (۴) چپکنے والی مٹی (۵) بدبودار مٹی (کیچڑ) خمیر (۶) اور ٹھکرے کی طرح خشک مٹی بتایا گیا ہے۔(۷)

وہ آیات جو انسان کے جسمانی خلقت کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کرتی ہیں اگرچہ اکثر مقامات پر انسان کو عام ذکر کیا ہے لیکن ان آیتوں کی روشنی میں جو اس کی ابتدائی خلقت میں گذر چکی ہیں اور موجودہ انسانوں کی خلقت کے عینی واقعات جو ان آیات میں بیان کئے گئے مذکورہ مراحل طے نہیں کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ ابتدائی انسان کی جسمانی خلقت کے یہی مراحل اس کی خلقت کے اختتام میں بھی پائے جاتے ہیں۔

.....

(۱) سورۂ مریم/۶۷ (۲)﴿هُو أنشَأَكُم مِنَ الأَرضِ﴾(ہود/۶۱) (۳)﴿فَإِنَّا خَلَقنَاكُم مِّن تُرَابٍ﴾(حج/۵) (۴)﴿وَ بَدَأَ خَلقَ الإنسَانِ مِن طِينٍ﴾(سجدہ/۷)

(۵)﴿إِنَّا خَلَقنَاهُم مِن طِينٍ لازِبٍ﴾(صافات/۱۱) (۶)﴿وَ لَقَد خَلَقنَا الإنسَانَ ... مِن حَمَأٍ مَسنُونٍ﴾(حجر/۲۶) (۷)﴿خَلَقَ الإنسَانَ مِن صَلصَالٍ كَالفَخَّارِ﴾(الرحمٰن/۱۴)

آیات کا تیسرا گروہ؛ انسان کے تخلیقی مادہ کو پانی بتاتا ہے جیسے ﴿وَهُوَ الَّذِی خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَباً وَ صِهراً﴾(۱) وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے پانی سے آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان اور سسرال والا بنایا۔

گرچہ ہوسکتا ہے کہ یہ آیت مصداق اور ان آیات کے موارد کو بیان کرنے والی ہو جو ہر متحرک یا ذی حیات کی خلقت کو پانی سے تسلیم کرتی ہیں (۲) اور پانی سے مراد وہی پانی ہے جو عرف عام کی اصطلاح میں ہے لیکن ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو انسان یا نسل آدم کی خلقت کو نجس (۳) یا آب جہندہ (۴) سے بیان کرتی ہیں ان سے اس احتمال کو قوت ملتی ہے کہ اس آیت میں پانی سے مراد انسانی نطفہ ہے، اور آیت شریفہ نسل آدم کی ابتدائی خلقت کے نطفہ کو بیان کر رہی ہے۔ لیکن ہر مقام پر اس کی خصوصیات میں سے ایک ہی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے منجملہ خصوصیات میں سے جو قرآن میں اس نطفہ کو انسانی نسل کی خلقت کے نقطہ آغاز کے عنوان سے ذکر کیا ہے وہ مخلوط ہونا ہے جسے علم بشر کم از کم ۱۸ ویں صدی سے پہلے نہیں جانتا تھا۔

سورۂ دہر کی دوسری آیت میں خدا فرماتا ہے:

﴿إِنَّا خَلَقنَاالإِنسَانَ مِن نُطفَةٍ أَمشَاجٍ نَبتَلِيهِ فَجَعَلنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً﴾

ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں (اسی لئے) تو ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنایا۔

اس آیت میں کلمہ ''امشاج'' کے ذریعہ بچہ آمادہ کرنے والے مخلوط نطفہ سے گفتگو ہوئی ہے یا اس نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ امشاج، مشیج کی جمع ہے جو مخلوط کے معنی میں ہے آیت اس بات

.....

(۱) سورۂ فرقان/۵۴. (۲) سورۂ نور/۴۵۔ سورۂ انبیاء/۳۰۔ (۳) ﴿أَلَم نَخلُقكُم مِن مَاءٍ مَّهِينٍ﴾ (مرسلات/۲۰) ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِن مَّاءٍ مَّهِينٍ﴾ (سجدہ/۸)

(۴) ﴿خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ﴾ (طارق/۶)

پر دلالت کرتی ہے کہ بچہ کو تشکیل دینے والا نطفہ مخلوط ہونے کے اعتبار سے مختلف اقسام کا حامل ہے، اور یہ مفہوم، موجودہ رشد شناسی میں ثابت ہو چکے مطالب سے مطابقت رکھتا ہے اور یہ قرآن مجید کے غیبی خبروں میں سے شمار ہوتا ہے۔(۱) اور انجام پا چکی تحقیقوں کے مطابق انسانی نطفہ ایک طرف تو مرد و عورت کے نطفہ سے مخلوط ہوتا ہے اور دوسری طرف خود نطفہ مختلف غدود کے ترشحات سے مخلوط و مرکب ہوتا ہے۔

علقہ ہونا بچہ کی خلقت کا دوسرا مرحلہ ہے جو قرآن کی آیتوں میں مذکور ہے، سورۂ حج/۵؛ مومنون/۶۷؛ غافر/۶۷ کی آیات میں کلمہ ''علقہ'' اور سورۂ علق کی دوسری آیت میں کلمہ ''علق'' بچہ کے رشد و نمو کے مراحل میں استعمال ہوا ہے، علق؛ علقہ کی جمع ہے اور علقہ، علق سے لیا گیا ہے جس کا معنی چپکنا اور پیوستہ ہونا ہے چاہے وہ پیوستگی مادی ہو یا معنوی یا کسی اور چیز سے پیوستگی ہو مثلاً خون جامد (جاری خون کے مد مقابل) کے اجزاء میں بھی چپکنے کی صلاحیت ہوتی ہے خلاصہ یہ کہ ہر وہ چیز جو اس سے ملحق ہو اور چپک جائے اسے علقہ کہتے ہیں۔(۲) جونک چونکہ خون یا خونی اجزاء کو چوسنے کے لئے بدن یا کسی دوسری چیز سے چپکتا ہے اس لئے اس کو بھی علقہ کہتے ہیں، بہر حال یہ دیوار رحم سے نطفہ کی چسپیدگی کے مراحل اور مخلوط نطفہ کے مختلف اجزاء کے ایک دوسرے سے چسپیدگی کی حکایت

---

(۱) موریس بوکا لکھتا ہے: مادۂ منویہ مندرجہ ذیل غدود کے ترشحات سے وجود میں آتا ہے:

۱۔ مرد کے تناسلی غدود کی ترشحات اسپرموٹزوید کے حامل ہوتے ہیں۔۲۔ انڈوں کی تھیلیوں کی ترشحات، حاملہ کرنے کے عناصر سے خالی ہیں۔

۳۔ پروسٹٹ ترشحات، ظاہراً خمیر کی طرح ہوتے ہیں اور اس میں منی کی مخصوص بو ہوتی ہے۔

۴۔ دوسرے غدود کی مخلوط و سیال ترشحات، پیشاب کی رگوں میں موجود ہوتا ہے۔(بوکائی، موریس؛ انجیل، قرآن و علم؛ ص ۲۷۱ و ۲۷۲)

(۲) طبرسی؛ مجمع البیان؛ (سورہ علق کی دوسری آیت کے ذیل میں) لغت کی کتابیں۔

کرتی ہے، اور یہ حقیقت بھی قرآن کے غیبی اخبار اور نئی چیزوں میں سے ہے جسے آخری صدیوں تک علم بشر نے حل نہیں کیا تھا۔(۱)

مضغہ (۲) ہڈیوں کی خلقت (۳) ہڈیوں پر گوشت کا آنا (۴) اور دوسری چیزوں کی خلقت (۵) (روح پھونکنا) (۶) یہ وہ مراحل ہیں جو قرآن کی آیتوں میں نطفہ کے رشد کے لئے بیان ہوئے ہیں.

روح کا وجود اور استقلال

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کی روح کے سلسلہ میں متعدد و متفاوت نظریات بیان ہو چکے تھے بعض لوگ ایک سرے سے روح کے منکر تھے اور انسان کو مادی جسم میں منحصر سمجھتے تھے۔ بعض دوسرے لوگوں نے روح کو ایک مادی اور جسم سے وابستہ شئی اور انسان کے جسمانی خصوصیات اور آثار والی ذات شمار کیا ہے اور بعض لوگ روح کو غیر مادی لیکن جسم سے غیر مستقل وجود سمجھتے ہیں (۷) ان نظریات کو بیان کرنے اور ان کی دلیلوں پر تنقید و تحقیق کے لئے مزید فرصت درکار ہے

---

(۱) دوسرے اور تیسرے ہفتوں میں جنین کے پیوند، ملاپ اور چپکنے کے مراحل کے بارے میں معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: البار؛ محمد علی، خلق الانسان بین الطب والقرآن؛ ص ۳۶۸ و ۳۶۹۔ سلطانی، رضا؛ وفرہادگرمی، جنین شناسی انسان، فصل ہفتم۔ (۲) ﴿فَخَلَقنَا العَلَقَةَ مُضغَةً﴾ مومنون/۱۴ (۳) ﴿فَخَلَقنَا المُضغَةَ عِظَاماً﴾ مومنون/۱۴ (۴) ﴿فَكَسَونَا العِظَامَ لَحماً﴾ مومنون/۱۴ (۵) ﴿ثُمَّ أَنشَأنَاهُ خَلقاً آخَرَ﴾ مومنون/۱۴۔ (۶) رحم میں نطفہ کے استقرار کی خصوصیت اور اس کے شرائط نیز تولد کے بعد رشد انسان کے مراحل کو بعض آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسے سورہ حج/۵۔ نوح/۱۴۔ زمر/۶۔ مومن/۶۷ کی آیتیں۔ (۷) روح کے بارے میں بیان کئے گئے نظریات کو چار عمومی دستوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: الف) وہ نظریات جو جسم کے مقابلہ میں ایک عنصر کے اعتبار سے روح اور روحانی حوادث کے بالکل منکر ہیں اور تمام روحانی حوادث میں مادی توجیہ پیش کرتے ہیں، اس نظریہ کو ''ڈمکراٹیس، رنو، تھامس ہابز، علاف، اشعری، باقلانی، ابوبکر اصم اور عقیدہ رفتار و کردار رکھنے والوں کی طرف نسبت دیا گیا ہے۔ ب) وہ نظریات ہیں جس میں روحی حوادث کو قبول کیا گیا ہے، لیکن روح مجرد کا انکار کیا گیا ہے۔ عقیدہ تجلیات (Epiphenomenalism) روحی حوادث کو مادی حوادث سے بالکل جدا سمجھنے کے باوجود مادی اور جسمانی اعضاء. . .

لہٰذا ہم اس سلسلہ میں فقط قرآن کے نظریہ کو ذکر کریں گے نیز بعض عقلی اور تجربی دلیلوں اور قرآن کے نظریہ سے ان کی ہماہنگی کو بیان کریں گے۔

وہ آیات جو قرآن مجید میں روح مجرد کے استقلال اور وجود کے بارے میں آئی ہیں دو گروہ میں تقسیم ہوتی ہیں: پہلے گروہ میں وہ آیات ہیں جو روح کی حقیقت کو بیان کرتی ہیں اور دوسرے گروہ میں وہ آیات ہیں جو حقیقت روح کے علاوہ استقلال اور موت کے بعد روح کی بقا کو بیان کرتی ہیں۔

من جملہ آیات میں سے جو روح کے وجود پر دلالت کرتی ہیں وہ سورہ مومنون کی بارہویں تا چودھویں آیت ہے جو انسان کی جسمانی خلقت کے مراحل کو ذکر کرنے کے بعد بیان کرتی ہیں کہ ﴿ثُمَّ أنشَأنَاهُ خَلقاً آخَرَ﴾ یہ واضح رہے کہ انسان کے جسمانی تکامل کے بعد دوسری خلقت سے مراد کوئی جسمانی مرحلہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ انسانی روح پھونکے جانے کے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے اسی بنا پر اس جگہ آیت کی عبارت ان عبارتوں سے جدا ہے جو جسمانی مراحل کو ذکر کرتی ہیں۔(۲)

. . .کا نتیجہ سمجھتے ہیں نیز نظریہ فردی (Parson Theory) روح کو ایسا حوادث روحی سمجھتا ہے جو ہمیشہ انسان کی راہ میں ایجاد اور ختم ہوتا رہتا ہے۔(T.H.Huxly) پی.اف.سراسن نے (P.F.Srawson) مذکورہ بالا دونوں نظریات کو ترتیب سے بیان کیا ہے۔ج) وہ نظریات جو روح وجسم کو دو مستقل اور جدا عنصر بتانے کے باوجود ان دونوں کو ایک جنسی اور مادی خمیر سے تعبیر کیا ہے۔اس نظریہ کو ولیم جیمز اور راسل کی طرف نسبت دی گئی ہے۔د) بعض نظریات روح وجسم کے تاثرات کو قبول کرتے ہیں لیکن جسم کے علاوہ ایک دوسری شی بنام روح یعنی مجرد شی کا اعتقاد رکھتے ہیں جس سے تمام روحی حودث مربوط ہیں اور اسی سے حادث ہوتے ہیں، مفکرین وفلاسفہ کی قریب بہ اتفاق تعداد اس نظریہ کی طرفدار ہے۔رجوع کریں: ابوزید منی احمد؛ الانسان فی الفلسفۃ الاسلامیۃ؛ موسسہ الجامعیۃ للدراسات، ، بیروت، ۱۴۱۴، ص ۸۸۔۱۰۰ (۱) مجرد و مادی شی کی خصوصیات اور تعریف کے بارے میں مزید اطلاعات کے لئے۔ملاحظہ ہو: عبودیت، عبد الرسول؛ ہستی شناسی؛ ج۱ ص ۲۵۶ تا ۲۸۷۔ (۲) ملاحظہ ہو: محمد حسین طباطبائی؛ المیزان فی تفسیر القرآن ج۱۵، ص ۱۹. روایات میں بھی آیہ کریمہ کی اسی طرح تفسیر ہوئی ہے۔ملاحظہ ہو: الحر العاملی محمد بن الحسن؛ وسائل الشیعہ ج۱۹ ص ۳۲۴۔

سورہ سجدہ کی نویں آیت میں بھی انسان کے اندر روح کے حقیقی وجود کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور خاک سے حضرت آدمؑ اور پانی سے ان کی نسل کی خلقت کے مسئلہ کو بیان کیا ہے کہ:

﴿ثُمَّ سَوَّاهُ وَ نَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ . . . ﴾(۱) پھر خدا نے اس کو آمادہ کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔

اس آیہ شریفہ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جسمانی تکامل کے مراحل سے آمادگی وتسویہ کے مرحلہ کو طے کرنے کے بعد خدا کی طرف سے روح پھونکی جائے گی۔(۲)

.....

(۱) سورۂ سجدہ؛ ۹، یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیات وروایات سے روح انسان کے استقلال اور وجود کا استفادہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن نے کلمہ روح کو استعمال کر کے روح انسان کے استقلال و وجود کے مسئلہ کو بیان کیا ہے، قرآن کریم میں تقریباً ۲۰ مقامات میں کلمہ روح استعمال ہوا ہے، اور اس کے معنی ومراد کے اعتبار سے بعض آیات میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسے آیہ شریفہ ﴿قُلِّ الرُّوحُ مِن أَمرِ رَبِّی ﴾ لیکن کلمہ روح کے دو قطعی اور مورد اتفاق استعمالات ہیں:

پہلا یہ کہ خدا کے ایک برگزیدہ فرشتہ کے سلسلہ میں ''روح، روح القدس، روح الامین'' کی تعبیریں مذکور ہیں جیسے ﴿تَنَزَّلُ المَلائِكةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِأذنِ رَبِّهِم مِن كُلِّ أَمرٍ﴾ قدر/۴۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ اس انسانی روح کے بارے میں استعمال ہوا ہے جو اس کے جسم میں پھونکی جاتی ہے؛ جیسے وہ موارد جس میں حضرت آدمؑ اور عیسیٰؑ کی خلقت کے سلسلہ میں روح پھونکے جانے کی گفتگو ہوئی ہے، مثال کے طور پر ﴿فَإِذَا سَوَّيتُهُ وَنَفَختُ فِيهِ مِن رُّوحِی فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾ (حجر/۲۹) حضرت آدمؑ کی خلقت کو بیان کیا ہے اور جیسے ﴿ وَ مَريَمَ ابنَتَ عِمرَانَ الَّتِی أحصَنَت فَرجَهَا فَنَفَخنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا﴾ (تحریم/۱۲)

(۲) بعض مفسرین نے مذکورہ آیت میں روح پھونکے کے عمل کو حضرت آدمؑ کی خلقت بیان کیا ہے، لیکن جو چیزیں متن کتاب میں مذکور ہے وہ ظاہر آیت سے سازگار نہیں ہے۔

وہ آیات جو وجود روح کے علاوہ موت کے بعد اس کی بقا کو ثابت کرتی ہیں بہت زیادہ ہیں۔(۱) اور ان آیات کو تین گروہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ وہ آیات جو موت کو ''توفّی'' کے عنوان سے یاد کرتی ہیں خصوصاً سورہ سجدہ کی دسویں اور گیارہویں آیتیں:

﴿ وَ قَالُوا أَءِذَا ضَلَلنَا فِی الأرضِ أَءِنَّا لَفِی خَلقٍ جَدِیدٍ بَل هُم بِلِقَاءِ رَبِّهِم كَافِرُونَ قُل یَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ المَوتِ الَّذِی وُكِّلَ بِكُم ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم تُرجَعُونَ ﴾

اور ان لوگوں (کافرین) نے کہا کہ جب ہم (مر گئے بوسیدہ اور جسم کے ذرات) زمین میں ناپید ہو گئے تو کیا ہم پھر نیا جنم لیں گے بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کے حضور ہی سے انکار رکھتے ہیں، تم کہدو کہ ملک الموت جو تمہارے اوپر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

کلمہ ''توفی'' پر توجہ کرتے ہوئے کہ جس کا معنی کسی شی کو پوری طرح اور کامل طریقہ سے دریافت کرنا ہے، مذکورہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ موت کے وقت وہ چیز جو مشاہدہ ہوتی ہے اس کے علاوہ (بے حرکت اور احساس وفہم سے عاری جسم) وہ چیز جو انسان کی اصل اور حقیقت ہے اور پوری طرح فرشتوں کے ذریعہ دریافت ہوتی ہے وہی روح ہے اس لئے کہ مرنے کے بعد اور

---

(۱) بدن سے روح کے استقلال کے مختلف تاثرات کی نفی اور بالکل بے نیازی کے معنی میں سمجھنا چاہیئے، بلکہ روح اپنی تمام فعالیت میں تقریبا جسم کی محتاج ہے اور ان افعال کو جسم کی مدد سے انجام دیتی ہے، مثال کے طور پر مادی دنیا کے حوادث کی معرفت بھی روح کی فعالیت میں سے ہے جو حسی اعضا سے انجام پاتے ہیں، اسی طرح انسان کی روح اور اس کا جسم ایک دوسرے میں اثر انداز ہوتے ہیں، مثال کے طور پر روح کی شدید تاثرات آنکھ کے غدود سے اشک جاری ہونے کے ہمراہ ہے اور معدہ کا خالی ہونا بھوک کے احساس کو انسان کے اندر ایجاد کرتا ہے۔

مرنے سے پہلے جسم ہمارے درمیان اور اختیار میں ہے جسے فرشتہ وحی دریافت نہیں کرتا ہے اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ منکرین معاد جو یہ گمان کرتے ہیں کہ انسان درحقیقت وہی جسم ہے جو موت کی وجہ سے منتشر ہو جاتا ہے اور اس کے ذرات زمین میں نابود ہو جاتے ہیں، خداوند قدوس اس فکر کو نادرست مانتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمہاری حقیقی اور واقعی حقیقت ایک دوسری شی ہے جو کامل طور پر ملک الموت کے ذریعہ دریافت ہوتی ہے موت اور جسم کے پراکندہ ہو جانے سے نابود ہونے والی نہیں ہے بلکہ وہ جسم سے الگ اپنی حیات کو جاری رکھتی ہے۔

۲.آیہ کریمہ:

﴿وَ لَو تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِی غَمَرَاتِ المَوتِ وَ المَلائِکَةُ بَاسِطُوا أَیدِیهِم أَخرِجُوا أَنفُسَکُمُ الیَومَ تُجزَونَ عَذَابَ الهُونِ بِمَا کُنتُم تَقُولُونَ عَلَىٰ اللّٰهِ غَیرَ الحَقِّ وَ کُنتُم عَن آیَاتِهِ تَستَکبِرُونَ﴾(۱)

اور کاش تم دیکھتے کہ یہ ظالم موت کی سختیوں میں پڑے ہیں اور فرشتے ان کی طرف ہاتھ لپکا رہے ہیں (اور ان کے سروں کے اوپر کھڑے ہوئے ان سے کہیں گے) خود اپنی جانیں نکالو آج ہی تو تم کو رسوائی کے عذاب کی سزا دی جائے گی کیونکہ تم خدا پر ناحق جھوٹ جوڑا کرتے تھے اور اس کی آیتوں سے اکڑا کرتے تھے۔

''اپنے آپ کو خارج کریں'' کی تعبیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان جسم کے علاوہ ایک عنصر اور رکھتا ہے جو انسان کی حقیقت کو تشکیل دیتا ہے اور موت کے وقت جسم سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ ملک الموت کے ذریعہ روح انسان کے قبض ہونے کی دوسری تعبیر ہے۔(۲)

.....

(۱) سورۂ انعام/۹۳۔(۲) یہ مسئلہ اپنی جگہ ثابت ہو چکا ہے کہ جس طرح روح کا بدن کے ساتھ اتحاد، مادی نہیں ہے اسی طرح بدن سے روح کا خارج ہونا بھی مادی خروج نہیں ہے، وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو: علامہ طباطبائی کی المیزان ج۷، ص۲۸۵۔

۳.عالم برزخ کی حیات کو بیان کرنے والی آیت:

﴿حَتّیٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ المَوتُ قَالَ رَبِّ ارجِعُونَ☆ لَعَلِّی أَعمَلُ صَالِحاً فِیمَا تَرَکتُ کَلاّ إِنَّهَا کَلِمَةٌ هوَ قَائِلُهَا وَ مِن وَرَائِهِم بَرزَخٌ إِلَیٰ یَومِ یُبعَثُونَ﴾(۱)

یہاں تک کہ جب ان (کافروں) میں سے کسی کی موت آئی تو کہنے لگے پروردگارا! تو مجھے (دنیا میں) پھر واپس کردے تا کہ میں اچھے اچھے کام کروں ہرگز نہیں (وہ اسی خواہش میں رہے ہیں) یہ ایک لغو بات ہے جسے وہ بک رہا اور ان کے بعد (حیات) برزخ ہے دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

عالم برزح پر روشنی ڈالنے والی بہت سی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مرنے کے بعد اور قیامت برپا ہونے سے پہلے روح ایک دنیا میں باحیات ہوتی ہے اور پروردگار کی نعمت وعذاب میں مبتلا رہتی ہے، اس کی آرزو وخواہش ہوتی ہے، سرزنش، عذاب، نیکی اور بشارت سے مرنے والا دوچار ہوتا ہے اور مرتے ہی وہ ان خصوصیات کے ساتھ اس عالم میں وارد ہوتا ہے یہ تمام چیزیں اس جسم کے علاوہ ہیں جسے ہم نے مشاہدہ کیا ہے یا نابود جاتا ہے، اسی بنا پر موت کے بعد روح کا وجود اور اس کی بقا واضح وروشن ہے۔(۲)

روح کے اثبات میں بشری معرفت اور دینی نظریہ کی ہماہنگی

گذشتہ بحث میں قرآن مجید کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے جسم اور جسمانی حوادث کے علاوہ انسان کے لئے روح نام کی ایک دوسرے مستقل پہلو کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے، اب ہم

.....

(۱) مومنون/۹۹، ۱۰۰۔(۲) استقلال روح اور وجود کو بیان کرنے والی تمام آیات کی معلومات کے لئے. ملاحظہ ہو: محمد تقی مصباح، معارف قرآن (خداشناسی، کیھان شناسی، انسان شناسی) ص ۴۵۰۔۴۵۶۔

روح کی خصوصیات اور روحی حوادث سے مختصر آشنائی اور عقلی مباحث اور تجربی شواہد کے تقاضوں سے دینی نظریہ کی ہماہنگی کی مقدار معلوم کرنے کے لئے انسان کی مجرد روح کے وجود پر مبنی بعض تجربی شواہد اور عقلی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

الف) عقلی دلائل

شخصیت کی حقیقت

ہم میں سے کوئی بھی کسی چیز میں مشکوک ہوسکتا ہے لیکن اپنے وجود میں کوئی شک نہیں کرتا ہے۔ ہر انسان اپنے وجود کو محسوس کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے یہ اپنے وجود کا علم اس کی واضح ترین معلومات ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری طرف اس مطلب کو بھی جانتے ہیں کہ جس چیز کو ''خود'' یا ''میں'' سے تعبیر کرتے ہیں وہ آغاز خلقت سے عمر کے اواخر تک ایک چیز تھی اور ہے، جب کہ آپ اپنی پوری زندگی میں بعض خصوصیات اور صفات کے مالک رہتے ہیں یا اسے کھو بیٹھتے ہیں لیکن وہ چیز جس کو ''خود'' یا ''میں'' کہتے ہیں اسی طرح ثابت و پایدار ہے، ہم مذکورہ امور کو علم حضوری سے حاصل کرتے ہیں۔

اب ہم دیکھیں گے کہ وہ تنہا ثابت و پایدار شی کیا ہے؟ وہ تنہا، بغیر کسی شک کے، اعضاء یا اجرام یا بدن کا دوسرا مادی جزء یا رابطوں کے تاثرات اور ان کے مادی آثار نہیں ہوسکتے اس لئے کہ ان کو ہم علم حضوری کے ذریعہ حاصل نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ ظاہری حواس سے درک کرتے ہیں، اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ہمیشہ متحول و متغیر ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا ''میں'' یا ''خود'' ہمارے جسم اور اس کے آثار و عوارض کے علاوہ ایک دوسری حقیقت ہے اور اس کی پایداری و استحکام، مجرد اور غیر مادی ہونے پر دلالت کرتی ہے، یہ بات قابل توجہ ہے کہ طریقۂ معرفت اور فلسفہ علم سے بعض ناآشنا حضرات کہتے ہیں کہ علم؛ روح مجرد کے وجود سے انکار کرتا ہے اور اس پر اعتقاد کو غلط تسلیم کرتا ہے۔(۱)

(۱) مارکس کے ماننے والے اپنے فلسفہ کو فلسفہ علمی کہتے ہیں اور روح کے منکر و معتقد بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو: مجموعہ آثار ج۶/ص۱۱۵

جب کہ علم کا کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے بلکہ علم اس سے کہیں زیادہ متواضع ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار سے باہر مجرد امور میں قضاوت کرے، یہ بات گذر چکی ہے کہ زیادہ سے زیادہ کسی شعبہ میں علم کا دعویٰ، انکار اور نہ ہونا نہیں ہے بلکہ عدم حصول ہے۔

روح کا ناقابل تقسیم ہونا اور اس کے حوادث

مادی وجسمانی موجودات، کمیت ومقدار سے سروکار رکھنے کی وجہ سے قابل تجزیہ وتقسیم ہیں مثال کے طور پر ۲۰ سینٹی میٹر پتھر کا ایک ٹکڑا یا ایک میٹر لکڑی چونکہ کمیت ومقدار رکھتے ہیں لہٰذا قابل تقسیم ہیں اسی طرح ۱۰ سینٹی میٹر پتھر کے دو ٹکڑے یا آدھے میٹر لکڑی کے دو ٹکڑے میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ایک ورق کاغذ کی سفیدی جو کہ جوہر کاغذ کی وجہ سے باقی اور اس میں داخل ہے، کاغذ کو دو حصہ میں کر کے اس کی سفیدی کو بھی (کاغذ کے دو ٹکڑے میں تقسیم ہونے کے ساتھ ساتھ) تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن ہم سے ہر ایک جس وقت اپنے بارے میں غور وفکر کرتا ہے تو اس حقیقت کو پاتا ہے کہ نفس، مادی حقیقتوں میں سے نہیں ہے اور وہ چیز جس کو ''میں'' کہتا ہے وہ ایک بسیط اور ناقابل تقسیم شئ ہے یہ تقسیم نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ''میں'' کی حقیقت مادہ اور جسم نہیں ہے، مزید یہ کہ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ نفس، مادی چیزوں میں سے نہیں ہے ''میں'' اور روحی حوادث، ہمارے جسم کے ہمراہ، تقسیم پذیر نہیں ہیں یعنی اس طرح نہیں ہے کہ اگر ہمارے جسم کو دو نیم کریں تو ''میں'' یا ہماری فکر یا وہ مطالب جن کو محفوظ کیا ہے دو نیم ہو جائیگی، اس حقیقت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ''میں'' اور ''روحی حوادث'' مادہ پر حمل ہونے والی اشیاء وآثار میں سے نہیں ہیں۔

مکان سے بے نیاز ہونا

مادی چیزیں بے واسطہ یا باواسطہ طور پر مختلف جہت رکھنے کے باوجود مکان کی محتاج ہیں اور فضا کو پُر کئے ہوئے ہیں لیکن روح اور روحی حوادث جس میں بالکل جہت ہی نہیں ہے لہٰذا اس کے لئے

کوئی مکان بھی نہیں ہے مثال کے طور پر ہم اپنی روح کے لئے جس کو لفظ ''میں'' کے ذریعہ یاد کرتے ہیں اس کے لئے اپنے جسم یا جسم کے علاوہ کسی چیز میں کوئی مکان معین نہیں کر سکتے ہیں، اس لئے کہ وہ نہ تو جسم کا حصہ ہے کہ جہت رکھتا ہو اور نہ ہی جسم میں حلول کرتا ہے اور نہ جسم کی خصوصیات کا مالک ہے جس کی وجہ سے جہت ہو اور نتیجتاً مکان رکھتا ہو، روحی حوادث مثلاً غم، خوشی، فکر و نتیجہ گیری، ارادہ اور تصمیم گیری بھی اسی طرح ہیں۔

کبیر کا صغیر پر انطباق

ہم میں سے ہر ایک یہ تجربہ رکھتا ہے کہ بارہا وہ جنگل و صحرا کے طبیعی مناظر اور وسیع آسمان سے لطف اندوز ہوا ہے، ہم ان وسیع مناظر کو ان کی وسعت و پھیلاؤ کے ساتھ درک کرتے ہیں، کیا کبھی یہ سوچا ہے کہ یہ وسیع و عریض مناظر اور دوسرے سینکڑوں نمونے جن کو پہلے دیکھا ہے اور اس وقت بھی حافظہ میں ہیں، کہاں موجود رہتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ وسیع مناظر جو کئی کیلومیٹر وسیع مکان کے محتاج ہیں وہ مغز کے بہت ہی چھوٹے اجرام میں سما جائیں؟! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ مناظر ہمارے اندر محفوظ ہیں اور ہم ان کو اسی وسعت و کشادگی کے ساتھ محسوس کرتے ہیں لیکن ہمارے مادی اعضاء میں سے کوئی بھی مخصوصاً ہمارا دماغ جس کو مادہ پرست حضرات مرکز فہم کہتے ہیں؛ ایسے مناظر کی گنجائش نہیں رکھتا ہے اور ایسے مناظر کا اس قلیل جگہ میں قرار پانا ممکن بھی نہیں ہے، اور علماء کی اصطلاح میں ''صغیر پر کبیر کا انطباق'' لازم آئے گا جس کا بطلان واضح ہے۔(۱)

ب) تجربی شواہد

بشر کے تجربیات میں ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جو روح کے مجرد و مستقل وجود کی تائید کرتے ہیں ''روحوں سے رابطہ'' جس میں انسان ان لوگوں سے جو سیکڑوں سال پہلے مر چکے ہیں اور

(۱) ٹیلی ویژن یا مانیٹر کے صفحہ پر جس طرح ایک بہت ہی چھوٹی تصویر کو دیکھتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ چھوٹی تصویر اس وسیع و عریض منظر کی تصویر ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ ہم ان مناظر اور وسیع و عریض مقامات کو ان کی بزرگی کے ساتھ درک کرتے ہیں۔

شایدان کے اسماء کو بھی نہ سنا ہو، ارتباط قائم کرتا ہے اور معلومات دریافت کرتا ہے۔(۱) ''آتوسکپی'' (تخلیہ روح) میں جسم سے روح کی موقت جدائی کے وقت ان لوگوں سے معلومات کا مشاہدہ کیا گیا ہے جو دماغی سکتہ یا شدید حادثہ کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے ہیں اور اچھے ہونے کے بعد بے ہوشی کے وقت کے تمام حالات کو یاد رکھتے ہیں، (۲) سچے خواب میں افراد نیند ہی کی حالت میں گذشتہ یا آئندہ زمانے میں

.....

(۱) ایسے مفکرین کے سامنے جن کی باریک بینی، صداقت اور تقویٰ میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا ہے ایسے موارد بھی پیش آئے ہیں کہ انہوں نے کئی سال پہلے مر چکے افراد سے ارتباط برقرار کر کے گذشتہ آئندہ کے بارے میں معلومات دریافت کی ہیں۔ اگر روح مجرد کا وجود نہ ہوتا تو ایسے جسم سے رابطہ بھی ممکن نہ ہوتا جو سالوں پہلے پراکندہ ہو چکا تھا اور ان مفکرین سے کوئی معرفت و رابطہ بھی نہ تھا، مثال کے طور پر مرحوم علامہ طباطبائی سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: طالب علمی کے زمانہ میں جب میں نجف اشرف میں دینی علوم کی تعلیم میں مشغول تھا، ایک بار میری اقتصادی حالت بہت نازک ہوگئی تھی، گھر میں بیٹھا ہوا تھا اور زندگی کے اقتصادیات نے میرے ذہن کو پریشان کر رکھا تھا؛ میں نے اپنے آپ سے کہا تم کب تک اس اقتصادی حالت میں زندگی گذار سکتے ہو؟ ناگاہ میں نے احساس کیا کہ کوئی دق الباب کر رہا ہے، میں اٹھا اور جا کر دروازہ کھولا، ایسے شخص کو دیکھا جس کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، ایک مخصوص لباس زیب تن کئے ہوئے تھا، مجھے سلام کیا اور میں نے جواب سلام دیا، اس نے کہا: میں سلطان حسین ہوں۔ خداوند عالم فرماتا ہے: میں نے ان اٹھارہ سالوں میں کب تم کو بھوکا رکھا ہے جو تم درس و مطالعہ چھوڑ کر روزی کی تامین کے بارے میں سوچ رہے ہو؟ علامہ فرماتے ہیں کہ: اس شخص نے خدا حافظی کیا اور چلا گیا، میں نے دروازہ بند کیا اور واپس آ گیا اچانک میں نے دیکھا، میں تو پہلے والے ہی انداز میں کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں اور میں نے کوئی حرکت بھی نہیں کی ہے میں نے اپنے دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ اٹھارہ سال کس وقت سے شروع ہوتا ہے؟ میری طالب علمی کے آغاز کا دور تو اٹھارہ سالوں سے زیادہ ہے اور وقت ازدواج بھی، اٹھارہ سال سے مطابق نہیں رکھتا ہے میں نے غور کیا تو یاد آیا کہ جب سے میں نے روحانی لباس زیب تن کیا ہے، ٹھیک اٹھارہ سال گذر چکے ہیں۔ چند سال بعد میں ایران آیا اور تبریز میں رہنے لگا۔ ایک دن میں قبرستان گیا اچانک میری نظر ایک قبر پر پڑی دیکھا اسی شخص کا نام قبر کی تختی پر کندہ ہے، میں نے اس کی تاریخ وفات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس واقعہ سے تین سو سال پہلے وہ ◄◄

نہ دیکھی نہ سنی جگہوں میں سفر کرتے ہیں، اور بیداری کے بعد خواب کے مطابق معلومات کو صحیح پاتے ہیں۔(۱) اور ٹیلی پیتھی میں دو یا چند آدمی بہت ہی زیادہ فاصلہ سے مثال کے طور پر دو شہروں میں ایک دوسرے سے مرتبط ہوتے ہیں اور بغیر کسی مادی ارتباط کے ایک دوسرے سے معلومات منتقل کرتے

◄◄ اس دنیا سے جا چکا تھا اور میرا رابطہ اس کی روح سے تھا۔ ملاحظہ ہو: قاسم لو، یعقوب؛ طبیب عاشقان؛ ص ۴۵ و ۴۶۔ اسی مطلب کی طرح، بیداری کی حالت میں اپنے اور دوسروں کے آئندہ کا مشاہدہ کرنا ہے جیسے وہ چیزیں جو حضرت آیۃ اللہ خوئی طاب ثراہ کے بارے میں نقل ہوئی ہیں کہ: آپ نے اپنی جوانی اور طالب علمی کے ابتدائی دور میں اپنی زندگی کے تمام مراحل کو حتی ہنگام موت اور اپنے تشییع جنازہ کے مراسم کو بھی عالم بیداری میں مکاشفہ کی شکل میں دیکھا تھا اور اپنی پوری زندگی کو اسی انداز میں تجربہ بھی کیا تھا۔ ملاحظہ ہو: حسن زادہ، صادق؛ اسوہ عارفان؛ ص ۶۱۔(۲) آٹوسکپی (Autoscopy) مغرب میں عالم تجربہ کا یہ نسبتاً جدید انکشاف ہے اور ایسے افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے جو تصادف یا شدید سکتہ مغزی کی وجہ سے ان کی روح ان سے دور ہو جاتی ہے ان کے حالات کے صحیح اور معمول پر واپس آنے کے بعد اپنے بے ہوشی کے دوران کے سبھی حالات کو جانتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ: ہم اپنے جسم کو نیز ان افراد کو جو ہمارے اردگرد تھے اور جو کام وہ ہمارے جسم پر انجام دیتے تھے اور اسی طرح مکان اور آواز کو ان مدت میں ہم نے مشاہدہ کیا ہے، ریمنڈ مودی نام کے ایک مفکر نے اپنی کتاب Life after life (زندگی، زندگی کے بعد) میں ان مشاہدات کے نمونوں کو ذکر کیا ہے مائکل سابون نام کے ایک دوسرے مفکر نے پانچ سال کے اندر ۱۱۶ افراد سے اس طرح کا بیان لیا ہے جس میں سے تین چوتھائی افراد، سکتہ قلبی کے شکار ہوئے ہیں، ان میں سے ایک سوم افراد آٹوسکپی میں گرفتار تھے۔ ملاحظہ ہو: ہوپر، جودیث ودیک ٹرسی، جہان شگفت انگیز مغز؛ ص ۵۵۷، ۵۶۹۔ انسان در اسلام؛ کے ص ۸۸ پر واعظی نے نقل کیا ہے۔ توجہ ہونا چاہیئے کہ ایسے افراد کا جسم درک نہیں کرتا ہے اور حواس بھی تقریباً کام نہیں کرتا ہے لہٰذا ان حالات کی بہترین توجیہ، مستقل اور مجرد روح کا وجود ہے۔(۱) سچے خواب بھی بہت زیادہ ہیں جو روح کے وجود پر دلیل ہیں۔ ان خوابوں میں انسان آئندہ یا گذشتہ زمانہ میں یا ایسی جگہوں میں سفر کرتا ہے جسے کبھی دیکھا نہ تھا حتی ان کے اوصاف کے بارے میں نہ پڑھا اور نہ ہی سنا تھا اور جو وہ معلومات حاصل کرتا ہے واقعیت سے مطابقت رکھتا ہے اور مرور زمان کے بعد ان چیزوں کا اسی طرح مشاہدہ کرتا ہے جیسا کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا، چونکہ خواب کے وقت انسان کا بدن ساکت اور مخصوص مکان میں ہوتا ہے، لہٰذا یہ حرکت اور کسب اطلاعات، روح مجرد کو قبول کئے بغیر قابل توجیہ، اور منطقی نہیں ہے۔

ہیں۔(۱) یہ منجملہ تجربی شواہد کے موارد ہیں جو روح مجرد کے وجود کی تائید کرتی ہیں۔ گذشتہ چیزوں پر توجہ کرتے ہوئے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ روحی حوادث کو شیمیائی، مادی، مقناطیسی لہروں یا شیمیائی الکٹرک کے فعل وانفعال سے توجیہ نہیں کیا جاسکتا ہے اور انسانی خواہشات جیسے حوادث، درد واحساسات خصوصاً ادراک، تجربہ وتحلیل، نتیجہ گیری اور استنباط ان میں سے کوئی بھی شی قابل توجیہ نہیں ہے۔

روح مجرد اور انسان کی واقعی حقیقت

انسانی روح کے سلسلہ میں مجرد ہونے کے علاوہ دو دوسرے مہم مسائل بھی ہیں جن کے سلسلہ میں قرآن کے نظریہ کو اختصار اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ پہلی بات یہ کہ انسان کی روح ایک مجرد وجود ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کی واقعی حقیقت (وہ چیزیں جو انسان کی انسانیت سے مربوط ہیں) کو اس کی روح تشکیل دیتی ہے، یہ دو مطالب گذشتہ آیات کے مفہوم وتوضیحات سے حاصل ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ انسان کی خلقت سے مربوط آیات میں اس کے جسمانی خلقت کے مراحل کے بیان کے بعد ایک دوسری تخلیق یا روح پھونکنے کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور یہ نکتہ روح کے غیر مادی ہونے کی علامت ہے، جسم کے پراکندہ ہونے کے بعد انسان کی بقا اور عالم برزخ میں زندگی کا دوام نیز اس کا کامل اور پوری طرح دریافت ہونا بھی روح کے مادی وجسمانی نہ ہونے کی علامت ہے۔ دوسری طرف اگر انسان کی واقعی حقیقت اس کے مادی جسم میں ہے تو مرنے اور جسم کے پراکندہ ہونے کے بعد نابود ہوجانا چاہیئے تھا جب کہ آیات قرآنی جسم کے پراکندہ ہونے کے بعد بھی انسان کی بقا کی تائید کرتی ہیں، خداوند عالم نے انسان کی فرد اول کے عنوان سے حضرت آدمؑ کی خلقت

---

(۱) روح مجرد کے وجود کی دوسری دلیل ٹیلی پیتھی (Telepathy) اور راہ دور سے رابطہ ہے، بعض اوقات انسان ایسے افراد سے رابطہ کا احساس کرتا ہے جو دوسرے شہر میں رہتا ہے اور اس رابطہ میں ایک دوسرے سے معلومات منتقل کرتے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے، یہ رابطہ ارواح سے رابطہ کی طرح ہے لیکن یہ زندہ لوگوں کی روحیں ہیں۔

کے بارے میں فرمایا: ''روح پھونکے جانے کے بعد؛ سجدہ کرو'' یہ حکم بتاتا ہے کہ اس مرحلہ میں پہلے وہ خلیفۃ اللہ انسان جس کی خلقت کا خداوند عالم نے وعدہ کیا تھا ابھی وجود میں نہیں آیا ہے انسان کی خلقت میں یہ کہنے کے بعد کہ ثُمَّ أَنشَأنَاهُ خَلقاً آخَر ''پھر ہم نے اس کو ایک دوسری شکل میں پیدا کیا'' اس جملہ کو بیان کیا فَتَبَارَکَ اللّٰهُ أحسَنُ الخَالِقِین (۱) ''پس مبارک ہے وہ اللہ جو بنانے والوں میں سب سے بہتر ہے''، یہ نکتہ بھی دلالت کرتا ہے کہ انسان کا وجود روح پھونکنے کے بعد متحقق ہوتا ہے، وہ آیات جو بیان کرتی ہیں کہ ہم تم کو تام اور کامل دریافت کرتے ہیں وہ بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کی روح اس کی واقعی حقیقت کو تشکیل دیتی ہے ورنہ اگر جسم بھی انسان کے حقیقی وجود کا حصہ ہوتا تو موت کے وقت انسان، تام اور کامل دریافت نہیں ہوتا اور جسم کے پراگندہ ہوتے ہی انسان کی واقعی حقیقت کا وہ حصہ بھی نابود ہو جاتا۔

خلاصہ فصل

۱.انسان دو پہلو رکھنے والا اور جسم و روح سے مرکب وجود ہے۔

۲.اگر چہ نسل آدم علیہ السلام کے جسم کی بناوٹ کی کیفیت کے بارے میں کوئی خاص بحث نہیں ہے لیکن مفکرین، ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں۔

۳.جب ڈارون نے اپنے فرضیہ کو بیان کیا اور مختلف مخلوقات کی بناوٹ کو (بہترین انتخاب اصل ہے) کی بنیاد پر پیش کیا تو بعض غربی مفکرین نے نسل آدم کے ماضی کو بھی اسی فرضیہ کی روشنی میں تمام حقیر حیوانات کے درمیان جستجو کرتے ہوئے بندروں کے گمشدہ واسطہ کے ساتھ پیش کیا۔

۴.بعض مسلمان مفکرین نے کوشش کی ہے کہ خلقت آدم کو بیان کرنے والی آیات کو بھی

.....

(۱) سورۂ مومنون/۱۴

اسی فرضیہ کے مطابق تفسیر کریں لیکن اس طرح کی آیات ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسىٰ عِندَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ﴾ گذشتہ درس کی عبارتوں میں دی گئی توضیحات کی بنا پر ایسے نظریہ سے سازگار نہیں ہے۔

۵.آیات قرآن نہ صرف روح کے وجود پر دلالت کرتی ہیں بلکہ انسان کی موت کے بعد بقاء واستقلال کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔

۶.روح کا وجود واستقلال بھی آیات قرآن کے علاوہ عقلی دلیلوں اور تجربی شواہد سے بھی ثابت ہے۔

تمرین

اس فصل سے مربوط اپنی معلومات کو مندرجہ ذیل سوالات وجوابات کے ذریعہ آزمائیں، اگر ان کے جوابات میں مشکلات سے دوچار ہوں تو دوبارہ مطالب کو دہرائیں:

۱.''انسان کی خلقت'' کو قرآن کی تین آیتوں سے واضح کیجئے؟

۲.انسان کے دو پہلو ہونے سے مراد کیا ہے؟

۳.مندرجہ ذیل موارد میں سے کون سا مورد، ڈارون کے نظریہ ''اقسام کی علت'' انسان کے ضروری تکامل کے مطابق ہے؟

الف) حضرت آدمؑ کی مخصوص خلقت کو بیان کرنے والی آیات کی توجیہ کریں۔

ب) انسان کے اندر، ذاتی کرامت وشرافت نہیں ہے۔

ج) جس جنت میں حضرت آدمؑ خلق ہوئے وہ زمین ہی کا کوئی باغ ہے۔

د) جناب آدمؑ کا نازل ہونا اور ان کے سامنے فرشتوں کا سجدہ کرنا ایک عقیدتی مسئلہ ہے۔

۴.جو حضرات بالکل روح انسان کے منکر ہیں من جملہ حوادث میں تفکر کی قدرت، حافظہ اور

تصورات وغیرہ کی کس طرح توجیہ کرتے ہیں اور انہیں کیا جواب دیا جاسکتا ہے؟

۵. روح وجسم کے درمیان پانچ قسم کے رابطہ کو ذکر کریں اور ہر ایک کے لئے مثال پیش کریں؟

۶. آپ کے اعتبار سے کون سی آیت بہت ہی واضح روح کے وجود واستقلال کو بیان کرتی ہے؟ اور کس طرح؟

۷. روح انسانی سے انکار کے غلط اثرات کیا ہیں؟

۸. انسان وحیوان کے درمیان مقام ومرتبہ کا فرق ہے یا نوع وماہیت کا فرق ہے؟

۹. لیزری ڈیسکیں اور مانیٹر پر ان کی اطلاعات کی نمائش، آیا صغیر پر کبیر کے انطباقی مصادیق وموارد میں سے ہے؟

۱۰. ہم میں سے ہر ایک مخصوص زمان ومکان میں خلق ہوا ہے اور مطالب کو بھی مخصوص زمان و مکان میں درک کرتا ہے، تو کیا یہ بات روح اور روحی حوادث کے زمان ومکان سے محدود ہونے کی علامت نہیں ہے؟

۱۱. جسم وجسمانی حوادث اور روح وروحانی حوادث کی خصوصیات کیا ہیں؟

مزید مطالعہ کے لئے

۱۔ انسان کی خلقت میں علم ودین کے نظریات کے لئے، ملاحظہ ہو:

۔ البار، محمد علی، خلق الانسان بین الطب والقرآن، بیروت، ...

۔ بوکای، موریس (۱۳۶۸) مقایسہ ای تطبیقی میان تورات، انجیل، قرآن وعلم، ترجمہ، ذبیح اللہ دبیر، تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی۔

۔ سبحانی، جعفر (۱۳۵۲) بررسی علمی ڈارویزم، تہران: کتابخانہ بزرگ اسلامی،

۔سلطانی نسب، رضا، وفرہادگرجی (۱۳۶۸) جنین شناشی انسان (بررسی تکامل طبیعی وغیرطبیعی انسان) تہران: جہاددانشگاہی۔

۔شاکرین، حمیدرضا قرآن ورویان شناسی، حوزہ ودانشگاہ کے مجلّہ سے منقول، سال دوم، شمارہ ۸۔

۔شکرکن، حسین، ودیگران (۱۳۷۲) مکتبھای روان شناسی ونقدآن. ج ۲، تہران: سمت، دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ۔

۔محمدحسین طباطبائی (۱۳۶۹) انسان ازآغازتاانجام، ترجمہ وتعلیقات: صادق لاریجانی آملی، تہران: الزہرا۔

۔.....(۱۳۵۹) فرازھایی ازاسلام. تہران: جہان آرا.

۔.....(۱۳۶۱) آغازپیدایش انسان؛ تہران: بنیادفرہنگی امام رضاؑ

۔قراملکی، فرامرز (۱۳۷۳) موضع علم ودین درخلقت انسان. تہران: موسسہ فرہنگی آرایہ.

۔محمدتقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خداشناسی، کیھان شناسی، انسان شناسی) قم: موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۶۸) مجموعہ آثارج ۱، تہران: صدرا.

۔مکارم شیرازی، ناصر، ڈارویزم کے بارے میں بحث وتحقیق وتحلیل اورتکامل کے بارے میں جدید نظریات. قم: نسل جوان۔

۔مہاجری، مسیح (۱۳۶۳) تکامل ازدیدگاہ قرآن. تہران: دفترنشرفرہنگی اسلامی. واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان دراسلام. تہران: دفترہمکاری حوزہ ودانشگاہ (سمت)

اس فصل میں مذکورہ تفسیری کتابیں۔

۲۔کلمہ نفس وروح کے سلسلہ میں، اس کے اصطلاحی معانی واستعمالات اورخداوندعالم سے منسوب روح سے مراد کے لئے. ملاحظہ ہو:

۔حسن زادہ آملی، حسن، معرفت نفس، دفتر سوم، ص ۴۳۷.۴۳۸.
۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم: موسسہ
۔آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ ص ۳۵۶.۳۵۷ واخلاق درقرآن ج ۲ ص ۲۰۰ سے ۲۰۸ تک۔
۳۔روح انسان اور نفس وبدن یا روح وجسم کے رابطہ میں مختلف نظریات کے لئے ملاحظہ ہو:
۔بہشتی، محمد (۱۳۷۵) ''کیفیت ارتباط ساحتھای وجودانسان'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ، دفتر ہمکاری حوزہ و
دانشگاہ، شمارہ نہم، ص ۲۹۔۳۷.
۔دیونای، امیر (۱۳۷۶) حیات جاودانہ. پژوہشی درقلمرو ومعادشناسی، قم؛ معاونت امور اساتید و
دروس معارف اسلامی.
۔رؤف، عبید (۱۳۶۳) انسان روح است نہ جسد، ترجمہ زین العابدین کاظمی خلخالی، تہران: دنیای
کتاب.
۔شکرکن، حسین ودیگران (۱۳۷۲) مکتبہای رواان شناسی ونقدآن. تہران. دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ
(سمت) ص ۲۰۶، ۲۰۷ و ۳۶۹، ۳۸۶).
۔غروی، سید محمد (۱۳۷۵) ''رابطہ نفس وبدن'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ، شمارہ نہم ص ۸۴ تا ۸۸.
۔واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان دراسلام، تہران: دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ (سمت)

۵

انسان کی فطرت

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات:

۱.انسانی مشترکہ طبیعت سے مراد کیا ہے وضاحت کریں؟

۲.دینی اعتبار سے انسان کے مشترکہ عناصر کا بنیادی نقطہ بیان کریں؟

۳.انسانی مشترکہ طبیعت کے وجود پر دلیلیں پیش کریں؟

۴.انسانی تین مشترکہ طبیعت کی خصوصیات کے نام بتائیں اور ہر ایک کے بارے میں مختصر وضاحت پیش کریں؟

۵.ان آیات وروایات کے مضامین جو انسان کی مشترکہ طبیعت کے وجود کی بہت ہی واضح طور پر تائید کرتی ہیں بیان کیجیئے؟

۶.توحید کے فطری ہونے کے باب میں مذکورہ تین احتمال بیان کریں؟

۷.سورۂ روم کی آیت نمبر ۳۰ کو ذکر کریں اور اس آیت کی روشنی میں فطرت کے زوال ناپذیر ہونے کی وضاحت کریں؟

اپنے اور دوسروں کے بارے میں تھوڑی سی توجہ کرنے سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے اور ہم جیسے دوسرے افراد کے عادات واطوار نیز ظاہری شکل وشمائل کے درمیان اختلاف کے باوجود ایک دوسرے میں جسم وروح کے لحاظ سے بہت زیادہ اشتراک ہے، اپنے اور دوسروں کے درمیان موجودہ مشترک چیزوں میں غور وفکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشترک علت کبھی تو ہمارے اور بعض لوگوں کے درمیان یا انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان ہے مثال کے طور پر زبان، رنگ، قومیت، آداب ورسوم، افعال، قد کا زیادہ اور کم ہونے وغیرہ میں اشتراک ہے۔ اور کبھی یہ امور سبھی افراد میں نظر آتے ہیں جیسے حواس پنجگانہ رکھنا، قد کا سیدھا ہونا، خدا کا محتاج ہونا، جستجو کی حس، حقیقت کی خواہش اور آزاد خیال ہونا وغیرہ۔

مشترک کی پہلی قسم، بعض افراد انسان میں نہ ہونے کی وجہ سے انسان کی فطری اور ذاتی چیزوں میں شمار نہیں ہوسکتی ہے لیکن مشترک کی دوسری قسم میں غور وفکر سے مندرجہ ذیل مہم اور بنیادی سوالات ظاہر ہوتے ہیں۔

۱. گذشتہ فصل کے مباحث کی روشنی میں ان مشترکہ امور کا انسان کی واقعی حقیقت اور ذات سے کیا رابطہ ہے؟ کیا یہ سبھی مشترکہ چیزیں انسان کی ذات سے وجود میں آتی ہیں؟

۲. ذاتی مشترک چیزوں کی خصوصیات کیا ہیں اور غیر ذاتی چیزوں سے ذاتی مشترک چیزوں

(انسان کی مشترکہ فطرت) کی شناخت کا ذریعہ کیا ہے؟

۳.انسان کے یہ مشترکہ اسباب اس کی زندگی میں کیا کردار ادا کرتے ہیں؟

۴.ان ذاتی مشترک چیزوں کی قسمیں یا مصادیق وموارد کیا ہیں؟

۵.انسان کی شخصیت اور بناوٹ اور الٰہی فطرت سے ذاتی مشترکہ چیزیں کیا رابطہ رکھتی ہیں؟

۶.کیا انسان ان ذاتی مشترکہ چیزوں کی بنا پر خیر خواہ اور نیک مخلوق ہے یا پست وذلیل مخلوق ہے یا ان دونوں کا مجموعہ ہے؟

ان سوالات کے جوابات کا معلوم کرنا وہ ہدف ہے جس کے مطابق یہ فصل (انسان کی فطرت کے عنوان سے) مرتب ہوئی ہے۔(۱)

انسانی مشترکہ طبیعت

انسان کی فطرت کے بارے میں گفتگو کو انسان شناسی کے مہم ترین مباحث میں سے ایک سمجھا جاسکتا ہے، جو جاری چند صدیوں میں بہت سے مفکرین کے ذہنوں کو اپنی طرف معطوف کئے ہوئے ہے۔

یہ مسئلہ متعدد ومختلف تعریفوں کو پیش کرنے کے باوجود ایک معتبر ومتیقن طریقۂ معرفت کے نہ ہونے اور ذات انسان کے پر اسرار ومخفی ہونے کی وجہ سے بہت سے دانشمندوں کی حیرت و پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے ان میں سے بعض جیسے ''پاسکال'' کو مجبور ہونا پڑا کہ انسان کی فطرت اور ذات کی معرفت کو غیر ممکن سمجھے (۲) اور بعض لوگوں کی اس گمان کی طرف رہنمائی کی ہے کہ انسانوں

---

(۱) اس بحث کو حجۃ الاسلام احمد واعظی زید عزہ نے آمادہ کیا ہے جو تھوڑی اصلاح اور اضافہ کے ساتھ معزز قارئین کی خدمت میں پیش ہو رہی ہے۔ (۲) پاسکال منجملہ ان لوگوں میں سے ہے جو معتقد تھا کہ انسان کی معرفت کی عام راہیں کسی وقت بھی انسان کے سلسلہ میں صحیح معلومات فراہم نہیں کرسکتی ہیں۔اور دین جو انسان کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے وہ بھی انسان کو مزید پر اسرار بنا دیتا ہے اور اس کو خداوند عالم کی طرح پوشیدہ اور مرموز کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو: کیسیر ر، ارنسٹ؛ فلسفہ وفرہنگ؛ ص ۳۴ و ۳۶۔

کے درمیان مشترکہ فطرت وذات کے وجود کے منکر ہوں (۱) مثال کے طور پر ''جوزارٹگا'' (۲) اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ ''فطری علوم، حیات انسانی کی حیرت انگیز حقیقت کے مقابلہ میں متحیر ہیں۔ انسان سے پردۂ اسرار کے نہ ہٹنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان کوئی شیٔ نہیں ہے اور انسان کی فطرت کے بارے میں گفتگو کرنا کذب محض ہے۔ فطرت وطینت نامی کوئی بھی شیٔ انسان میں نہیں ہے''۔ (۳)

بہتر یہ ہوگا کہ انسان کی مشترکہ فطرت کی نفی یا اثبات کی دلیلوں کو پیش کرنے سے پہلے مشترکہ فطرت وطینت کے مقصود کو واضح کیا جائے۔

مشترکہ فطرت سے مراد (۴)

حیوان کے مختلف اقسام میں مشترکہ جہتیں اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ فطری چیزوں کا وجود

---

(۱) ڈوریکیم کی طرح جامعہ کو اصل سمجھنے میں افراط کرنے والے اور ژان پل سارٹر کی طرح عقیدۂ وجود رکھنے والے اور فرڈریچ ہگل (Georg Wilhelm Friedrich Hegel) کی طرح عقیدۂ تاریخ رکھنے والے نیز ریچارڈ پالمر (Richard Palmer) منجملہ ان لوگوں میں سے ہیں جو مورد نظر معانی میں انسان کی مشترکہ فطرت کے منکر ہیں. ملاحظہ ہو: اسٹیونسن، لسلی ہفت نظریہ در باب انسان؛ ص ۱۳۶۔۱۳۸۔ محمد تقی مصباح؛ جامعہ وتاریخ از دیدگاہ قرآن؛ سازمان تبلیغیات اسلامی، تہران؛ ۱۳۶۸، ص ۴۷ و ۴۸۔ (۳) کیسیر ر، ارنسٹ، گذشتہ حوالہ؛ ص ۲۴۲۔

(۲).Cjose Ortega Y Gasset

(۴) کلمہ ''فطرت انسان'' کے مختلف ومتنوع استعمالات ہیں: مالینوفسکی کی طرح مفکرین اس کو مادی ضرورتوں میں منحصر کردیتے ہیں. کولی کی طرح بعض دوسرے مفکرین ''اجتماعی فطرت'' خصوصاً اجتماعی زندگی میں جو احساسات اور انگیزے ابتدائی معاشرے میں ہوتے ہیں بیان کرتے ہوئے متعدد فطرت وسماج پر یقین رکھتے ہیں، بعض نے اجتماعی فطرت کو ابتدائی گروہ (جیسے خاندان) اور سماجی طبیعت واجتماعی کمیٹیوں سے وجود میں آنے کے بارے میں گفتگو کی ہے، وہ چیز جو ان نظریات میں معمولاً مورد غفلت واقع ہوتی ہے وہ انسان کی مخصوص اور بلند وبالا فطرت ہے جو انسان وحیوان کی مشترکہ اور اس کی مادی ودنیاوی ضرورتوں سے بلند وبالا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جو اس بحث میں شدید مورد توجہ واقع ہوئی ہے۔

جیسے نفس کو بچانا اور حفاظت کرنا اور تولید نسل کرنا وغیرہ ان کی مشترکہ فطرت پر دلالت کرتی ہے۔اس لئے کہ یہ فطری چیزیں سبھی حیوانوں کے درمیان مشترک ہیں لیکن حیوان کی ہر فرد ان مشترکہ فطرت کے علاوہ اپنے مطابق صفات وکردار کی بھی مالک ہوتی ہے، چونکہ حیوانوں کے اندر نفوذ کر کے ان کی ذاتیات کو کشف کرنا انسان کے لئے خیال وگمان کی حد سے زیادہ میسر نہیں ہے، لہٰذا بیرونی افعال جیسے گھر بنانے کا طریقہ، غذا حاصل کرنا، نومولود کی حفاظت، اجتماعی یا فردی زندگی گذارنے کی کیفیت اور اجتماعی زندگی میں تقسیم کار کی کیفیت کے عکس العمل کی بنیاد پر حیوان کی ایک فرد کو دوسری فرد سے جدا کیا جاسکتا ہے، مذکورہ خصوصیات کو حیوانوں کی فطرت وطینت کے فرق وتبدیلی کی وجہ سمجھنا چاہیئے۔

انسان کا اپنی مخصوص فطرت وطینت والا ہونے سے مراد یہ بات ثابت کرنا نہیں ہے کہ انسان سبھی حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے اور حیوانوں کی ہی قسموں میں سے ہر ایک کی طرح یہ نوع بھی اپنی مخصوص امتیاز رکھتی ہے، بلکہ مقصود اس نکتہ کا ثابت کرنا ہے کہ انسان حیوانی فطرت کے علاوہ بعض مشترکہ خصوصیات کا مالک ہے۔حیوانی وکسبی چیزوں کے بجائے مشترکہ خصوصیات کا مقام جستجو، فہم خواہشات اور انسان کی توانائی ہے، اگر ہم یہ ثابت کر سکے کہ انسان، مخصوص فہم ومعرفت یا خواہشات وتوانائی کا مالک ہے جس سے سبھی حیوانات محروم ہیں تو ایسی صورت میں انسان کی خصوصیت اور حیوانیت سے بالاتر مشترکہ فطرت ثابت ہو جائے گی۔(۱)

---

(۱) فصل اول میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ انسان اور اس کی خصوصیات کی معرفت کے لئے چار طریقوں؛ عقل، تجربہ، شہود اور وحی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔اور ان کے درمیان طریقہ وحی، کو مذکورہ خصوصیات کی روشنی میں دوسری راہوں پر ترجیح حاصل ہے اگر چہ ہر راہ وروش اپنے مخصوص مقام میں نتیجہ بخش ہے، فطرت انسان کی شناخت میں بھی یہ مسئلہ منکرین کے لئے مورد توجہ رہا ہے اور انھوں نے اس سلسلہ میں بحث وتحقیق بھی کی ہے۔جو کچھ پہلی فصل میں بیان ہو چکا ہے وہ ہمیں مزید اس مسئلہ میں گفتگو کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے: ملاحظہ ہو؛ ازرائل شفلر؛ در باب استعدادھای آدمی، گفتاری در فلسفہ تعلیم وتربیت، دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ، سمت، ۱۳۷۷ تہران: ص ۱۶۳

مشترکہ فطرت کی خصوصیات

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کی مشترکہ فطرت کی پہلی خصوصیت اس کا حیوانیت سے بالاتر ہونا ہے اس لئے کہ تمایل ورجحانات تفکر وبینش حیوانوں میں پائی ہی نہیں جاتی ہے مثال کے طور پر نتیجہ اور استدلال کی قدرت اور جاہ طلبی یا کم از کم انسان کے اندر وسعت کے مطابق ہی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں جو باقی حیوانوں میں نہیں ہوتی ہیں مثال کے طور پر گرچہ حیوانات بھی معلومات رکھتے ہیں لیکن حیوانوں کی معلومات انسانوں کی معلومات کے مقابلہ میں نہ ہی اس میں وسعت ہے اور نہ ہی ظرافت وتعمق جیسے صفات کی حامل ہے، اسی وجہ سے انسان اور حیوان میں معلومات کے نتائج وآثار بھی قابل قیاس نہیں ہیں، علم وٹیکنالوجی انسان سے مخصوص ہے۔ مشترکہ فطرت کی دوسری خصوصیت، حضوری فطرت ہے۔ تعلیم وتعلّم اور دوسرے اجتماعی عوامل اور مشترکہ فطرت کے عناصر کی پیدائش میں ماحول کا کوئی کردار نہیں ہے اسی بنا پر یہ عناصر انسان کی تمام افراد میں ہر ماحول واجتماع اور تعلیم تعلّم میں (چاہے شدت وضعف اور درجات متفاوت ہوں) وجود رکھتا ہے۔

انسان کی مشترکہ فطرت کے عناصر کی تیسری خصوصیت، لازوال ہونا ہے، انسان کی مشترکہ فطرت چونکہ اس کی انسانیت کی ابتدائی حقیقت وشخصیت کو تشکیل دیتی ہے لہٰذا انسان سے جدا اور الگ نہیں ہوسکتی اور فرض کے طور پر اگر ایسے افراد ہوں جو ان عناصر سے بے بہرہ ہوں یا بالکل کھو چکے ہوں ان کی حیثیت حیوان سے زیادہ نہیں ہے اور ان کا شمار انسان کی صفوں میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی تو بعض عناصر کے نابود ہوجانے سے اس کی دائمی زندگی مورد سوال واقع ہوجاتی ہے مثال کے طور پر جو قدرت عقل ودانائی سے دور ہو یا عقل ہی نہ رکھتا ہو وہ گرچہ ظاہری شکل وصورت، رفتار وکردار میں دوسرے انسانوں کی طرح ہے لیکن درحقیقت وہ حیوانی جہت سے اپنی زندگی گذار رہا ہے اور اس سے انسانی سعادت سلب ہوچکی ہے، مذکورہ خصوصیات میں سے ہر ایک انسان کی مشترکہ فطرت کے عناصر کی معرفت کے لئے معیار ہیں۔ اور ان خصوصیات کا انسان کے ارادے اور تمایل، فکری توانائی اور

بینش کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ ارادے، فکری توانائی اور بینش، انسانی فطرت کا حصہ ہیں۔

ماحول اور اجتماعی اسباب کا کردار

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کی مشترکہ فطرت کے عناصر روز خلقت ہی سے تمام انسانوں کے اندر ودیعت کر دیئے گئے ہیں جس کو ماحول اور اجتماعی عوامل نہ ہی مہیا کر سکتے ہیں اور نہ ہی نابود کر سکتے ہیں۔ مذکورہ عوامل انسان کی فطرت میں قدرت وضعف یا رہنمائی کا کردار ادا کرتے ہیں مثال کے طور پر حقیقت کی طلب اور مقام ومنزلت کی خواہش فطری طور پر تمام انسانوں میں موجود ہے البتہ بعض افراد میں تعلیم وتعلم اور ماحول واجتماعی اسباب کے زیر اثر پستی پائی جاسکتی ہے یا بعض افراد میں قوت وشدت پائی جاسکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں فطری خواہش کسی خاص اہداف کے تحت مورد استفادہ واقع ہوں جو تعلیم وتربیت اور فردی واجتماعی ماحول کی وجہ سے وجود میں آئے ہوں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مشترکہ فطرت کے ذاتی اور حقیقی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے سبھی عناصر فعلیت اور تکامل سے برخوردار ہیں بلکہ انسانوں کی مشترکہ فطرت کو ایسی قابلیت اور توانائی پر مشتمل سمجھنا چاہیئے جو وقت کے ساتھ ساتھ اور بیرونی شرائط کے فراہم ہوتے ہی استعمال اور انجام پاتے ہیں، یہ نکتہ ایک دوسرے زاویہ سے بعض مشترکہ فطری عناصر پر ماحول اور اجتماعی توانائی کے اسباب کے تاثرات کو بیان وواضح کرتا ہے۔

انسانی مشترکہ فطرت پر دلائل

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ انسان کی مخصوص خلقت اور حیوانیت سے بالاتر گوشوں کو اس کی فہم، خواہش اور توانائی؛ تین پہلوؤں میں تلاش کرنا چاہیئے اور یہ جستجو دینی متون اور عقل وتجربہ ہی کی مدد سے ممکن ہے پہلے تو ہم غیر دینی طریقوں اور بغیر آیات وروایات سے استفادہ کرتے ہوئے انسانوں کی مشترکہ فطرت کو مورد تحلیل وتحقیق قرار دیں گے اور آخر میں دینی نظریہ سے یعنی دین کی نگاہ میں

انسانوں کی مشترکہ فطرت (الٰہی فطرت) کے مرکزی عنصر کو آیات وروایات کی روشنی میں تجزیہ وتحلیل کریں گے۔

انسانوں کی مشترکہ فطرت کے وجود پر پہلی دلیل یہ ہے کہ انسان ایک مخصوص فہم ومعرفت کا مالک ہے، انسان اس فہم وادراک کی مدد سے قیاس اور نتیجہ اخذ کرتا ہے اور اپنی گذشتہ معلومات کے ذریعہ نئی معلومات تک پہونچتا ہے۔ انسان کا نتیجہ حاصل کرنا، عقلی ادراک اور قواعد واصول پر استوار ہے، مثال کے طور پر ''نقیضین کا جمع ہونا محال ہے، نقیضین کا رفع بھی محال ہے، سلب الشئ عن نفسہ ممکن نہیں ہے، کسی شئ کا اپنے آپ پر مقدم ہونا محال ہے'' یہ ایسے قضایا ہیں جن کو اصول وقواعد کا نمونہ سمجھا جانا چاہیئے، یہ قضایا فوراً فہم وحواس کے ادراک میں نہیں آتے ہیں بلکہ بشر کی اس طرح خلقت ہوئی ہے کہ اس کے ذہن کے آمادہ ہونے کے بعد یعنی جب اس کے حواس فعال ہوں اور اس کے لئے تصورات کے اسباب فراہم ہوں تو دھیرے دھیرے اس کی ذہنی قابلیت رونما ہوگی اور اس طرح سے بدیہی قضایا حاصل ہوں گے۔ ان بدیہی قضایا کی مدد سے انسان کا ذہن اپنی تصدیقات اور مقدمات کو مختلف شکل وصورت میں مرتب کرتا ہے اور اقسام قیاس کو ترتیب دیتے ہوئے اپنی معلومات حاصل کر لیتا ہے، ایسی بدیہی معلومات کو ''ادراکات فطری'' کہتے ہیں، اس معنی میں کہ انسان فطری اور ذاتی طور پر اس طرح خلق ہوا ہے کہ حواس کے بے کار ہونے کے بعد بھی خود بخود ان ادراک کو حاصل کر لیتا ہے، اس طرح نہیں جیسا کہ مغرب میں عقل کو اصل ماننے والے ''ڈکارٹ'' اور اس کے ماننے والوں کا نظریہ ہے کہ ادراکات بغیر کسی حواس ظاہری اور باطنی فعالیت کے انسان کی طبیعی فطرت میں ہمیشہ موجود ہیں۔

انسان کے اخلاق وکردار کی معرفت بھی مشترکہ فطرت کی اثبات کے لئے موافق ماحول فراہم کرتی ہے، فردی تجربہ وشواہد اور بعض مشترکہ اخلاقی عقائد کا گذشتہ افراد کے اعمال میں تاریخی جستجو، مثال کے طور پر عدالت اور وفاداری کا اچھا ہونا، ظلم اور امانت میں خیانت کا برا ہونا وغیرہ کو بعض

مفکرین مثال کے طور پر ''ایمانول کانٹ'' فقط عقل عملی کے احکام کی حیثیت سے مانتے ہیں اور کبھی اس کو ''حسّ اخلاقی'' یا ''وجدان اخلاقی'' سے تعبیر کرتے ہیں اس نظریہ کے مطابق تمام انسان ایک مخصوص اخلاقی استعداد کی صلاحیت رکھتے ہیں جو نکھرنے کے بعد بدیہی اور قطعی احکام بن جاتے ہیں۔

البتہ ان اخلاقی احکام کا صرف ''عقل عملی'' نامی جدید قوت، نیز ''وجدان یا حس اخلاقی'' سے منسوب ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسی عقل کا کام ہوسکتا ہے جو نظری امور کو حاصل کرتی ہے بہر حال جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان ذاتی اور نظری طور سے ان اہم قضایا اور احکام کا مالک ہے۔

مشترکہ فطرت کے وجود کی دوسری دلیل، انسانوں کے درمیان حیوانیت سے بالا تمنا اور آرزوؤں کا وجود ہے۔ علم طلبی اور حقیقت کی تلاش، فضیلت کی خواہش، بلندی کی تمنا، خوبصورتی کی آرزو، ہمیشہ باقی رہنے کی خواہش اور عبادت کا جذبہ یہ ساری چیزیں حقیقی اور فطری خواہشات کے نمونے ہیں اور ان کے حقیقی اور فطری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کی روح ان خواہشات کے ہمراہ ہے اور یہ ہمراہی بیرونی اسباب اور تربیت، معاشرہ اور ماحول کے تصادم سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ یہ انسانی روح کی خاصیت ہے اور ہر انسان فطری طور پر (خواہ بہت زیادہ ضعیف اور پوشیدہ طور پر ہو) ان خواہشات سے بہرہ مند ہے۔

اور جیسا کہ بیان ہوا ہے کہ ان کے استعمال اور ان کی نشو ونما میں بیرونی عوامل، اسباب و علل بھی ان خواہشات کی کمی اور زیادتی میں دخیل ہیں لیکن ان کی تخلیق اور حقیقی خلقت میں موثر نہیں ہیں مثال کے طور پر انسان کی فطری خواہش کا جاننا، آگاہ ہونا اور دنیا کے حقائق کو معلوم کرنا صغر سنی ہی کے زمانے سے عیاں ہوتی ہے اور یہ چیز انسان سے آخری لمحات تک سلب نہیں ہوتی ہے، ذہن انسانی کی مختلف قوتیں اور طاقتیں اس فطری خواہش کی تسکین کے لئے ایک مفید وسیلہ ہیں۔

فطری خواہشات کا ایک اور نمونہ خوبصورتی کی خواہش ہے جو انسان کی فطرت وذات سے تعلق رکھتی ہے پوری تاریخ بشر میں انسان کی تمام نقاشی کی تخلیقات اسی خوبصورت شناسی کے حس کی وجہ سے ہے البتہ خوبصورت چیزوں کی تشخیص یا خوبصورتی کی تعریف میں نظریاتی اختلاف ہونا اس کی طرف تمایل کی حقیقت سے منافات نہیں رکھتا ہے۔

مشترکہ فطرت کی تیسری جستجو خود انسان کی ذاتی توانائی ہے، معتبر علامتوں کے ذریعہ سمجھنا اور سمجھانا، زبان سیکھنے کی توانائی، عروج و بلندی کے عالی مدارج تک رسائی اور تہذیب نفس وغیرہ جیسی چیزیں انسان کی منجملہ قوتیں ہیں جو مشترکہ فطری عناصر میں شمار ہوتی ہیں اور روز تولد ہی سے انسان کے ہمراہ ہیں، اور دوسرے عوامل فقط قوت وضعف میں ان کی ترقی ورشد کا کردار ادا کرتے ہیں، یہ قوتیں بھی انسان کی مشترکہ فطرت کے وجود کی دلیل ہیں۔(۱) معارف اور خواہشات کے پائے جانے کے سلسلہ میں انسان کی آئندہ مشترکہ توانائی کے وجود کی آیات وروایات میں بھی تائید وتاکید ہوئی ہے مثال کے طور پر آیہ فطرت جس کے بارے میں آئندہ بحث کریں گے اور وہ آیات جو انسانوں کی مشترکہ فطری شناخت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور آیہ شریفہ ﴿وَ نَفسٍ وَ مَا سَوّیھَا فَألھَمَھَا فُجُورَھَا وَ تَقوَیھَا﴾ (۲) (قسم ہے نفس انسانی کی اور اس ذات کی کہ جس نے اسے درست کیا پھر اس کی بدکاری اور پرہیز گاری کو الہام کے ذریعہ اس تک پہونچایا) مشترکہ اخلاقی اور اعتباری فطرت کی تائید کرتی ہے اور بہت سی آیات انسان کو انسانیت کے بلند ترین مرتبہ تک پہونچنے میں تلاش اور ختم نہ ہونے والے

---

(۱) گذشتہ فصل میں ہم انسان شناسی کی ضرورت واہمیت کے عنوان سے انسانی علوم میں انسانوں کی مشترکہ عقیدہ کو بیان کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں انسان کی مشترکہ فطرت کے آثار وعقائد پر بحث کرنے سے صرف نظر کرتے ہوئے اس نکتہ کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں کہ انسانی اور بین الاقوامی اقتصادی، حقوقی، تربیتی اور اخلاقی ہر قسم کا نظام، انسان کی مشترکہ فطرت کی قبولیت سے وابستہ ہے اور انسانی مشترکہ فطرت کے انکار کی صورت میں یہ نظام بے اہمیت ہو جائیں گے۔(۲) سورۂ شمس ۷ و ۸۔

کمال کے حصول کی دعوت دیتی ہیں اور ضمنی طور پر اس راہ میں گامزن ہونے کے لئے انسان کی ذاتی قدرت کو مورد توجہ قرار دیتی ہیں۔

فطرت (۱)

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ آیات وروایات میں وہ مطالب بھی مذکور ہیں جو وضاحت کے ساتھ یا ضمنی طور پر انسان کی مخصوص حقیقت، مشترکہ فطرت اور معرفت کی راہ میں اس کے خصوصی عناصر نیز خواہشات اور قدرت کے وجود پر دلالت کرتے ہیں لیکن وہ چیز جس کی آیات وروایات میں بہت زیادہ تاکید وتائید ہوئی ہے وہ فطرت الٰہی ہے اور اس حقیقت پر بہت ہی واضح دلالت کرنے والی، سورۂ روم کی تیسویں آیہ ہے۔

﴿فأَقِم وَجهَکَ لِلدِّینِ حَنِیفاً فِطرَتَ اللّٰهِ الّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیهَا لا تَبدِیلَ لِخَلقِ اللّٰهِ﴾

تو تم باطل سے کترا کے اپنا رخ دین کی طرف کئے رہو، یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے۔

یہ آیہ انسان میں فطرت الٰہی کے وجود پر دلالت کرتی ہے یعنی انسان ایک ایسی فطرت، سرشت اور طبیعت کے ہمراہ خلق ہوا ہے کہ جس میں دین قبول کرنے کی صلاحیت ہے لہٰذا انبیاء علیہم السلام خداوند عالم کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف انسانوں کو دعوت دینے کے سلسلہ میں کسی بے توجہ مخلوق سے مخاطب نہیں تھے بلکہ انسان کی فطرت اور ذات میں توحید کی طرف میلان اور کشش پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان ذاتی طور پر خدا سے آشنا ہے، اس آیت کے علاوہ بعض روایات میں بھی انسان کے اندر الٰہی فطرت کے وجود کی وضاحت ہوئی ہے۔

---

(۱) کلمہ فطرت؛ لغت میں کسی شئی کے خلقت کی کیفیت کے معنی میں آیا ہے اور اصطلاح کے اعتبار سے مفکرین کے درمیان متعدد استعمالات ہیں جن کو ضمیمہ میں اشارہ کیا جائے گا۔

امام محمد باقرؑ نے پیغمبرؐ سے منقول روایت کی وضاحت میں فرمایا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا: ''کُـل مَـولـودٍ یُـولـدُ عَـلـیٰ الفِطرَة ''(۱) ''ہر بچہ توحیدی فطرت پر متولد ہوتا ہے'' پھر آپ نے فرمایا: ''یـعـنِی المَعرفَة بِأنّ اللّٰه عَزّو جلّ خَالقُه '' مراد پیغمبر یہ ہے کہ ہر بچہ اس معرفت وآگاہی کے ساتھ متولد ہوتا ہے کہ اللہ اس کا خالق ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ: ''کَـلـمةُ الإخلاص هِی الفِطرَة ''(۲) خداوند عالم کو سمجھنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

بعض مشترکہ فطری عناصر کا پوشیدہ ہونا

معرفت شناسی سے مرتبط مباحث میں اسلامی حکماء نے ثابت کیا ہے کہ انسان کی فکری معرفت اس کی ذات کے اندر ہی پوشیدہ اور قابلیت کے طور پر موجود ہے اور مرور ایام سے وہ ظاہر ہوتی ہے۔ دینی متون کے اعتبار سے بھی انسان، اپنی پیدائش کے وقت ہر قسم کے ادراک اور علم سے عاری ہوتا ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ أَخرَجَکُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِکُم لا تَعلَمُونَ شَیئاً وَ جَعَلَ لَکُم السَّمعَ وَ الأبصَارَ وَ الأفئِدَةَ لَعَلَّکُم تَشکُرُونَ﴾(۳)

اور خدا ہی نے تم کو ماؤں کے پیٹ سے نکالا جب کہ تم بالکل ناسمجھ تھے اور تم کو سماعت، بصارت اور دل عطا کئے تا کہ تم شکر کرو۔

ممکن ہے یہ توہّم ہو کہ اس آیت کا مفہوم انسان کے متولد ہونے کے وقت ہر طرح کی معرفت سے عاری ہونا ہے، لہٰذا یہ خداوند عالم کی حضوری وفطری معرفت کے وجود سے سازگار نہیں

.....

(۱) کلینی، محمد بن یعقوب؛ اصول کافی؛ ج۲ ص۱۳۔

(۲) نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۰

(۳) سورہ نحل ۷۸۔

ہے، لیکن جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ مذکورہ آیہ انسان کی خلقت کے وقت تمام اکتسابی علوم کی نفی کرتی ہے لیکن یہ امکان ہے کہ انسان سے علم حضوری کے وجود کی نفی نہ کرتی ہو، اس مطلب کی دلیل یہ ہے کہ کان اور قلب کو انسان کی جہالت برطرف کرنے والے اسباب کے عنوان سے نام لیا ہے اس لئے کہ اکتسابی علم میں ان اسباب کی ضرورت ہے، گویا آیہ خلقت کے وقت آنکھ، کان اور دوسرے حواس سے حاصل علوم کی نفی کرتی ہے لیکن انسان سے حضوری علوم کی نفی نہیں کرتی ہے۔

تقریباً یہ بات اتفاقی ہے کہ انسان کے اندر موجودہ فطری اور طبیعی امور چاہے وہ انسان کے حیوانی پہلو سے مرتبط ہوں جیسے خواہشات اور وہ چیزیں جو اس کی حیوانیت سے بالاتر اور انسانی پہلو سے مخصوص ہیں خلقت کے وقت ظاہر اور عیاں نہیں ہوتے ہیں، بلکہ کچھ پوشیدہ اور مخفی صلاحیتیں ہیں جو مرور ایام سے دھیرے دھیرے نمایاں ہوتی رہتی ہیں جیسے جنسی خواہش اور ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا، لہٰذا وہ چیز جس کی واضح طور پر تائید کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ فطری امور انسان کی خلقت کے وقت موجود رہتے ہیں، لیکن خلقت کے وقت ہی سے کسی بھی مرحلہ میں ان کے فعال ہونے کے دعوے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔(۱)

.....

(۱) وہ چیزیں جو فطری امور کے عنوان سے مورد تحقیق واقع ہوچکی ہیں وہ انسان کی فطری وذاتی خصوصیات تھیں۔ لیکن یہ جاننا چاہیئے کہ فطری وصف کبھی انسانی خصوصیات کے علاوہ بعض دوسرے امور پر صادق آتا ہے، مثال کے طور پر کبھی خود دین اور شریعت اسلام کے فطری ہونے کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی ہے اور اس سے مراد انسان کے وجودی کردار اور حقیقی کمال کی روشنی میں ان مفاہیم کی مناسبت ومطابقت ہے، انسان کی فطری قابلیت واستعداد سے اسلامی تعلیمات اور مفاہیم شریعت کا اس کے حقیقی کمال سے مربوط ہونا نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی مختلف فطری اور طبیعی قوتوں کی آمادگی، ترقی اور رشد کے لئے ایک نسخہ ہے ''شریعت، فطری ہے'' اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان اور اس کے واقعی اور فطری ضرورتوں میں ایک طرح کی مناسبت وہماہنگی ہے، ایسا نہیں ہے کہ فطرت انسان میں دینی معارف واحکام بالفعل یا بالقوۃ پوشیدہ ہیں۔

انسان کی فطرت کا اچھا یا برا ہونا

گذشتہ مباحث سے یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ ''سارٹر'' جیسے وجود پرست ''واٹسن'' (۱) جیسے کردار و فعالیت کے حامی ''ڈورکھیم'' جیسے ''معاشرہ پرست'' اور ''جان لاک'' (۲) کی طرح بعض تجربی فلاسفہ کے اعتبار سے انسان کو بالکل معمولی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جو صرف غیر ذاتی عناصر و اسباب سے تشکیل ہوا ہے بلکہ انسان فکری اعتبار سے اور فطری عناصر میں طاقت و توانائی کے لحاظ سے حیوان سے فراتر مخلوق ہے۔ چاہے بعض عناصر بالفعل یا بالقوت ہوں یا ان کے بالفعل ہونے میں بیرونی اسباب اور عوامل کے کارفرما ہونے کی ضرورت ہو۔ جو لوگ انسان کو معمولی سمجھتے ہیں انہوں نے اصل مسئلہ کو ختم کر دیا اور خود کو اس کے حل سے محفوظ کر لیا، بہر حال تجربی اور عقلی دلائل، تعلیمات وحی اور ضمیر کی معلومات اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ انسان بعض مشترکہ فطری عناصر سے استوار ہے۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کی مشترکہ فطرت و طبیعت فقط نیک اور خیر خواہ ہے یا فقط پست و ذلیل ہے یا خیر و نیکی اور پستی و ذلت دونوں عناصر پائے جاتے ہیں؟

''فرایڈ'' کے ماننے والوں کی طرح بعض مفکرین ''تھامس ہابز'' (۳) کی طرح بعض تجربی فلاسفہ اور فطرت پرست، لذت پسند سود خور افراد انسان کی فطرت کو پست اور ذلیل سمجھتے ہیں ''اریک فروم'' جیسے فرایڈ کے جدید ماننے والے ''کارل روجرز'' (۴) اور ''ابراہیم مزلو'' (۵) کی طرح انسان پرست اور ''ژان ژاک روسو'' (۶) کی طرح رومینٹک افراد، انسان کی فطرت کو نیک اور خیر خواہ اور اس کی برائیوں کو نادرست ارادوں کا حصہ یا انسان پر اجتماعی ماحول کا ردعمل تصور کرتے ہیں۔ (۷)

.....

(1)Watson . (2) John Loke . (3)Thomas Hobbes. (4)Kart Rogers .

(5)Abraham Maslow . (6)Jean Jacques Rousseau.

(۷) اسی فصل کے ضمیمہ میں ان نظریات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ مذکورہ دونوں نظریوں میں افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے۔انسان کی فطرت کوسراسر پست وذلیل سمجھنا اور ''ہابز'' کے بقول انسان کوانسان کے لئے بھیڑیا سمجھنا نیز اکثر انسانوں کی بلند پروازی کی تمنا اور عدالت پسندی کی طرح اعلی معارف کی آرزو، کمال طلبی اور الٰہی فطرت سے سازگار نہیں ہے، اور انسان کی تمام برائیوں کو افراد کے غلط ارادوں اور اجتماعی ماحول کی طرف نسبت دینا اور گذشتہ اسباب یا ہر علت کے کردار کا انکار کرنا بھی ایک اعتبار سے تفریط وکوتاہی ہے، یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ وجودشناسی کے گوشوں اور مسئلہ شناخت کی اہمیت کے درمیان تداخل نہیں ہونا چاہیئے، وجودشناسی کی نگاہ سے انسان کی مشترکہ فطرت کے عناصر کا مجموعہ چونکہ امکانات سے مالا مال اور بھرپور ہے لہٰذا کمال شمار ہوتا ہے اور منفی تصور نہیں کیا جاتا، لیکن اہمیت شناسی کے اعتبار سے یہ مسئلہ مہم ہے کہ ان امکانات سے کس چیز میں استفادہ ہوتا ہے؟ بدبین فلاسفہ اور مفکرین منفی پہلو کے مشاہدہ کی وجہ سے ان توانائی، تفکر اور خواہشات کو ناپسندیدہ موارد میں استعمال کر کے انسان کو ایک پست اور بری مخلوق سمجھتے ہیں اور خوش بین فلاسفہ اور مفکرین اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے انسان کی فلاح و بہبود کی راہ میں مشترکہ فطری عناصر کے پہلوؤں سے بہرہ مند ہو کر دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جب کہ یہ شواہد انسان کی فطرت کے اچھے یا برے ہونے پر حتمی طور پر دلیل نہیں ہیں بلکہ ہر دلیل دوسرے کی نفی کرتی ہے۔

قرآن مجید انسان کی فطرت کو ایک طرف تفکر، خواہش اور توانائی کا مجموعہ بتاتا ہے، جس میں سے اکثر کے لئے کوئی خاص ہدف نہیں ہے اگرچہ ان میں سے بعض مثال کے طور پر خداوند عالم کی تلاش، معرفت اور عبادت کے فطری ہونے کی طرف متوجہ ہیں۔اور دوسری طرف خلقت سے پہلے اور بعد کے حالات نیز اجتماعی وفطری ماحول سے چشم پوشی نہیں کرتا ہے بلکہ منجملہ ان کی تاثیر کے بارے میں آگاہ کرتا ہے اور آگاہ انسان کے ہر ارادہ وانتخاب میں، اثر انداز عنصر کو تسلیم کرتا ہے۔

اس لئے انسان کی مشترکہ فطرت کو ایسے عناصر کا مجموعہ تشکیل دیتے ہیں جن میں سے بعض

فلاح وخیر کی طرف متوجہ ہیں ،لیکن غلط تاثیر یا مشترکہ طبیعت سے انسان کی غفلت اور انسان کے افعال میں تمام موثر عوامل کی وجہ سے یہ حصہ بھی اپنے ضروری ثمرات کھودیتا ہے اور پیغمبران الٰہی کا بھیجا جانا، آسمانی کتابوں کا نزول، خداوند عالم کے قوانین کا لازم الاجراء ہونا اور دینی حکومت کی برقراری، یہ تمام چیزیں، انسان کو فعال رکھنے اور مشترکہ فطری عناصر کے مجموعہ سے آراستہ پروگرام سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں ہے، چاہے ہدف رکھتی ہوں یا نہ رکھتی ہوں، یا دوسرے اسباب کی وجہ سے ہوں۔ اور انسان کی برائی غلط اثر اور غفلت کا نتیجہ ہے اور انسان کی اچھائی اور نیکی، دینی اور اخلاقی تعلیمات کی روشنی میں دیدہ و دانستہ کردار کا نتیجہ ہے، آئندہ مباحث میں ہم اس آخری نکتہ کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے۔

سورۂ روم کی تیسویں آیت کے مفہوم کے سلسلہ میں زرارہ کے سوال کے جواب میں امام جعفرصادقؑ نے فرمایا: ''فَطرهُم جَمِیعاً عَلیٰ التَّوحیدِ ''(۱) خداوند عالم نے سب کو فطرت توحید پر پیدا کیا ہے۔

توحیدی اور الٰہی فطرت کی وجہ سے انسان یہ گمان نہ کرے کہ فطری امور اس کے توحیدی اور الٰہی پہلو میں منحصر ہیں جیسا کہ انسان کی فطرت کے بارے میں گذشتہ مباحث میں اشارہ ہو چکا ہے کہ بہت سی فطری اور حقیقی معارف کو خواہشات کے سپرد کردیا گیا ہے جو تمام مخلوقات سے انسان کے وجود کی کیفیت کو جدا اور مشخص کرتی ہے۔ انسان کے تمام فطری امور کے درمیان اور اس کے الٰہی فطرت کے بارے میں مزید بحث، اس عنصر کی خاص اہمیت اور الٰہی فطرت کے بارے میں مختلف سوالات کی وجہ سے ہے۔ ان دونوں چیزوں کی وجہ سے یہ فطری شیٔ مزید مورد توجہ واقع ہوئی ہے۔

انسانوں کے اندر الٰہی فطرت کے پائے جانے کا دعویٰ مختلف بحثوں کو جنم دیتا ہے۔ پہلا

.....

(۱) کلینی؛ گذشتہ حوالہ ج ۲، ص ۱۲۔

سوال یہ ہے کہ انسان کے اندر الٰہی فطرت کے ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا فطرتِ معرفت مراد ہے یا فطرتِ انتخاب؟ اگر فطرتِ معرفت مراد ہے تو خداوند عالم کے بارے میں اکتسابی معرفت فطری ہے یا اس کی حضوری معرفت؟ دوسرا سوال، فطرت الٰہی کے فعال (بالفعل) اور غیر فعال (بالقوۃ) ہونے کے بارے میں ہے کہ کیا یہ انتخاب یا فطری معرفت تمام انسانوں کے اندر خلقت کے وقت سے بالفعل موجود ہے یا بالقوۃ؟ اور آخری سوال یہ ہے کہ کیا یہ فطری شئ زوال پذیر ہے اور اگر زوال پذیر ہے تو کیا انسان اس کے زائل ہونے کے بعد بھی باقی رہے گا؟ آخری دو سوال، انسان کی الٰہی فطرت سے مربوط نہیں ہیں بلکہ انہیں ہر فطری شئ کے بارے میں بیان کیا جا سکتا ہے؟

انسان کی الٰہی فطرت سے مراد

توحید کے فطری ہونے کے سلسلہ میں تین احتمال موجود ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ اکتسابی اور مفہومی معرفت کی صورت میں خداوند عالم کے وجود کی تصدیق کرنا انسان کی فطرت ہے۔ فطری ہونے سے مراد؛ فطرت عقل اور انسان کی قوت مدرکہ کا ایک دوسرے سے مربوط ہونا ہے۔

دوسرا احتمال؛ خداوند عالم کے سلسلہ میں انسان کی شہودی اور حضوری علم کے بارے میں ہے اس احتمال کے مطابق تمام انسانوں کے اندر خداوند عالم کی طرف سے مستقیم اور حضوری معرفت کے مختلف درجات موجود ہیں۔

تیسرا احتمال؛ انسان کی الٰہی فطرت کو اس کی ذاتی خواہش اور درونی ارادہ فرض کرتا ہے اس احتمال کی روشنی میں انسان اپنی مخصوص روحی بناوٹ کی بنیاد پر خدا سے متمنی اور طلب گار ہے۔

پہلے احتمال کی وضاحت میں مرحوم شہید مطہری فرماتے ہیں:

بعض خدا شناسی کے فطری ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مراد فطرت عقل ہے، کہتے ہیں کہ انسان، فطری عقل کی روشنی میں مقدماتی استدلال کے حاصل کرنے کی

ضرورت کے بغیر خداوند عالم کا وجود سمجھ لیتا ہے، نظام عالم اور موجودات کی تربیت اور تادیب پر توجہ کرتے ہوئے خود بخود بغیر کسی استدلال کی ضرورت کے انسان کے اندر ایک مدبر اور غالب کے وجود کا یقین پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ تمام فطری امور کہ جس کو منطق کی اصلاح میں ''فطریات'' کہا جاتا ہے ایسا ہی ہے۔(۱)

حق یہ ہے کہ ''خدا موجود ہے'' کے قضیہ کو منطقی فطریات میں سے نہیں سمجھنا چاہیئے یعنی ''چار کا عدد، زوج ہے'' اس طرح کے قضایا بدیہی ہیں اور ان چیزوں کا استدلال ذہن میں ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ جس میں ذہنی تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ فکر و نظر کی پوری تاریخ میں واضح طور پر خدا کے وجود پر حکماء، فلاسفہ نیز دوسرے مفکرین کے دلائل و استدلال کے ہم شاہد ہیں اور عقلی و نظری طریقہ سے یہ عظیم علمی تلاش، خداوند عالم کے عقیدہ کے بدیہی نہ ہونے کی علامت ہے، اسی بنا پر بعض دانشمندوں نے کہا ہے کہ خداوند عالم پر اعتقاد بدیہی نہیں ہے بلکہ بداہت سے قریب ہے۔(۲)

دوسرا احتمال؛ خداوند عالم کے بارے میں انسان کے علم حضوری کو بشر کی فطرت کا تقاضا سمجھنا چاہیئے۔ انسان کا دل اپنے خالق سے گہرا رابطہ رکھتا ہے اور جب انسان اپنے حقیقی وجود کی طرف متوجہ ہوگا تو اس رابطہ کو محسوس کرے گا، اس علم حضوری اور شہود کی صلاحیت تمام انسانوں میں موجود ہے۔ لہٰذا اکثر لوگ خاص طور سے سادی زندگی کے ان لمحات میں جب وہ دنیاوی کاموں میں مصروف ہیں اس قلبی اور اندرونی رابطہ کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔

سورہ نحل کی ۵۳ ویں آیہ اور سورۂ عنکبوت کی ۶۵ ویں آیہ کی طرح بعض دوسری آیتوں میں اضطراری مواقع اور اس وقت جب لوگ تمام اسباب سے قطع امید ہو جاتے ہیں اس فطرت کی

.....

(۱) مطہری؛ مرتضی، مجموعہ آثار، ج۶ ص۹۳۴۔

(۲) ملاحظہ ہو: مصباح یزدی، محمد تقی، آموزش فلسفہ ج۲ ص۳۳۰ و ۳۳۱۔

بیداری کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّيٰهُم إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُم يُشْرِكُونَ﴾(۱)

پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو نہایت خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں اور جب ہم انہیں نجات دے کر خشکی میں پہونچا دیتے ہیں تو وہ مشرک ہو جاتے ہیں۔

﴿وَ مَا بِكُم مِن نِّعمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُ فَإِلَيهِ تَجئَرُونَ﴾(۲)

اور جتنی نعمتیں تمہارے ساتھ ہیں سب اس کی طرف سے ہیں پھر جب تم کو تکلیف پہونچتی ہے تو تم اسی کے آگے فریاد کرتے ہو۔

اس احتمال کے مطابق خدا کی معرفت، فطرت، خداپرستی اور خدا سے رابطہ، شہودی اور حضوری معرفت کی فرع ہے، مشکل وقت میں معمولی لوگ بھی جب ان میں یہ شہودی رابطہ ایجاد ہوتا ہے تو خدا کی عبادت، مناجات اور استغاثہ کرنے لگتے ہیں، اس لئے انسان کی الٰہی فطرت، فطرت کی معرفت ہے، احساس وخواہش کا نام فطرت نہیں ہے۔

تیسرا احتمال سورۂ روم کی ۳۰ ویں آیہ کہ جس میں فطرت کو احساس وخواہش (فطرت دل) کہا گیا ہے۔ اور معتقد ہے کہ خدا کی جستجو وتلاش اور خداپرستی انسان کی فطرت ہے اور خدا کی طرف توجہ تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے چاہے اس کے وجود کی معرفت اور تصدیق خود فطری نہ ہو۔

انسان کے اندر سوال کرنے کی خواہش کے عنوان سے ایک بہترین خواہش موجود ہے جس کی بنیاد پر انسان اپنے آپ کو ایک حقیقت سے وابستہ اور ملا ہوا جانتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس حقیقت کے ذریعہ خدا سے نزدیک ہو کر اس کی تسبیح وتحلیل کرے۔

---

(۱) عنکبوت ۶۵۔

(۲) نحل ۵۳

اگر چہ دوسرے اور تیسرے دونوں احتمالات ظاہر آیہ سے مطابقت رکھتے ہیں اوران میں سے کسی ایک کودوسرے پرترجیح دنیا مشکل لگتا ہے لیکن ان روایات کی مدد سے جواس آیہ کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں اوران میں سے بعض نقل بھی ہوئی ہیں دوسرا احتمال قطعاً موردنظر ہے، البتہ دونوں احتمالات کے درمیان اس طرح جمع اوردونوں کوملا کرایک دوسرے کامکمل بنایا جاسکتا ہے کہ اگر فطری طور پرانسان کے اندر کسی موجود کی عبادت، خواہش اور عشق کا جذبہ پایا جائے تو یہ معقول نہیں ہے کہ عبادت مبہم ونامعلوم ہولہٰذا قہری طور پر خدا کی معرفت وشناخت کا پایا جانا انسان کی فطرت میں ہونا چاہیئے تاکہ یہ تمایل اور خواہش مبہم اور نامعلوم نہ ہو، پس جب بھی فطری طور پر اپنے اندر عبادت اور خضوع وخشوع کا ہم احساس کرتے ہیں تو یہ اسی کے لئے ہوگا جس کے بارے میں ہم اجمالی طور پر معرفت رکھتے ہوں، اور یہ معرفت حضوری اور شہودی ہے، دوسری طرف اگر انسان کے اندر خداوند متعال کے سلسلہ میں حضوری معرفت موجود ہوتو منعم کا شکریہ اور طلب کمال کی طرف ذاتی تمایل کی وجہ سے خداوند عالم کی جانب انسان کے اندر غیر قابل توصیف رغبت پیدا ہوجائے گی۔

فطرت کا زوال ناپذیر ہونا

سورۂ روم کی ۳۰ویں آیت کے آخر میں آیا ہے کہ ﴿لا تَبدِیلَ لِخَلقِ اللّٰہِ﴾ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے یعنی ہم نے اس فطرت الٰہی کوانسان کے حوالہ کیا جو غیر قابل تغییر ہے یہ ممکن ہے کہ انسان فطرت الٰہی سے غافل ہوجائے لیکن فطرت الٰہی نابود نہیں ہوگی، انسان جس قدر اس فطرت الٰہی کوآمادہ کرنے کی کوشش کرے اوراپنی غیر حیوانی پہلوؤں کوقوت بخشے اتنا ہی بہتر انسان ہوگا انسان اپنی ابتدائی خلقت میں بالفعل حیوان ہے اور بالقوت انسان ہے، اس لئے کہ حیوانیت اور خواہشات کی توانائی اس کے اندر سب سے پہلے رونما ہوتی ہیں اور زندگی کے نشیب وفراز میں جس قدر غیر حیوانی پہلوؤں کوتقویت دے گا اوراپنے وجود میں جس قدر فطرت الٰہی کوحاکم کرنے میں کامیاب ہوگا اتنا ہی زیادہ انسانیت سے بہرہ مند ہوگا، بہرحال یہ بات قابل توجہ ہے کہ انسان میں

فطری قابلیت اور اللہ کی طرف توجہ کا مادہ ہے چاہے پوشیدہ اور مخفی ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ فطری قابلیت ختم نہیں ہوتی ہے اور انسان کی سعادت اور بدبختی اسی فطری حقیقت کو جلا بخشنے یا مخفی کرنے میں ہے:

﴿قَد أَفلَحَ مَن زَكّيٰهَا وَ قَد خَابَ مَن دَسّيٰهَا﴾(۱)

یقیناً جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا وہ تو کامیاب ہوا اور جس نے اس کو آلودہ کیا وہ نقصان اٹھانے والوں میں رہا۔

فطرت اور حقیقت

اس واقعیت سے انکار نہیں ہے کہ لوگ ایک جیسی خصوصیات لے کر اس دنیا میں نہیں آئے ہیں یہ تبدیلیاں چاہے بدن کے سلسلہ میں ہو چاہے عقل وخرد کی توانائی میں ہو، ظاہر ہو جاتی ہیں، اسی طرح حیات انسان کا فطری ماحول اور اجتماعی شرائط اور بیرونی تاثرات کی وجہ سے جوابات اور عکس العمل بھی برابر نہیں ہوتا مثال کے طور پر بعض لوگ ایمان کی طرف راغب اور حق کی دعوت کے مقابلہ میں اپنی طرف سے بہت زیادہ آمادگی اور خواہش ظاہر کرتے ہیں، اور بعض حضرات پروردگار عالم کے حق اور بندگی سے یوں فرار کرتے ہیں کہ وحی الٰہی کو سننے، آیات اور معجزات الٰہی کے مشاہدہ کرنے کے باوجود نہ فقط ایمان نہیں لاتے ہیں بلکہ ان کی اسلام دشمنی اور کفر دوستی میں شدت آجاتی ہے۔

﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ القُرآنِ مَا هُوَ شَفَاءٌ وَرَحمَةٌ لِلمُؤمِنِينَ وَ لا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إلا خَسَاراً﴾(۲)

''اور ہم تو قرآن میں سے وہی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے اور ظالمین کے لئے سوائے گھاٹے کے کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا''۔

.....

(۱) سورۂ شمس ۹ تا ۱۰۔

(۲) اسراء/۸۲۔

اب یہ سوال درپیش ہے کہ یہ فرق واختلاف کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ آیا اس کا حقیقی سبب انسان کی فطرت وطبیعت ہے اور ماحول واجتماعی اسباب کا کوئی اہم رول نہیں ہے یا یہ کہ خود ماحول اس سلسلہ میں انسان کی سرنوشت معین کرتا ہے ورنہ انسان کی مشترکہ فطرت کا کوئی خاص کردار نہیں ہے یا یہ اختلافات، فطری عناصر اور ماحول کی دین ہیں۔ اس سوال کے جواب میں کہنا چاہیئے کہ: ہر فرد کی شخصیت میں اس کی فردی خصوصیت بھی شامل ہوتی ہے، اور متعدد فطری واجتماعی اسباب کا بھی وہ معلول ہے، وراثت، فطری اختلافات، اسباب تربیت، اجتماعی ماحول اور دوسرے شرائط، کامیابیاں اور ناکامیاں، ملکی اور جغرافیائی حدود خصوصاً فردی تجربہ، انتخاب اور قدرت اختیار میں سے ہر ایک کا انسان کی شخصیت سازی میں ایک خاص کردار ہے۔ انسان کا اخلاق اور الٰہی فطرت کی حقیقت اور تمام انسانوں کے فطری اور ذاتی حالات بھی تمام مذکورہ عوامل کے ہمراہ مشترکہ عامل کے عنوان سے انسان کی کردار سازی میں موثر ہیں، فردی اختلافات کا ہونا مشترکہ فطرت کے انکار اور بے اثر ہونے کے معنی میں نہیں ہے ﴿قُل كُلٌّ يَعمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ﴾ (۱)

تم کہدو کہ ہر ایک اپنی شخصیت سازی کے اصول پر عمل پیرا ہے، آیہ شریفہ میں ''شاکلہ'' سے مراد ہر انسان کی شخصی حقیقت اور معنویت، فطرت الٰہی کے ہمراہ مذکورہ عوامل کے مجموعہ سے حاصل ہونا ہے، قابل غور نکتہ یہ ہے کہ فطری امور تمام افراد میں ایک ہی انداز میں رشد وتکامل نہیں پاتے اسی بنا پر تمام عوامل کے مقابلہ میں فطری سبب کے لئے ایک ثابت، مساوی اور معین مقدار قرار نہیں دی جاسکتی ہے انسانوں کا وہ گروہ جن میں اخلاق اور الٰہی فطرت پوری طرح سے بارآور ہوچکی ہے اور بہترین اخلاقی زندگی اور کامل بندگی سے سرفراز ہے اس کی حقیقت اور شخصیت کو ترتیب دینے میں اسباب فطرت کا نمایاں کردار ہے اور جن لوگوں نے مختلف اسباب کی وجہ سے

.....

(۱) سورۂ اسراء/۸۴۔

اپنے حیوانی پہلوؤں کو قدرت بخشی ہے ان افراد کا شعلۂ فطرت خاموش ہو چکا ہے اور اثر انداز ہونے میں بہت ہی ضعیف ہے۔(۱)

.....

(۱) قرآن کی نظر میں مذکورہ اسباب کے کردار کی تاکید کے علاوہ نفسانی شہوتوں میں اسیر ہونا اور مادی دنیا کی زندگی اور شیطان کے پھندے میں مشغول رہنے کو انسان کے انحراف میں موثر اسباب کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے اور پیغمبروں، فرشتوں اور خداوند عالم کی خصوصی امداد کو انسان کی راہ سعادت میں مدد کرنے والے تین اسباب وعوامل کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ ضمیمہ میں ان سب کے بارے میں مختصر وضاحت انشاءاللہ آئے گی۔

خلاصہ فصل

۱.ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ظاہری شکل وصورت اور اخلاق وکردار میں متعدد اور گونا گوں اختلاف کے باوجود جسم وروح کے اعتبار سے آپس میں بہت زیادہ مشترک پہلو پائے جاتے ہیں۔

۲.انسان کی فطرت کے بارے میں گفتگو، انسان شناسی کے مہم ترین مباحث میں سے ایک ہے جس نے موجودہ چند صدیوں میں بہت سے مفکرین کے ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کررکھا ہے۔

۳.انسانی فطرت، مشترکہ فطرت کے عناصر کی طرف اشارہ کرتی ہے جو آغاز خلقت سے ہی تمام انسانوں کو عطا کی گئی ہے جب کہ ماحول اور اجتماعی عوامل نہ ہی فراہم اور نہ ہی اس کو نابود کرسکتے ہیں اور ان کی خلقت میں تعلیم وتربیت کا کوئی کردار نہیں ہے۔

۴.انسان کی مشترکہ فطرت کے وجود پر منجملہ دلیلوں میں فہم ومعرفت ہے نیز غیر حیوانی ارادے اور خواہشات کا انسانوں میں پایا جانا اور ذاتی توانائی کا انسان سے مخصوص ہونا ہے۔

۵.انسان کے وجود میں خداوند عالم کی معرفت کے لئے بہترین خواہش، سوالات کی خواہش کے عنوان سے موجود ہے جس کی بنیاد پر انسان اپنے آپ کو ایک حقیقت سے وابستہ اور ملا ہوا سمجھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس حقیقت سے نزدیک ہوکر تسبیح وتحلیل بجالائے اور یہ حقیقت وہی فطرت الٰہی ہے۔

۶.آیات وروایات بہت ہی واضح یا ضمنی طور پر معرفت، انسانی خواہش اور توانائی سے مخصوص حقیقت، مشترکہ فطرت نیز عناصر اور ان کی خصوصیات پر دلالت کرتی ہیں۔لیکن جو چیز سب سے زیادہ مورد تائید اور تاکید قرار پائی ہے وہ فطرت الٰہی ہے۔

۷.ہر انسان کی شخصیت سازی میں اس کا ماحول نیز رفتار وکردار، موروثی اور جغرافیائی عوامل کے علاوہ فطرت کا بھی بنیادی کردار ہے۔

تمرین

۱.فطری اور طبیعی امور سے غیر فطری امور کی شناخت کے معیار کیا ہیں؟

۲.انسان کی شخصیت سنوارنے والے عناصر کا نام ذکر کریں؟

۳.انسان کا ارادہ، علم، خواہش اور قدرت کس مقولہ سے مربوط ہے؟

۴.سورۂ روم کی ۳۰ویں آیت کا مضمون کیا ہے؟ اس آیت میں ﴿لا تَبدِیل لخَلقِ اللّهِ﴾ سے مراد کیا ہے؟ وضاحت کریں؟

۵.انسان کی مشترکہ فطرت کی معرفت میں علوم تجربی، عقلی اور شہودی میں سے ہر ایک علم کا کردار اور اس کی خامیاں بیان کریں؟

۶.فطرت الٰہی کے تغییر نہ ہونے کی بنیاد پر جو افراد خدا سے غافل ہیں یا خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں یا شک رکھتے ہیں ان افراد میں فطرت الٰہی کس انداز میں پائی جاتی ہے؟

۷.فطرت الٰہی کو قوی اور ضعیف کرنے والے عوامل بیان کریں؟

۸.حقیقی و غیر حقیقی اور جھوٹی ضرورتوں سے مراد کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک کے لئے دو مثالیں ذکر کرتے ہوئے واضح کریں؟

۹.مندرجہ ذیل موارد میں سے انسان کی فطری اور حقیقی ضرورتیں کون سی ہیں؟

عدالت خواہی، حقیقت کی جستجو، آرام پسندی، عبادت کا جذبہ اور راز و نیاز، خود پسندی، دوسروں سے محبت، محتاجوں پر رحم کرنا، بلندی کی تمنا، حیات ابدی کی خواہش، آزادی کی لالچ۔

مزید مطالعہ کے لئے:

۱علوم تجربی کے نظریہ کے مطابق شخصیت ساز عناصر کے لئے ملاحظہ ہو:

.ماہر نفسیات، شخصیت کے بارے میں نظریات، نفسیاتی ترقی، اجتماعی نفسیات شناسی، جامعہ شناسی کے اصول، فلسفہ تعلیم وتربیت.

۲.اسلام کی روشنی میں انسان کی شخصیت؛ کے لئے ملاحظہ ہو:

.مصباح یزدی، محمد تقی (۱۳۶۸) جامعہ وتاریخ از دیدگاہ قرآن، تہران: سازمان تبلیغات اسلامی.

.نجاتی، محمد عثمان (۱۳۷۲) قرآن وروان شناسی، ترجمہ عباس عرب، مشہد، بنیاد پژوہشھای آستان قدس رضوی۔

۳.اسلامی نظریہ سے انسان کی فطرت؛ کے لئے ملاحظہ ہو:

.دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ (۱۳۷۲) درآمدی بہ تعلیم وتربیت اسلامی، فلسفہ تعلیم وتربیت، تہران: سمت.ص ۳۶۹.۵۱۴.

۴.انسان کی فطرت میں دانشمندوں کے نظریات؛ کے لئے ملاحظہ ہو:

.اسٹیونسن، لسلی (۱۳۶۸) ہفت نظریہ درباره طبیعت انسان، تہران، رشد

. پاکارڈ، ڈوینس (۱۳۷۰) آدم سازان؛ ترجمہ حسن افشار؛ تہران: بہبہانی۔

.دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ (۱۳۶۳) درآمدی بر جامعہ شناسی اسلامی: مبانی جامعہ شناسی، قم: سمت۔

.شکرکن، حسین، ودیگران (۱۳۷۲) مکاتب روان شناسی ونقد آن، ج۲، تہران: دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ، سمت۔

۵.انسانی فطرت کے لئے ملاحظہ ہو:

.جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۳) ده مقالہ پیرامون مبدا ومعاد. تہران: الزہراء۔

.....(۱۳۶۳)فطرت وعقل ووحی، یادنامۂ شہید قدوسی، قم: شفق.

.....(۱۳۶۳)تفسیر موضوعی قرآن، ج۵، تہران، رجاء.

بشیروانی، علی (۱۳۷۶) سرشت انسان: پژوہشی درخداشناسی فطری؛ قم: نہادنمایندگی مقام معظم رہبری دردانشگاہ ھا (معاونت امور اساتید ودروس معارف اسلامی).

محمدتقی مصباح؛ معارف قرآن: خداشناسی، قم: جامعہ مدرسین.

مطہری، مرتضی (۱۳۷۰) مجموعہ آثار. ج۳ ''کتاب فطرت''، تہران: صدرا۔

.....(۱۳۷۱) مجموعہ آثار. ج۵، ''مقالہ فطرت''، تہران: صدرا۔

موسوی خمینی، روح اللہ (۱۳۶۸) چہل حدیث، تہران: مرکز نشر فرہنگی رجاء

۶.کلمہ فطرت کے استعمالات اور معانی کے لئے ملاحظہ ہو:

.بیژبی، یحیٰ ''فطری بودن دین از دیدگاہ معرفت شناسی''، مجلّہ حوزہ ودانشگاہ، سال سوم، ش نہم، ص۱۱۰.۱۱۸.

۷.انسان کی فطری توانائی نیز معلومات ونظریات کے لئے ملاحظہ ہو:

.جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۶) تفسیر موضوعی، ج۵، نشر فرہنگی رجاء، تہران۔

.بشیروانی، علی (۱۳۷۶) سرشت انسان پژوہشی درخداشناسی فطری؛ قم: نہادنمایندگی مقام معظم رہبری دردانشگاہھا، معاونت امور اساتید ودروس معارف اسلامی.

محمدتقی مصباح (۱۳۷۷) اخلاق درقرآن؛ قم: موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔

.....(۱۳۷۷) خودشناسی برای خودسازی؛ قم: موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔

.....(۱۳۷۶) معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم: مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔

مطہری، مرتضی (۱۳۶۹) مجموعۂ آثار، ج۲، انسان درقرآن، تہران: صدرا۔

ملحقات

لفظ ''فطرت'' کے اہم استعمالات

لفظ فطرت، کے بہت سے اصطلاحی معنی یا متعدد استعمالات ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل سب سے اہم ہیں:

۱.خواہش اور طبیعت کے مقابلہ میں فطرت کا ہونا: بعض لوگوں نے لفظ فطرت کو اس غریزہ اور طبیعت کے مقابلہ میں جو حیوانات، جمادات اور نباتات کی طینت کو بیان کرتے ہیں، انسان کی سرشت کے لئے استعمال کیا ہے۔

۲.فطرت، غریزہ کا مترادف ہے: اس استعمال میں فطری امور سے مراد طبیعی امور ہیں البتہ اس استعمال میں کن مواقع پر غریزی امور کہا جاتا ہے، اختلاف نظر ہے، جس میں سے ایک یہ ہے کہ جو کام انسان انجام دیتا ہو لیکن اس کے نتائج سے آگاہ نہ ہو اور نتیجہ بھی مہم ہو مثال کے طور پر بعض وہ افعال جو بچہ اپنے ابتدائی سال میں آگاہانہ انجام دیتا ہے اسے غریزی امور کہا جاتا ہے۔

۳.فطرت یعنی بدیہی: اس اصطلاح میں ہر وہ قضیہ جو استدلال کا محتاج نہ ہو جیسے معلول کے لئے علت کی ضرورت اور اجتماع نقیضین کا محال ہونا فطرت کہا جاتا ہے۔

۴.فطرت، منطقی یقینیات کی ایک قسم ہے: استدلال کے محتاج وہ قضایا جن کا استدلال پوشیدہ طور پر ان کے ہمراہ ہو (قضایا قیاساتها معها) ''فطری'' کہا جاتا ہے جیسے چار زوج ہے، جس کا استدلال (چونکہ دو متساوی حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے) اس کے ہمراہ ہے۔

۵.کبھی لفظ فطرت، بدیہی سے نزدیک قضایا پر اطلاق ہوتا ہے: جیسے ''خدا موجود ہے'' یہ قضیہ استدلال کا محتاج ہے اور اس کا استدلال اس کے ہمراہ بھی نہیں ہے لیکن اس کا استدلال ایسے مقدمات کا

محتاج ہے جو بدیہی ہیں (طریقہ علیت) چونکہ یہ قضیہ بدیہیات کی طرف منتہی ہونے کا ایک واسطہ ہے لہٰذا بدیہی سے نزدیک ہے، ملاصدرا کے نظریہ کے مطابق خدا کی معرفت کے فطری ہونے کو بھی (بالقوۃ خدا کی معرفت) اسی مقولہ یا اس سے نزدیک سمجھا جاسکتا ہے۔

۶.فطرت، عقل کے معنی کے مترادف ہے: اس اصطلاح کا ابن سینا نے استفادہ کیا ہے اور کہا ہے کہ فطرت وہم خطاپذیر ہے لیکن فطرت عقل خطاپذیر نہیں ہے۔

۷.فطرت کا حساسیت اور وہم کے مرحلہ میں ذہنی صورتوں کے معانی میں ہونا: ''ایمانول کانٹ''(۱) معتقد تھا کہ یہ صورتیں خارج میں کسی علت کی بنا پر نہیں ہیں بلکہ ذہن کے فطری امور میں سے ہے اور اس کو فطری قالب میں تصور کیا جاتا ہے جیسے مکان، زمان، کمیت، کیفیت، نسبت اور جہت کو معلوم کرنے والے ذہنی قضایا میں کسی معلوم مادہ کو خارج سے دریافت کرتے ہوئے ان صورتوں میں ڈھالتا ہے تاکہ قابل فہم ہوسکیں۔

۸.فطرت، عقل کے خصوصیات میں سے ہے: جس کی تخلیق میں حس اور تجربہ کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے بلکہ عقل بالفعل اس پر نظارت رکھتی ہے ''ڈکارٹ'' کے نظریہ کے اعتبار سے خدا، نفس اور مادہ (ایسا موجود جس میں طول، عرض، عمق ہو) فطری شمار ہوتا ہے، اور لفظ فطری بھی اسی معنی میں ہے۔

۹.فطرت یعنی خدا کے بارے میں انسان کا علم حضوری رکھنا، خداشناسی کے فطری ہونے میں یہ معنی فطرت والی آیات وروایات کے مفہوم سے بہت سازگار ہے۔

۱۰.فطرت یعنی ایک حقیقت کو پورے اذہان سے درک کرنا، اصل ادراک اور کیفیت کی جہت سے تمام افراد اس سلسلہ میں مساوی ہیں جیسے مادی دنیا کے وجود کا علم۔

.....

(1)Imanuel Kant.

۲. ہدایت کے اسباب اور موانع

قرآن مجید نے انسان کے تنزل کے عام اسباب اور برائی کی طرف رغبت کو تین چیزوں میں خلاصہ کیا ہے:

۱. ہوائے نفس: ہوائے نفس سے مراد باطنی ارادوں کی پیروی اور محاسبہ کرنے والی عقلی قوت سے استفادہ کئے بغیر ان کو پورا کرنا اور توجہ کرنا اور انسان کی سعادت یا بدبختی میں خواہشات کو پورا کرنے کا کردار اور اس کے نتائج کی تحقیق کرنا ہے۔ اس طرح خواہشات کو پورا کرنا، حیوانیت کو راضی کرنا اور خواہشات کے وقت حیوانیت کو انتخاب کرنے کے معنی میں ہے۔

۲. دنیا: دنیاوی زندگی میں انسان کی اکڑ اور غلط فکر اس کے انحراف میں سے ایک ہے دنیاوی زندگی کے بارے میں سوچنے میں غلطی کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس کو آخری و نہائی ہدف سمجھ بیٹھیں اور دائمی سعادت اور آخرت کی زندگی سے غفلت کریں، یہ غلطی بہت سی غلطیوں اور برائیوں کا سرچشمہ ہے، انبیاء کے اہداف میں سے ایک ہدف دنیا کے بارے میں انسانوں کی فکروں کو صحیح کرنا تھا اور دنیاوی زندگی کی جو ملامت ہوئی ہے وہ انسانوں کی اسی فکر کی بنا پر ہے۔

۳. شیطان: قرآن کے اعتبار سے شیاطین (ابلیس اور اس کے مددگار) ایک حقیقی مخلوق ہیں جو انسان کو گمراہ کرنے اور برائی کی طرف کھینچنے کا عمل انجام دیتے ہیں۔ شیطان برے اور پست کاموں کو مزین اور جھوٹے وعدوں اور دھوکہ بازی کے ذریعہ اچھے کاموں کے انجام دینے کی صورت میں یا ناپسندیدہ کاموں کے انجام نہ دینے کی وجہ سے انسان کو اس کے مستقبل سے ڈراتے ہوئے غلط راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ شیطان مذکورہ نقشہ کو ہوائے نفس کے ذریعہ انجام دیتا ہے اور خواہش نفس کی تائید کرتا ہے نیز اس کی مدد کرتا ہے۔

قرآن کی روشنی میں پیغمبروں، فرشتوں کے کردار اور خدائی امداد سے انسان نیک کاموں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس راہ میں وہ سرعت کی باتیں کرتا ہے۔

انبیاء انسان کو حیوانی غفلت سے نجات دے کر مرحلہ انسانیت میں وارد کرتے ہیں اور دنیا کے سلسلہ میں اپنی نصیحتوں کے ذریعہ صحیح نظریہ کو پیش کر کے انسان کی حقیقی سعادت اور اس تک پہونچنے کی راہ کو انسان کے اختیار میں قرار دیتے ہیں۔

اور خوف وامید کے ذریعہ صحیح راستہ اور نیکیوں کی طرف حرکت کے انگیزہ کو انسان کے اندر ایجاد کرتے ہیں بلکہ صحیح راہ کی طرف بڑھنے اور برائیوں سے بچنے کے لئے تمام ضروری اسباب اس کے اختیار میں قرار دیتے ہیں۔

جو افراد ان شرائط میں اپنی آزادی اور اختیار سے صحیح استفادہ کرتے ہیں ان کے لئے مخصوص شرائط میں بالخصوص مشکلات میں فرشتے مدد کے لئے آتے ہیں اور ان کو صحیح راہ پر لگا دیتے ہیں۔ سعادت کی طرف قدم بڑھانے، اہداف کو پانے اور مشکلات کو حل اور موانع کو دور کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

خدا کی عام اور مطلق امداد کے علاوہ اس کی خصوصی امداد بھی ان فریب زدہ انسانوں کے شامل حال ہوتی ہے اور اسی خصوصی امداد کے ذریعہ شیطان کی تمام قوتوں پر غلبہ پا کر قرب الٰہی کی طرف راہ کمال کو طے کرنے میں مزید سرعت پیدا ہو جاتی ہے وہ سو سال کی راہ کو ایک ہی شب میں طے کر لیتے ہیں، یہ امداد پروپگنڈوں کے ختم کرنے کا سبب بھی ہوتی ہے جو اپنی اور دوسروں کی سعادت میں صالح انسانوں کے بلند اہداف کی راہ میں دشمنوں اور ظالم قوتوں اور شیطانی وسوسوں کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں۔(۱)

مغربی انسان شناسوں کی نگاہ میں انسان کی فطرت

''ناٹالی ٹربوویک'' دور حاضر کا امریکی نفس شناس نے انسان کے بارے میں چند اہم سوالوں اور

.....

(۱) اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: علامہ محمد حسین طباطبائی کی المیزان فی تفسیر القرآن، محمد تقی مصباح کی اخلاق در قرآن؛ ج۱ ص۱۹۳_۲۳۶۔

ان کے جوابات کو فلسفی اور تجربی انسان شناسوں کی نگاہ سے ترتیب دیا ہے جس کو پروفیسر ''ونس پاکرڈ'' نے ''عناصر انسان'' نامی کتاب میں پیش کیا ہے، ہم ان سوالات میں سے دو مہم سوالوں کو جو انسان کی فطرت سے مربوط ہیں یہاں نقل کررہے ہیں۔(۱)

پہلا سوال یہ ہے کہ انسان کی فطرت کیا ذاتاً اچھی ہے یا بری ہے یا نہ ہی اچھی ہے اور نہ ہی بری؟

منفی نظریات

فرایڈ کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ: انسان ایک منفی اور مخالف سرشت کا مالک ہے اور وہ ایسے غرائز سے برانگیختہ ہوتا ہے جس کی جڑیں زیست شناسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاص طور سے جنسی خواہشات (۲) اور پرخاش گری کو (۳) فقط اجتماعی معاملات سے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔

نظریہ تجربہ گرا کے حامی (۴): (ہابز) کے لحاظ سے انسان فقط اپنی منفعت کی راہ میں حرکت کرتا ہے۔

نظریہ سودخوری (۵): (بنٹام ہیل) کے مطابق انسان کے تمام اعمال اس کی تلاش منفعت کا نتیجہ ہیں۔

نظریہ لذت گرا کے نمائندے کہتے ہیں کہ (۶): انسان لذت کے ذریعہ اپنی ضرورت حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے اور رنج سے دوچار ہونے سے فرار کرتا ہے۔

.....

(1)Vance Pakard, The People Shapers, PP.361, Biston, Toronto, 1977

اس کتاب کو جناب حسن افشار نے ''آدم سازان'' کے عنوان سے ترجمہ اور انتشارات بہبہانی نے ۱۳۷۰ میں منتشر کیا ہے اور ہم نے جناب حسن افشار کے ترجمہ کو تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(2)sex. (3) aggression.

(5)utillitarians. (4) empiricists.

(6)hedonists.

نظریہ افعال گرایان کے حامی (۱): (لورنز (۲)) کا کہنا ہے انسان ذاتی طور پر برا ہے یعنی اپنے ہی ہم شکلوں کے خلاف ناراضگی کی وجہ سے دنیا میں آیا ہے۔

آرتھونلک کا ماہر نفسیات (۳): (نیو بلڈ (۴)): انسان کی ناراضگی کے سلسلہ میں اس گروہ کا نظریہ بھی عقیدہ افعال گرایان کے مشابہ ہے۔

دوسرا سوال اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کا حیوانات سے جدا ہونا ماہیت کے اعتبار سے ہے یا مرتبہ حیوانیت کے اعتبار سے ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف نظریات بیان کئے گئے ہیں جن میں سے بعض نظریات کو ''ناٹالی ٹربو ویک'' نے سوال وجواب کی صورت میں یوں پیش کیا ہے:

انسان وحیوان ایک مخصوص طرز عمل کی پیروی کرتے ہیں یا انسان میں ایسے نظری ارادے ہیں جو حیوانی ضرورتوں سے بہت بالا ہیں؟

صلح پسندی کے مدعی (ہیوم، ہارٹلی) کا کہنا ہے: انسان کے طریقہ عمل میں دوسرے تمام حیوانات کے طریقہ عمل کی طرح کچھ ضدی چیزیں ہیں جو خود بخود حساس ہو جاتی ہیں۔

عقیدۂ تجربہ گرائی کے ہمنوا (ہابز) کے مطابق: انسان کی فطرت بالکل مشینی انداز میں ہے جو قوانین حرکت کی پیروی کرتا ہے، انسان کے اندر روح کے عنوان سے کوئی برتری کی کیفیت نہیں ہے۔

.....

(۱) "ethologists" کردار شناسی (ethology) ایسا کردار ورفتاری مطالعہ ہے جو جانور شناسی کی ایک شاخ کے عنوان سے پیدا ہوا ہے اور بہت سی انواع واقسام کی توصیفِ رفتار اور مشاہدہ کی مزید ضرورت کی تاکید کرتا ہے۔ تفسیر رفتار بہ عنوان نتیجہ، تکامل انسان کے طبیعی انتخاب کا سرچشمہ ہے، لیکن بعد میں اس کا اطلاق انسان وحیوان کے انتخابی پہلو پر ہونے لگا اور اس وقت حضوری گوشوں پر اطلاق ہوتا تھا اور آج کل علم حیات کی طرف متمائل ہو گیا ہے

(2) Lorenz.

(3) orthonoleculer Psychiatrists.

(4) Newbold.

فرایڈ کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ: انسان تمام حیوانوں کی طرح فقط غریزی خواہشوں کے فشار(۱) کو کنٹرول کرسکتا ہے۔ اس خواہش کو شرمندۂ تعبیر حیاتی ضرورتیں وجود میں لاتی ہیں۔ انسان کا طریقۂ عمل، لذت کی طرف میلان اور رنج والم سے دوری کی پیروی کرنا ہے حتی وہ طریقۂ عمل جو ایسا لگتا ہے کہ بلند وبالا اہداف کی بنیاد پر ہے حقیقت میں وہ بہت ہی پست مقاصد کو بیان کرتا ہے۔

عقیدہ کردار وافعال کے علمبردار (اسکینر) کے مطابق: طریقۂ عمل چاہے انسان کا ہو، چاہے حیوان کا سبھی شرائط کے پابند ہیں. کبھی انسان کے طریقۂ عمل پر نگاہ ہوتی ہے لیکن اس چیز پر نگاہ نہیں ہوتی جو انسان کے طریقۂ عمل کو حیوان کے طریقہ عمل سے جدا کردے جیسے ''آزادنہ ارادہ، اندرونی خواہش اور خودمختار ہونا'' اس طرح کے غلط مفاہیم، بے فائدہ اور خطرناک ہیں چونکہ انسان کی اس غلط فکر کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص مخلوق ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

عقیدہ عقل (ڈکارٹ): پست حیوانات مشین کی طرح ہیں یعنی ان کا طریقۂ عمل بعض مادی قوانین کے تحت ہے اور انسان حیوانی فطرت کے علاوہ عقلی فطرت بھی رکھتا ہے جو اسے قضاوت، انتخاب اور اپنے آزاد ارادہ کے انجام دینے کی اجازت دیتی ہے۔

فرایڈ کے جدید ماننے والے (فروم، اریکسن) کے مطابق: انسان ایسی توانائی رکھتا ہے جو زندگی کی سادہ ضرورتوں پر راضی ہونے سے بالاتر ہے اور وہ اچھائیاں تلاش کرنے کے لئے فطری توانائی رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ وہ انہیں کسب کرسکے گا یا نہیں، اجتماعی اسباب پر منحصر ہے، انسان کے اچھے کام ہوسکتے ہیں کہ بلند وبالا ارادے سے آغاز ہوں لہٰذا وہ فقط پست اہداف سے منحرف نہیں ہوتے ہیں۔

انسان محوری کے شیدائی (مازلو، روجرز) کے مطابق: انسان کی فطرت حیوان کی فطرت سے بعض جہتوں میں برتر ہے، ہر انسان یہ قابلیت رکھتا ہے کہ کمال کی طرف حرکت کرے اور خود کو نمایاں

(1) Tensions.

کرے، نامناسب ماحول کے شرائط وغیرہ مثال کے طور پر فقیر آدمی کا اجتماعی ماحول، جو اپنے تہذیب نفس کی ہدایت کو غلط راستہ کی طرف لے جا کر نابود کر دیتا ہے یہ ایسی ضرورتیں ہیں جو انسان کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن حیوان کے لئے باعث اہمیت نہیں ہیں مثال کے طور پر محبت کی ضرورت، عزت اعتبار، صحت، احترام کی ضرورت اور اپنی فہم کی ضرورت وغیرہ۔

عقیدۂ وجود کے پرستار (سارٹر) کے بہ قول: انسان اس پہلو سے تمام حیوانوں سے جدا ہے کہ وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اعمال کی ذمہ داری فقط اسی پر ہے، یہی معرفت انسان کو تنہائی اور نا امیدی سے باہر لاتی ہے اور یہ چیز انسان ہی سے مخصوص ہے۔

مبہم نظریات

نظریہ افعال گرائی کے حامی (۱) (واٹسن (۲)، اسکینر (۳)) کے مطابق: انسان ذاتاً اچھا یا برا نہیں ہے بلکہ ماحول اس کو اچھا یا برا بنا تا ہے۔

معاشرہ اور سماج گرائی نظریہ (بانڈورا (۴)، مائکل (۵)) کے مطابق: اچھائی یا برائی انسان کو ایسی چیز کی تعلیم دیتے ہیں جو اس کے لئے اجر کی سوغات پیش کرتے ہیں اور اس کو سزا سے بچاتے ہیں۔

وجود گرائی کا نظریہ (سارٹر) کے بہ قول: انسان ذاتاً اچھا یا برا نہیں ہے بلکہ وہ جس عمل کو انجام دیتا ہے اس کی ذاتی فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا اگر تمام لوگ اچھے ہوں تو انسان کی فطرت بھی اچھی ہے اور اسی طرح برعکس۔

---

(1)Behaviorists.

(2)Watson.

(3)Skinner.(4)Bandura.

(5)Mischel.

مثبت نظریات

فرائیڈ کے جدید ماننے والے (فروم، اریکسن (۱)): انسان کے اچھے ہونے کے لئے اس کے اندر مخصوص توانائی موجود ہے لیکن یہ کہ وہ اچھا ہے یا نہیں، اس معاشرہ سے مربوط ہے جس میں وہ زندگی گذار رہا ہے اور ان دوستوں سے مربوط ہے جس کے ساتھ خاص طور سے بچپنے میں رابطہ رکھتا تھا فرائیڈ کے نظریہ کے برخلاف اچھے اعمال فطری زندگی کی ضرورتوں سے وجود میں نہیں آتے ہیں۔

انسان محوری (۲) (مازلو (۳)، روجرز (۴)): انسان کے اندر نیک ہونے اور رہنے کی قابلیت موجود ہے اور اگر اجتماعی ضرورتیں یا اس کے غلط ارادہ کی دخالت نہ ہو تو اس کی اچھائی ظاہر ہو جائے گی۔

رومینٹکس افراد (۵) (روسو) انسان اپنی خلقت کے وقت سے ایک اچھی طبیعت کا مالک ہے اور جو وہ برا عمل انجام دیتا ہے وہ اس کی ذات میں کسی چیز کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ برے معاشرہ کی وجہ سے ہے۔

.....

(1)Erikson.(2)humanists.(3)Maslow.(4)Rogers.

(۵)romanticists رومانی انداز، فنون اور بین الاقوامی عقیدہ فلسفہ میں غالباً (نئے کہن پرستی کے مقابلہ میں اور مکانیزم و عقل پرستی سے پہلے) مغربی یورپ اور روس میں ۱۸ویں صدی کے آخر اور ۱۹ویں صدی کے آغاز تک چھا گیا تھا۔ رومانیزم فطرت کی طرف سادہ انداز میں بازگشت کے علاوہ غفلت یعنی میدان تخیل اور احساس تھا، نفسیات شناسی کے مفاہیم اور موضوعات سے مرتبط، بیان، سادہ لوحی، انقلابی اور بے پرواہی اور حقیقی لذت ان کے جدید تفکر میں بنیادی اعتبار رکھتا ہے۔ رومانیزم، ظاہر بینی، ہنر و افکار اور انسان کے مفاہیم میں محدودیت کے خلاف ایک خاص طغیان تھا اور اپنے فعل میں تاکید بھی کرتے تھے کہ جہان کو درک کرنے والا اس پر مقدم ہے، یہیں سے نظریۂ تخیل محور و مرکز قرار پاتا ہے۔

٦

نظام خلقت میں انسان کا مقام

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات

۱.خلافت، کرامت اور انسان کے امانت دار ہونے کے مفاہیم کی وضاحت کریں؟

۲.آیات قرآن کی روشنی میں انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کی وضاحت کریں؟

۳.خلافت کے لئے، حضرت آدمؑ کے شایستہ وسزاوار ہونے کا معیار بیان کریں؟

۴.کرامت انسان سے کیا مراد ہے اس کو واضح کریں نیز قرآن کی روشنی میں اس کے اقسام کو ذکر فرمائیں؟

۵.ذاتی اور کسبی کرامت کی وضاحت کریں؟

دو فصل پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن مجید انسان کی موجودہ نسل کی تخلیق کو حضرت آدمؑ کی خلقت سے مخصوص جانتا ہے اور انسانوں کے تفکر، خواہشات اور غیر حیوانی توانائی سے استوار ہونے کی تاکید کرتا ہے، حضرت آدمؑ اور ان کی نسل کی آفرینش سے مربوط آیات گذشتہ دو فصلوں میں بیان کی گئی آیات سے زیادہ ہیں جس میں حضرت آدمؑ کی خلافت و جانشینی نیز دوسرے موجودات پر انسان کی برتری و کرامت اور دوسری طرف انسان کی پستی، تنزلی دوسری مخلوقات سے بھی گر جانے کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے، انسان کی خلافت کے مسئلہ اور اس کی کرامت کے بارے میں قرآن مجید نے دو اعتبار سے لوگوں کے سامنے متعدد سوالات اٹھائے ہیں، جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں۔

۱. حضرت آدمؑ کی جانشینی سے مراد کیا ہے اور وہ کس کے جانشین تھے؟

۲. آیا خلافت اور جانشینی حضرت آدمؑ سے مخصوص ہے یا ان کی نسل بھی اس سے بہرمند ہو سکتی ہے؟

۳. حضرت آدم کا خلافت کے لئے شایستہ و سزاوار ہونے کا معیار کیا ہے اور کیوں دوسری مخلوقات خلافت کے لائق نہیں ہیں؟

۴. انسان کی برتری اور کرامت کے سلسلہ میں قرآن میں دو طرح کے بیانات کا کیا راز ہے؟ کیا یہ بیانات، قرآن کے بیان میں تناقض کی طرف اشارہ نہیں ہیں؟ اسی فصل میں ہم خلافت الٰہی

اور کرامت انسان کے عنوان کے تحت مذکورہ سوالات کا جائزہ و تحلیل اور ان کے جوابات پیش کریں گے۔

خلافت الٰہی

اولین انسان کی خلقت کے سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات میں ذکر کئے گئے مسائل میں سے ایک انسان کا خلیفہ ہونا ہے، سورۂ بقرہ کی ۳۰ویں آیہ میں خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَ إذ قَالَ رَبُّکَ لِلمَلائِکَةِ إنِّی جَاعِلٌ فِی الأرضِ خَلِیفَةً قَالُوا أ تَجعَلُ فِیهَا مَن یُفسِدُ فِیهَا وَ یَسفِکُ الدِّمَاءَ وَ نَحنُ نُسَبِّحُ بِحَمدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ قَالَ إنِّی أَعلَمُ مَا لا تَعلَمُونَ﴾

اور (یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک نائب زمین میں بنانے والا ہوں تو کہنے لگے: کیا تو زمین میں ایسے شخص کو پیدا کرے گا جو زمین میں فساد اور خونریزیاں کرتا پھرے حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی ثابت کرتے ہیں، تب خدا نے فرمایا: اس میں تو شک ہی نہیں کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

خلیفہ اور خلافت، ''خلف'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیچھے اور جانشین کے ہیں، جانشین کا استعمال کبھی تو حسی امور کے لئے ہوتا ہے جیسے ﴿وَ هُوَ الَّذِی جَعَلَ اللَّیلَ وَ النَّهَارَ خِلفَةً...﴾(۱) ''اور وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے رات اور دن کو جانشین بنایا...'' اور کبھی اعتباری امور کے لئے جیسے ﴿یَا دَاوُدُ إنَّا جَعَلنَاکَ خَلِیفَةً فِی الأرضِ فَاحکُم بَینَ النَّاسِ بِالحَقِّ﴾ اے داود! ہم نے تم کو زمین میں نائب قرار دیا تو تم لوگوں کے درمیان بالکل ٹھیک فیصلہ کیا کرو، (۲) اور کبھی غیر طبیعی حقیقی امور میں استعمال ہوتا ہے جیسے حضرت آدمؑ کی خلافت جو سورہ

---

(۱) فرقان/۶۲۔ (۲) ص/۲۶۔

بقرہ کی ۳۰ ویں آیہ میں مذکور ہے۔

حضرت آدمؑ کی خلافت سے مراد انسانوں کی خلافت یا ان سے پہلے دوسری مخلوقات کی خلافت نہیں ہے بلکہ مراد، خدا کی خلافت و جانشینی ہے، اس لئے کہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ: ''میں جانشین قرار دوں گا'' یہ نہیں فرمایا کہ ''کس کا جانشین'' مزید یہ کہ فرشتوں کے لئے جانشینی کا مسئلہ پیش کرنا، ان میں آدمؑ کا سجدہ بجالانے کے لئے آمادگی ایجاد کرنا مطلوب تھا اور اس آمادگی میں غیر خدا کی طرف سے جانشینی کا کوئی کردار نہیں ہے، اس کے علاوہ جیسا کہ فرشتوں نے کہا: کیا اس کو خلیفہ بنائے گا جو فساد و خونریزی کرتا ہے جب کہ ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں، اصل میں یہ ایک مؤدبانہ درخواست تھی کہ ہم کو خلیفہ بنادے کیوں کہ ہم سب سے بہتر و سزاوار ہیں اور اگر جانشینی خدا کی طرف سے مدنظر نہ تھی تو یہ درخواست بھی بے وجہ تھی، اس لئے کہ غیر خدا کی طرف سے جانشینی اتنی اہمیت نہیں رکھتی ہے کہ فرشتے اس کی درخواست کرتے، نیز غیر خدا سے جانشینی حاصل کرنے کے لئے تمام اسماء کا علم یا ان کو حفظ کرنے کی توانائی لازم نہیں ہے، پس خلافت سے مراد خداوند عالم کی جانشینی ہے۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ خداوند عالم کی جانشینی صرف ایک اعتباری جانشینی نہیں ہے بلکہ تکوینی جانشینی ہے جیسا کہ آیہ کے سیاق و سباق سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے: ﴿وَ عَلَّمَ آدمَ الأسمَاءَ کُلَّهَا﴾ ''اور خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کو تمام اسماء کی تعلیم دی'' فرشتوں کو خدوند عالم کی طرف سے جناب آدمؑ کے سجدہ کرنے کا حکم ہونا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہ خلافت، خلافت تکوینی (عینی حقائق میں تصرف) کو بھی شامل ہے۔(۱) خلافت تکوینی کا عالی رتبہ، خلیفۃ اللہ کو قوی بناتا ہے تا کہ خدائی افعال انجام دے سکے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ ولایت تکوینی کا مالک ہو جائے۔

---

(۱) تشریعی خلافت سے مراد، لوگوں کی ہدایت اور قضاوت کے منصب کا عہدہ دار ہونا ہے۔ اور خلافت تکوینی سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص خدا کے ایک یا چند یا تمام اسماء کا مظہر بن جائے اور صفات باری تعالی اس کے ذریعہ مرحلۂ عمل یا ظہور میں واقع ہوں۔

خلافت کے لئے حضرت آدمؑ کے شائستہ ہونے کا معیار

آیت کریمہ کے ذریعہ ﴿وَ عَلَّمَ آدمَ الأسمَاءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُم عَلَیٰ المَلائِکَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِی بِأَسمَآءِ هٰؤُلآءِ إن کُنتُم صَادِقِینَ﴾ (۱) ''اور حضرت آدمؑ کو تمام اسماء کا علم دے دیا پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان اسماء کے نام بتاؤ'' یہ اچھی طرح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت خدا کے لئے حضرت آدمؑ کی معیار قابلیت، تمام اسماء کا علم تھا۔ اس مطلب کو سورۂ بقرہ کی ۳۳ ویں آیہ بھی تائید کرتی ہے۔

لیکن یہ کہ اسماء سے مراد کیا ہے اور خداوند عالم نے کس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی تعلیم دی اور فرشتے ان اسماء سے کیونکر بے خبر تھے اس سلسلہ میں بہت زیادہ بحث ہوئی ہے جس کو ہم پیش نہیں کریں گے فقط ان میں سے پہلے مطلب کو بطور اختصار ذکر کریں گے، آیات قرآن میں وضاحت کے ساتھ یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ ان اسماء سے مراد کن موجودات کے نام ہیں اور روایات میں ہم دو طرح کی روایات سے روبرو ہیں، جس میں سے ایک قسم نے تمام موجودات کے نام اور دوسری قسم نے چہاردہ معصومین کے نام کو ذکر کیا ہے۔ (۲) لیکن حضرت آدم کی خلافت تکوینی کی وجہ اور اس بات پر قرآن کی تائید کہ خداوند عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم دیا سے مراد یہ ہے کہ موجودات، فیض خدا کا وسیلہ بھی ہوں اور خداوند عالم کے اسماء بھی ہوں اور کسی چیز سے چشم پوشی نہ ہوئی ہو۔

مخلوقات کے اسماء سے حضرت آدمؑ کا آگاہ ہونا اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی طرف سے خلافت اور جانشینی کے حدود کو ان کے اختیار میں قرار دیا جائے۔ اور اسماء خداوند عالم کے جاننے کا مطلب، مظہر اسماء الٰہی ہونے کی قدرت ہے یعنی ولایت تکوینی کا ملنا ہے اور اسماء کا جاننا، فیض الٰہی کا ذریعہ ہے، یہ ان کو خلافت کے حدود میں تصرف کے طریقے بتاتا ہے اور اس وضاحت سے ان دو

.....

(۱) بقرہ/۳۱۔ (۲) ملاحظہ ہو: مجلسی، محمد باقر؛ بحار الانوار، ج ۱۱ ص ۱۴۵۔۱۴۷، ج ۲۶، ص ۲۸۳۔

طرح کی روایات کے درمیان ظاہری اختلاف اور ناہماہنگی برطرف ہوجاتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسماء سے مراد اس کا ظاہری مفہوم نہیں ہے جس کو ایک انسان فرض، اعتبار اور وضع کرتا ہے، اسی طرح ان اسماء کی تعلیم کے معنی بھی ان الفاظ وکلمات کا ذہن میں ذخیرہ کرنا نہیں ہے، اس لئے کہ مذکورہ طریقہ سے ان اسماء کا جاننا کسی بھی صورت میں خلافت الٰہی کے لئے معیار قابلیت اور خلافت تکوینی کے حصول کے لئے کوئی اہم رول نہیں ادا کرسکتا ہے، اس لئے کہ اگر علم حصولی کے ذریعہ اسماء وضعی اور اعتباری حفظ کرنا اور یاد کرنا مراد ہوتا تو حضرت آدمؑ کے خبر دینے کے بعد چونکہ فرشتہ بھی ان اسماء سے آگاہ ہوگئے تھے لہٰذا انھیں بھی خلافت کے لائق ہونا چاہیئے تھا بلکہ اس سے مراد چیزوں کی حقیقت جاننا ان کے اور اسماء خداوند عالم کے بارے میں حضوری معرفت رکھنا ہے جو تکوینی تصرف پر قدرت کے ساتھ ساتھ حضرت آدمؑ کے وجود کی برتری بھی ہے۔(۱)

حضرت آدمؑ کے فرزندوں کی خلافت

حضرت آدمؑ کے تخلیق کی گفتگو میں خداوند عالم کی طرف سے خلافت اور جانشینی کا مسئلہ بیان ہوچکا ہے۔ اور سورۂ بقرہ کی ۳۰ ویں آیت نے بہت ہی واضح خلافت کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اب یہ سوال درپیش ہے کہ کیا یہ خلافت حضرت آدمؑ سے مخصوص ہے یا دوسرے افراد میں بھی پائی جاسکتی ہے؟

---

(۱) بعض مفسرین نے احتمال دیا ہے کہ ''اسماء'' کا علم مافوقِ عالم وملائکہ ہے؛ یعنی اس کی حقیقت ملائکہ کی سطح سے بالاتر ہے کہ جس عالم میں معرفت وجود میں ترقی اور وجود ملائکہ کے رتبہ وکمال سے بالاتر کمال رکھنا ہے اور وہ عالم، عالم خزائن ہے جس میں تمام اشیاء کی اصل وحقیقت ہے اور اس دنیا کی مخلوقات اسی حقیقت اور خزائن سے نزول کرتے ہیں ﴿وَ إِن مِّن شَيئٍ إِلا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَ مَا نُنَزِّلُهُ إِلا بِقَدَرٍ مَّعلُومٍ﴾ (حجر/۲۱) ''اور ہمارے یہاں تو ہر چیز کے بے شمار خزانے پڑے ہیں اور ہم ایک خاص، تلی مقدار ہی بھیجتے رہتے ہیں'' ملاحظہ ہو: محمد حسین طباطبائی کی المیزان فی تفسیر القرآن؛ کے ذیل آیہ سے۔

جواب یہ ہے کہ: مذکورہ آیہ حضرت آدم کی ذات میں خلافت کے انحصار پر نہ فقط دلالت نہیں کرتی ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جملہ ﴿أَ تَجعَلُ فِيهَا مَن يُفسِدُ فِيهَا وَ يَسفِكُ الدِّمَاءَ﴾ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خلافت حضرت آدمؑ کی ذات سے منحصر نہیں ہے، اس لئے کہ اگر صرف حضرت آدمؑ سے خلافت مخصوص ہوتی تو چونکہ حضرت آدمؑ معصوم ہیں اور معصوم فساد و خونریزی نہیں کرتا ہے لہٰذا خداوند عالم فرشتوں سے یہ فرما سکتا تھا کہ: آدم فساد اور خونریزی نہیں کرے گا، البتہ یہ شبہ نہ ہو کہ تمام افراد بالفعل خدا کے جانشین و خلیفہ ہیں، اس لئے کہ یہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ مقرب الٰہی فرشتے جس مقام کے لائق نہ تھے اور جس کی وجہ سے حضرت آدم کا سجدہ کیا تھا، وہ تاریخ کے بڑے بڑے ظالموں کے اختیار میں قرار پائے اور وہ خلافت کے لائق بھی ہوں؟! پس یہ خلافت حضرت آدمؑ اور ان کے بعض فرزندوں سے مخصوص ہے جو تمام اسماء کا علم رکھتے ہیں، لہٰذا اگرچہ نوع انسان خدا کی جانشینی اور خلافت کا امکان رکھتا ہے لیکن جو حضرات عملی طور پر اس مقام کو حاصل کرتے ہیں وہ حضرت آدمؑ اور ان کی بعض اولادیں ہیں جو ہر زمانہ میں کم از کم ان کی ایک فرد سماج میں ہمیشہ موجود ہے اور وہ روئے زمین پر خدا کی حجت ہے اور یہ وہ نکتہ ہے جس کی روایات میں بھی تاکید ہوئی ہے۔(۱)

کرامت انسان

انسان کی کرامت کے سلسلہ میں قرآن مجید کا دو پہلو بیان موجود ہے: قرآن مجید کی بعض آیات میں انسان کی کرامت، شرافت اور دوسری مخلوقات پر اس کی برتری کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اور بعض آیات میں انسان کی تذلیل اور اس کو حیوانات سے پست بیان کیا گیا ہے مثال کے طور پر سورۂ اسراء کی ۷۰ ویں آیت میں خداوند عالم نے بنی آدم کی تکریم کی ہے اور بہت سی دوسری مخلوقات

.....

(۱) ملاحظہ ہو: کلینی، محمد بن یعقوب؛ الاصول من الکافی؛ ج۱، ص ۱۷۸ و ۱۷۹۔

کے مقابلہ میں اس کی برتری بیان ہوئی ہے۔(۱) سورۂ تین کی چوتھی آیہ اور سورۂ مومنون کی ۱۴ ویں آیہ میں انسان کی بہترین انداز میں خلقت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے (۲) اور دوسری بہت سی آیات میں یوں مذکور ہے کہ جو کچھ بھی زمینوں و آسمانوں میں ہے انسان کے لئے مسخر یا اس کے لئے پیدا کی گئی ہے (۳) اور ملائکہ نے اس کا سجدہ کیا ہے، وہ تمام اسماء کا جاننے والا، مقام خلافت (۴) اور بلند درجات (۵) کا حامل ہے، یہ تمام چیزیں دوسری مخلوقات پر انسان کی برتری، شرافت اور کرامت کی طرف اشارہ ہے، اور دوسری طرف ضعیف ہونا (۶)، لالچی ہونا (۷)، ظالم و ناشکرا (۸) اور جاہل ہونا (۹)، چوپائے کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہونا (۱۰) اور پست ترین

.....

(۱) ﴿وَ لَقَد كَرَّمنَا بَنِی آدمَ وَ حَمَلنَاهُم فِی البَرِّ وَ البَحرِ وَ رَزَقنَاهُم مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَ فَضَّلنَاهُم عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّن خَلَقنَا تَفضِيلاً﴾ (اسراء/۷۰) اور ہم نے یقیناً آدمؑ کی اولاد کو عزت دی اور خشکی اور تری میں ان کو لئے پھرے اور انہیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں اور اپنے بہتیرے مخلوقات پر ان کو فضیلت دی۔(۲) ﴿لَقَد خَلَقنَا الإِنسَانَ فِی أَحسَنِ تَقوِيمٍ﴾ (تین/۴) یقیناً ہم نے انسان کو بہت اچھے حلیے (ڈھانچے) میں کا پیدا کیا۔﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحسَنُ الخَالِقِينَ﴾ (مومنون/۱۴) تو خدا بابرکت ہے جو سب بنانے والوں میں بہتر ہے۔(۳) ﴿أَ لَم تَرَوا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُم مَا فِی السَّمٰوَاتِ وَ مَا فِی الأَرضِ وَ أَسبَغَ عَلَيكُم نِعمَهُ ظَاهِرةً وَ بَاطِنَةً﴾ (لقمان/۲۰) کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا ہی نے یقینی تمہارا تابع کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔﴿هُوَ الَّذِی خَلَقَ لَكُم مَّا فِی الأَرضِ جَمِيعاً﴾ (بقرہ ۲۹) اور وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزوں کو پیدا کیا۔(۴) یہ آیات خلافت الٰہی کی بحث میں بیان ہو چکی ہیں۔(۵) اس حصہ کی آیتیں بہت زیادہ ہیں اور ان کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔(۶) ﴿وَ خُلِقَ الإِنسَانُ ضَعِيفاً﴾ (نساء/۲۸) اور انسان کمزور خلق کیا گیا ہے۔(۷) ﴿إِنَّ الإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً﴾ (معارج/۱۹) یقیناً انسان بہت لالچی پیدا ہوا ہے (۸) ﴿إِنَّ الإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾ (ابراہیم، ۳۴) یقیناً انسان بڑا ناانصاف اور ناشکرا ہے۔(۹) ﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً﴾ (احزاب/۷۲) یقیناً انسان بڑا ظالم و جاہل ہے۔(۱۰) ﴿أُولٰئِكَ كَالأَنعَامِ بَل هُم أَضَلُّ﴾ (اعراف/۱۷۹) وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

درجہ میں ہونا(۱) یہ وہ امور ہیں جو قرآن مجید کی بعض دوسری آیات میں بیان ہوا ہے۔ اور دوسری مخلوقات پر انسان کی عدم برتری کی علامت ہے بلکہ ان کے مقابلہ میں انسان کے پست تر ہونے کی علامت ہے، کیا یہ دوطرح کی آیات ایک دوسرے کی متناقض ہیں یا ان میں سے ہر ایک کسی خاص مرحلہ کو بیان کر رہی ہے یا مسئلہ کسی اور انداز میں ہے؟

مذکورہ آیات میں غور وفکر ہمیں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ انسان قرآن کی نظر میں دوطرح کی کرامت رکھتا ہے: کرامت ذاتی یا وجود شناسی اور کرامت اکتسابی یا اہمیت شناسی۔

کرامت ذاتی

کرامت ذاتی سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو ایسا خلق کیا ہے کہ جسم کی بناوٹ کے اعتبار سے بعض دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں زیادہ امکانات وسہولت کا حامل ہے یا اس کے امکانات کی ترکیب وتنظیم اچھے انداز میں ہوئی ہے، بہر حال بہت زیادہ سہولت اور توانائی کا حامل ہے اس طرح کی کرامت، نوع انسان پر خداوند عالم کی مخصوص عنایت کا اشارہ ہے جس سے سبھی مستفیض ہیں، لہٰذا کوئی یہ حق نہیں رکھتا ہے کہ ان چیزوں سے مزین ہونے کی بنا پر دوسرے مخلوق کے مقابلہ میں فخر کرے اور ان کو اپنا انسانی کمال اور معیار اعتبار سمجھے یا اس کی وجہ سے مورد تعریف قرار پائے، بلکہ اتنی سہولت والی ایسی مخلوق تخلیق کرنے کی وجہ سے خداوند عالم کی حمد وتعریف کرنا چاہیئے۔ جس طرح وہ خود فرماتا ہے ﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ أحسَنُ الخَالِقِینَ﴾ اور سورۂ اسراء کی ۷۰ ویں آیہ ﴿وَ لَقَد کَرَّمنَا بَنِی آدمَ وَ حَملنَاھُم فِی البَرِّ وَ البَحرِ وَ رَزَقنَاھُم مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَ فَضَّلنَاھُم عَلیٰ کَثِیرٍ مَمَّن خَلَقنَا تَفضِیلاً﴾(۲) اور بہت سی آیات جو دنیا اور مافیہا کو انسان کے لئے

.....

(۱) ﴿ثُمّ رَدَدنَاہُ أسفَلَ سَافِلِینَ﴾ (تین/۵) پھر ہم نے اسے پست سے پست حالت کی طرف پھیر دیا۔

(۲) سورۂ اسراء/۷۰

مسخر ہونے کو بیان کرتی ہیں جیسے ''وَ سَخَّرَ لَکُم مَا فِی السَّمٰوَاتِ وَ مَا فِی الأرضِ جَمِیعاً مِنہُ ﴾(۱)اور جیسے ﴿خَلَقَ لَکُم مَا فِی الأرضِ جَمِیعاً ﴾وغیرہ تمام آیات صنف انسان کی کرامت تکوینی پر دلالت کرتی ہیں۔اور ﴿خُلِقَ الإنسَانُ ضَعِیفاً ﴾(۲) جیسی آیات اور سورۂ اسراء کی ۷۰ ویں آیہ جو کہ بہت سی مخلوقات (نہ کہ تمام مخلوقات) پر انسان کی برتری کو پیش کرتی ہے یعنی بعض مخلوقات پر انسان کی ذاتی عدم برتری کی یاد آوری کرتی ہے۔(۳)

کرامت اکتسابی

اکتسابی کرامت سے مراد ان کمالات کا حاصل کرنا ہے جن کو انسان اپنے اختیاری اعمال صالحہ اور ایمان کی روشنی میں حاصل کرتا ہے، کرامت کی یہ قسم انسان کے ایثار و تلاش اور انسانی اعتبارات کا معیار اور خداوند عالم کی بارگاہ میں معیار تقرب سے حاصل ہوتا ہے، یہ وہ کرامت ہے جس کی وجہ سے یقیناً کسی انسان کو دوسرے انسان پر برتر جانا جاسکتا ہے، تمام لوگ اس کمال و کرامت تک رسائی کی قابلیت رکھتے ہیں، لیکن کچھ ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ اس سے بے بہرہ رہتے ہیں، گویا اس کرامت میں نہ تو تمام لوگ دوسری مخلوقات سے برتر ہیں اور نہ تمام لوگ دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں پست یا مساوی ہیں، لہٰذا وہ آیتیں جو انسان کی کسبی کرامت کو بیان کرتی ہیں دو طرح کی ہیں:

الف) کرامت اکتسابی کی نفی کرنے والی آیات

اس سلسلہ کی موجودہ آیات میں سے ہم فقط چار آیتوں کے ذکر پر اکتفا کر رہے ہیں:

.....

(۱) سورہ جاثیہ/۱۳۔(۲) سورۂ نساء/۲۸۔(۳) گذشتہ بحثوں میں غیر حیوانی استعداد کے سلسلہ میں گفتگو کی ہے اور انسان کی دائمی روح بھی معرفت انسان کی ذاتی اور وجودی کرامت میں شمار ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ سبھی یا ان میں سے بعض انسان کی عالی خلقت سے مربوط آیات جو متن کتاب میں بھی مذکور ہیں مدنظر ہوں۔

۱۔﴿ثُمَّ رَدَدنَاهُ أَسفَلَ سَافِلِينَ﴾(۱)

پھر ہم نے اسے پست سے پست حالت کی طرف پھیر دیا۔

بعض انسانوں سے اکتسابی کرامت کی نفی اس بنا پر ہے کہ گذشتہ آیت میں انسان کی بہترین شکل وصورت میں خلقت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور بعد کی آیت میں اچھے عمل والے اور مومنین اسفل السافلین میں گرنے سے استثناء ہوئے ہیں اگر ان کا یہ گرنا اور پست ہونا اختیاری نہ ہوتا تو انسان کی خلقت بیکار ہو جاتی اور خداوند عالم کا یہ عمل کہ انسان کو بہترین شکل میں پیدا کرے اور اس کے بعد بے وجہ اور انسان کے اختیار یا اس سے کوئی غلطی سرزد نہ ہوتے ہوئے بھی سب سے پست مرحلہ میں ڈالنا غیر حکیمانہ ہے مزید یہ کہ بعد والی آیت بیان کرتی ہے کہ ایمان اور اپنے صالح عمل کے ذریعہ، انسان خود کو اس حالت سے بچا جا سکتا ہے، یا اس مشکل میں گرنے سے نجات حاصل کر سکتا ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نزول انسان کے اختیاری اعمال اور اکتسابی چیزوں کی وجہ سے ہے۔

۲. ﴿أُولٰئکَ کَالأنعَامِ بَل هُم أَضَلُّ أُولٰئِکَ هُمُ الغَافِلُونَ﴾(۲)

یہ لوگ گویا جانور ہیں بلکہ ان سے بھی کہیں گئے گذرے ہیں یہی لوگ غافل ہیں

۳. ﴿إنّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّٰهِ الصُّمُّ البُکمُ الَّذِینَ لا یَعقِلُونَ﴾(۳)

بیشک کہ زمین پر چلنے والے میں سب سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔

۴. ﴿إنّ الإنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً وَ إِذَا مَسَّهُ الخَیرُ مَنُوعاً﴾(۴)

بیشک انسان بڑا لالچی پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف پہونچتی ہے تو بے صبر ہو جاتا ہے اور جب اس تک بھلائی اور خیر کی رسائی ہوتی ہے تو اترانے لگتا ہے۔

---

(۱) تین/۵ (۲) اعراف/۱۷۹ (۳) انفال/۲۲ (۴) سورہ معارج/۱۹۔۲۱.

مذکورہ دو ابتدائی آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ عقل وفکر کو استعمال نہ کرنے اور اس کے مطابق عمل نہ کرنے کی وجہ سے انسانوں کی مذمت کی گئی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں کرامت سے مراد کرامت اکتسابی ہے چونکہ بعد والی آیت نماز پڑھنے والوں کو نماز پڑھنے اور ان کے اختیاری اعمال کی بنا پر استثناء کرتی ہے لہٰذا تیسری آیہ اکتسابی کرامت سے مربوط ہے۔

ب) کرامت اکتسابی کو ثابت کرنے والی آیات

اس سلسلہ میں بھی بہت سی آیات موجود ہیں جن میں سے ہم دو آیتوں کو نمونہ کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

۱.﴿إنَّ أَکرَمَکُم عِندَ اللّٰہِ أَتقَکُم﴾(۱)

۲.ان آیات کا مجموعہ جو کسی کرامت کی نفی کے بعد بعض انسانوں کو اس سے استثناء کرتی ہیں جیسے ﴿إنَّ الإنسَانَ لَفِی خُسرٍ إلا الَّذِینَ آمَنُوا(۲)، ثُمَّ رَدَدنَاہُ أَسفَلَ سَافِلِینَ إلا الَّذِینَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ(۳) ، إنّ الإنسَانَ خُلِقَ ھَلُوعاً ... إلا المُصَلِّینَ﴾(۴)

جیسا کہ اشارہ ہوا کہ اکتسابی کرامت انسان کے اختیار سے وابستہ ہے اور اس کو حاصل کرنا جیسا کہ گذشتہ آیتوں میں آچکا ہے کہ تقویٰ، ایمان اور اعمال صالحہ کے بغیر میسر نہیں ہے۔

گذشتہ مطالب کی روشنی میں وسیع اور قدیمی مسئلہ ''انسان کا اشرف المخلوقات ہونا'' وغیرہ بھی واضح وروشن ہو جاتا ہے، اس لئے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے مراد دوسری مخلوقات خصوصاً مادی دنیا کی مخلوقات کے مقابلہ میں مزید سہولت اور بہت زیادہ توانائی کا مالک ہونا ہے (چاہے قابلیت، بہتر اور بہت زیادہ امکانات کی صورت میں ہو) اپنے اور قرآنی نظریہ کے مطابق انسان

.....

(۱) حجرات/۱۳۔(۲) عصر/۲و۳۔(۳) تین/۵و۶۔(۴) معارج/۱۹۔

اشرف المخلوقات ہے۔اور وہ مطالب جو انسان کی غیر حیوانی فطرت کی بحث اور کرامت ذاتی سے مربوط آیتوں میں بیان ہو چکے ہیں ہمارے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں، اگر چہ ممکن ہے کہ بعض دوسری مخلوقات جیسے فرشتے بعض خصوصیات میں انسان سے بہتر ہوں یا بعض مخلوقات جیسے جن، انسانوں کے مقابلہ میں ہوں (۱) لیکن اگر تمام مخلوقات پر انسان کی فوقیت و برتری منظور نظر ہے تب بھی کسی صورت میں ہو تو یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم کی تمام مخلوقات پر تمام انسان فوقیت اور برتری رکھتے ہیں، البتہ انسانوں کے درمیان ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو خداوند عالم کی ہر مخلوق بلکہ تمام مخلوقات سے برتر ہیں اور اکتسابی کرامت کے اس درجہ و مرتبہ کو حاصل کر چکے ہیں جسے کوئی حاصل ہی نہیں کر سکتا، یہ وہی لوگ ہیں جو ولایت تکوینی اور لامحدود خلافت الٰہی کے حامل ہیں۔

اس مقام پر ایک اہم سوال یہ در پیش ہے کہ اگر کرامت اکتسابی انسان سے مخصوص ہے تو قرآن مجید میں کرامت اکتسابی نہ رکھنے والے انسانوں کو کیونکر چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے پست سمجھا گیا ہے؟ اور کس طرح ایک مہم اور معتبر شی کو ایک امر تکوینی سے تقابل کیا جا سکتا ہے اور ان دونوں مقولوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟!

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی کرامت اکتسابی اگر چہ اقدار شناسی کے مقولہ میں سے ہے لیکن یہ ایک حقیقی شی ہے نہ کہ اعتباری، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر قابل اہمیت شی ضروری نہیں ہے کہ اعتباری اور وضعی ہو، جب یہ کہا جاتا ہے کہ: شجاعت، سخاوت، ایثار و قربانی اعتباری چیزوں میں سے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سخی، ایثار کرنے والے، فداکار شخص کو صرف اعتبار اور وضع کی بنیاد پر اچھا اور لائق تعریف و تمجید سمجھا گیا ہے بلکہ ایسا شخص واقعاً سخاوت، ایثار اور فداکاری نامی حقیقت

.....

(۱) ایک دوسرے زاویہ سے جس طرح فلسفہ و عرفان اسلامی میں بیان ہوا ہے نیز روایات میں مذکور ہے کہ پیغمبر اکرم اور ائمہ معصومینؑ کا نورانی وجود، تمام مخلوقات کے لئے فیضان الٰہی کا واسطہ اور نقطہ آغاز و علت ہے۔اور علم حیات کے اعتبار سے سب سے رفیع درجات و کمالات کے مالک اور خداوند عالم کی عالی ترین مخلوق میں سے ہیں۔

کا حامل ہے جس سے دوسرے لوگ دور ہیں بس کرامت اکتسابی بھی اسی طرح ہے انسان کی اکتسابی کرامت صرف اعتباری اور وضعی شئی نہیں ہے بلکہ انسان واقعاً عروج وکمال پاتا یا سقوط کرتا ہے۔لہٰذا مزید وہ چیزیں جن سے انسانوں کو اکتسابی اور عدم اکتسابی کرامت سے استوار ہونے کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنا چاہیئے اور ایک کو بلند اور دوسرے کو پست سمجھنا چاہیئے، اسی طرح انسانوں کو حیوانات اور دوسری مخلوقات سے بھی موازنہ کرنا چاہیئے اور بعض کو فرشتوں سے بلند اور بعض کو جمادات و حیوانات سے پست سمجھنا چاہیئے اسی وجہ سے سورۂ اعراف کی ۱۷۹ویں آیہ میں کرامت اکتسابی نہ رکھنے والے افراد کو چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ بتایا گیا ہے۔سورہ انفال کی ۲۲ویں آیہ میں ''بدترین متحرک'' کا عنوان دیا گیا ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگ آرزو کریں گے کہ اے کاش مٹی ہوتے ﴿وَ یَقُولُ الکَافِرُ یَا لَیتَنِی کُنتُ تُرَاباً﴾ (۱) اور کافر (قیامت کے دن) کہیں گے اے کاش میں مٹی ہوتا۔

.....

(۱) سورۂ نبا/۴۰۔

خلاصہ فصل

۱.گذشتہ فصل میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ انسان بعض مشترکہ خصوصیات کا حامل ہے بعض مغربی مفکرین نے مثال کے طور پر وہ افراد جو انسان کی فعالیت کو بنیادی محور قرار دیتے ہیں یا افراط کے شکار معاشرہ پرست افراد بنیادی طور پر ایسے عناصر کے وجود کے منکر ہیں اور وہ انسان کی حقیقت کے سادہ لوح ہونے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

ان گروہ کے علاوہ دوسرے لوگ مشترکہ فطرت کو قبول کرتے ہیں لیکن انسان کے اچھے یا برے ہونے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں بعض اس کو برا اور بعض فقط اچھا سمجھتے ہیں، بعض نے انسان کو دو پہلو رکھنے والی تصویر سے تعبیر کیا ہے۔

۲.قرآن کریم نے اس سوال کے جواب میں جو انسانوں کو بنیادی طور پر اچھے اور برے خواہشات کا حامل جانتے ہیں، ان کے معنوی و مادی پہلوؤں کو جدا کر کے تجزیہ و تحلیل کی ہے۔

۳.انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ ایک تکوینی شئی ہے یعنی انسان کائنات میں تصرف اور ولایت تکوینی کے مقام کو حاصل کر سکتا ہے اس مقام کو حاصل کرنے کی راہ اور حضرت آدمؑ کی صلاحیت کا معیار تمام اسماء کے بارے میں ان کی حضوری معرفت ہے، اسماء مخلوقات اس کی جانشینی کے اختیارات پر استوار ہے۔اسماء الٰہی ،قدرت اور ولایت تکوینی کو فراہم کرتا ہے اور وسیلہ فیض کے اسماء اس کے لئے اشیاء میں طریقہ تصرف مہیا کرتے ہیں۔

۴.حضرت آدم کی اولادوں میں بعض ایسے افراد بھی ہیں جو مقام خلافت کو حاصل کر چکے ہیں اور روایتوں کے مطابق ہر زمانے میں کم از کم ایک فرد زمین پر خلیفۃ اللہ کے عنوان سے موجود ہے۔

۵.انسان دو طرح کی کرامت رکھتا ہے: ایک کرامت ذاتی جو تمام افراد کو شامل ہے اور باقی

مخلوقات کے مقابلہ میں بہتر اور بہت زیادہ امکانات کا حامل ہے اور دوسرا کرامت اکتسابی کہ اس سے مراد وہ مقام و منزلت ہے جس کو انسان اپنی تلاش و جستجو سے حاصل کرتا ہے اور اس معنوی کمال کے حصول کی راہ، ایمان اور عمل صالح ہے اور چونکہ افراد کی آزمائش کا معیار و اعتبار اسی کرامت پر استوار ہے اور اسی اعتبار سے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے لہٰذا قرآن کبھی انسان کی تعریف اور کبھی مذمت کرتا ہے۔

تمرین

۱.گذشتہ فصول کے مطالب کی بنیاد پر کیوں افراد انسان مشترکہ فطرت وحقیقت رکھنے کے باوجود رفتار، گفتار، اخلاق واطوار میں مختلف ہیں۔؟

۲.عالم ہستی میں انسان کی رفعت ومنزلت اور الٰہی فطرت کے باوجود اور اس کے بہترین ترکیبات سے مزین ہونے کے باوجود اکثر افراد صحیح راستہ سے کیوں منحرف ہوجاتے ہیں۔؟

۳.اگر جستجو کا احساس انسان کے اندر ایک فطری خواہش ہے تو قرآن نے دوسروں کے کاموں میں تجسس کرنے کی کیوں مذمت کی ہے؟ آیا یہ مذمت اس الٰہی اور عام فطرت کے نظر انداز کرنے کے معنی میں نہیں ہے؟

۴.خدا کی تلاش، خود پسندی اور دوسری خواہشوں کو کس طرح سے پورا کیا جائے تا کہ انسان کی حقیقی سعادت کو نقصان نہ پہونچے؟

۵.قرآنی اصطلاح میں روح، نفس، عقل، قلب جیسے کلمات کے درمیان کیا رابطہ ہے؟

۶.انسان کے امانت دار ہونے سے مراد کیا ہے نیز مصادیق امانت بھی ذکر کریں؟

۷.غیر دینی حقوقی قوانین میں، انسان کی کرامت اکتسابی مورد توجہ ہے یا اس کی غیر اکتسابی کرامت؟

۸.اگر حقیقی اہمیت کا معیار انسان کی کرامت اکتسابی ہے تو مجرم اور دشمن افراد کے علاوہ ان انسانوں کا ختم کرنا جو کرامت اکتسابی کے حامل نہ ہوں کیوں جائز نہیں ہے؟

۹.آیا جانشینی اور اعتباری خلافت، جانشین اور خلیفہ کی مہم ترین دلیل ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے

۱۔انسان کا جانشین خدا ہونے کے سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے رجوع کریں:

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۹) زن در آئینہ جلال و جمال. تہران: مرکز نشر فرہنگی، رجاء

۔.....(۱۳۷۲) تفسیر موضوعی قرآن، ج۶، تہران: رجاء

۔صدر، سید محمد باقر (۱۳۹۹) خلافۃ الانسان وشہادۃ الانبیاء، قم: مطبعۃ الخیام۔

۔محمد حسین طباطبائی (۱۳۶۳) خلقت وخلافت انسان در المیزان. گردآورندہ: شمس الدین ربیعی، تہران: نور فاطمہ.

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم: موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینیؒ۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۱) انسان کامل، تہران: صدرا۔

۔موسوی یزدی، علی اکبر، ودیگران (۱۳۹۹) الامامۃ والولایۃ فی القرآن الکریم، قم: مطبعۃ الخیام.

۔تفاسیر قرآن، سورہ بقرہ کی ۳۰ویں آیت کے ذیل میں۔

۲۔انسان کی کرامت کے سلسلہ میں:

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۲) کرامت در قرآن، تہران: مرکز نشر فرہنگی رجاء۔

۔مصباح، محمد تقی (۱۳۶۷) معارف قران (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم موسسہ در راہ حق

۔واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان از دیدگاہ اسلام۔قم: دفتر ہمکاری حوزہ ودانش گاہ۔

۷

آزادی اور اختیار

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات:

۱۔ انسان کے سلسلہ میں تین مہم نظریوں کو بیان کریں؟

۲۔ مفہوم اختیار کی وضاحت کریں اور اس کے مفہوم کے چار موارد استعمال ذکر کریں؟

۳۔ قرآن مجید کی ان آیات کی دستہ بندی اور تفسیر کریں جو انسان کے مختار ہونے پر دلالت کرتی ہیں؟

۴۔ انسان کے اختیار کو مشکوک کرنے والے شبہات کی وضاحت کریں؟

۵۔ انسان کے جبر سے متعلق، شبہات کے اقسام نیز اس کی تجزیہ و تحلیل کریں؟

جوافعال انسان سے صادر ہوتے ہیں ایک عام تقسیم کے اعتبار سے دوگروہ میں تقسیم ہوتے ہیں:
جبری افعال جو بغیر ارادے اور قصد کے انجام پاتے ہیں اور اختیاری افعال جو انتخاب اور انسان کے ارادوں کے نتیجہ میں عالم وجود میں آتے ہیں، دوسرے گروہ کے متعلق، فعل کا انجام دینے والا خود اس فعل کی علت اور اس فعل کا حصہ دار سمجھا جاتا ہے، اسی بنا پر اس انجام دیئے گئے فعل کے مطابق ہم اس کو لائق تعریف یا مذمت سمجھتے ہیں، تمام اخلاقی، دینی، تربیتی اور حقوقی قوانین اسی یقین کی بنیاد پر استوار ہیں۔ کسی فعل کو انجام دے کر خوش ہونا یا افسوس کرنا، عذر خواہی یا دوسرے سے مربوط فعل کے مقابلہ میں حق طلب کرنا بھی اسی سچائی پر یقین اور بھروسہ کی بنیاد پر ہے۔ دوسری طرف یہ بات قابل قبول ہے کہ انسان کے اختیاری طریقہ عمل میں مختلف تاریخی، اجتماعی، فطری، طبیعی عوامل موثر ہیں اس طرح سے کہ وہ اس کی انجام دہی میں اہم رول ادا کرتے ہیں اور انسان ہر پہلو میں بے قید و شرط اور مطلقاً آزادی کا حامل نہیں ہے۔

دینی تعلیمات میں قضا وقدر اور الٰہی ارادے اور غیب کا مسئلہ انسان کے اختیاری افعال سے مربوط ہے اور مذکورہ امور سے انسان کا ارادہ واختیار، نیز اس کا آزاد ہونا کس طرح ممکن ہے؟ اس کو بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ مسائل کو انسان کے بنیادی مسئلہ اختیار سے مربوط جاننا چاہیئے اور زندگی سنوارنا اس کرامت کو حاصل کرنا ہے جس کے بارے میں گذشتہ فصل میں گفتگو ہو چکی ہے (۱) انہیں چیزوں کی وجہ سے انسان کے اختیار کا مسئلہ مختلف ملتوں اور مختلف علمی شعبوں کے دانشمندوں اور ادیان و مذاہب کے مفکرین اور ماننے والوں کے درمیان ایک مہم اور سرنوشت ساز مسئلہ کے عنوان سے مورد توجہ قرار پایا ہے لہٰذا اس کے بارے میں مختلف سوالات اور بحث و مباحثہ کے علاوہ مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔

مندرجہ ذیل سوالات وہ ہیں جن کے بارے میں ہم اس فصل میں تجزیہ و تحلیل کریں گے۔

۱.اختیار سے مراد کیا ہے؟ آیا یہ مفہوم، مجبوری (اضطرار) اور ناپسندیدہ (اکراہ) کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے؟

۲.انسان کے مجبور یا مختار ہونے کے بارے میں قرآن کا کیا نظریہ ہے؟

۳.انسان کے اختیاری افعال میں قضا و قدر، اجتماعی قوانین، تاریخی، فطری نیز طبیعی عوامل کا کیا کردار ہے اور یہ سب باتیں انسان کے آزاد ارادہ سے کس طرح سازگار ہیں؟

۴.کیا علم غیب اور خدا کا عام ارادہ (ارادۂ مشیت) جو انسان کے اختیاری افعال میں بھی شامل ہے انسان کے مجبور ہونے کا سبب ہے؟

انسان کی آزادی کے سلسلہ میں تین مہم نظریات

انسان کے اختیار اور جبر کا مسئلہ بہت قدیمی ہے اور شاید یہ کہا جا سکتا ہے انسان کی آخرت

.....

(۱) گذشتہ فصل میں انسان کی کرامت اکتسابی کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ انسان کی کرامت اکتسابی اس کی اختیاری تلاش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی جو کچھ اس فصل میں اور آئندہ فصل میں بیان ہوگا، اس کا شمار کرامت اکتسابی کے اصول میں ہوگا اور انسان کے مسئلہ اختیار کے حل کے بغیر کرامت اکتسابی کا کوئی معنی و مفہوم نہیں ہے۔

کے مسئلہ کے بعد جبر واختیار کی بحث سے زیادہ انسان شناسی کے کسی مسئلہ کے بارے میں یوں گفتگو مختلف ملتوں اور مذاہب کے ماننے والوں اور معاشرہ کے مختلف قوموں کے درمیان چاہے وہ دانشمند ہوں یا عوام، رائج نہ تھی، پہلے تو یہ مسئلہ کلامی، دینی اور فلسفی پہلوؤں سے زیادہ مربوط تھا لیکن علوم تجربی کی خلقت ووسعت اور علوم انسانی کے باب میں جو ترقی حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ سے جبر واختیار کی بحث علوم تجربی سے بھی مربوط ہوگئی، اسی لئے علوم تجربی کی بحث میں مفکرین خصوصاً علوم انسانی کے ماہرین نے اپنے نظریات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ایک طرف تو اختیار، انسان کا ضمیر رکھنا اور بہت سی دلیلوں کا وجود اور دوسری طرف اختیاری افعال اور اس کے اصول میں بعض غیر اختیاری افعال کا موثر ہونا اور بعض فلسفی اور دینی تعلیمات میں سوء تفاہم کی بنا پر مختلف نظریات بیان ہوئے ہیں، بعض نے بالکل انسان کے اختیار کا انکار کیا ہے اور بعض لوگوں نے اختیار انسان کو تسلیم کیا ہے اور بعض لوگوں نے جبر واختیار کے ناکارہ ہونے کا یقین رکھنے کے باوجود دونوں کو قبول کیا ہے حالانکہ کوئی معقول توجیہ اس کے متعلق پیش نہیں کی ہے۔

رواقیان وہ افراد ہیں جو انسان کے اچھے یا برے ہونے کی ذمہ داری کو خود اسی کے اوپر چھوڑ دیتے ہیں۔اور دنیا کے تمام حوادث منجملہ انسان کے اختیاری افعال کو بھی انسان کے ذریعہ غیر قابل تغییر، تقدیر الٰہی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔

اسلامی سماج ومعاشرہ میں اشاعرہ نے جبر کے مسلک کو قبول کیا ہے۔(۱) اور معتزلہ نے

.....

(۱) اشاعرہ، جہمیہ کے برخلاف انسان کو اس کے اختیاری افعال میں جمادات کی طرح سمجھتے تھے اس یقین پر کہ انسان کا فعل، قدرت وارادۂ خدا سے مربوط ہونے کے باوجود خداوند عالم اپنے ارادہ اور قدرت کے ساتھ انسان کے اندر قدرت وارادہ ایجاد کرتا ہے اور اس فعل سے انسان کا ارادہ مربوط ہوتا ہے۔اور اس حقیقت (فعل سے انسان کے ارادہ کے مربوط ہونے) کو کسب کہا ہے۔لیکن ہر اعتبار سے انسان کے لئے تحقق فعل میں کسی تاثیر کے قائل نہیں ہیں ملاحظہ ہو: تھانوی، محمد علی؛ کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم؛ مکتبۃ لبنان ناشرون، بیروت: ۱۹۹۶۔

تفویض کو قبول کیا ہے اور ان لوگوں نے کہا ہے کہ انسان کے اختیاری افعال خداوند عالم سے الگ اس کی قدرت و انتخاب کی وجہ سے انجام پاتے ہیں (۱) اس نظریہ کے مشابہ دنیا کی تمام مخلوقات کے سلسلہ میں بعض مسیحی اور مغربی دانشمندوں کے نظریے بیان ہوئے ہیں۔ (۲)

اسلامی سماج اور معاشرہ میں تیسرا نظریہ، اہل بیتؑ اور ان کے ماننے والوں کا نظریہ ہے۔ اس نظریہ میں انسان اپنے اختیاری فعل میں نہ مجبور ہے اور نہ ہی آزاد بلکہ ان دونوں کے درمیان کی ایک حقیقت ہے: ''لا جَبرَ وَ لا تَفوِیضَ بَل أمرٌ بَینَ الأمرَین'' اس نظریہ کے مطابق انسان کے افعال میں نہ تنہا انسان کا خدا کے ساتھ فعال ہونے میں منافات نہیں ہے بلکہ خدا اور انسان کی صحیح شناخت کا تقاضا اور واقعی و اختیاری فعل کی حقیقت کو دقیق درک کرنا ہے۔

عقیدۂ جبر، اسلام سے پہلے عرب کے جاہل مشرکوں کے یہاں بھی موجود تھا اور قرآن مجید ایک غلط نظریہ کے عنوان سے نقل کرتے ہوئے اس فکر کے فرسودہ ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور فرماتا ہے:

﴿سَیَقُولُ الَّذِینَ أَشرَکُوا لَو شَاءَ اللّٰہُ مَا أَشرَکنَا وَ لا آبَاؤُنَا وَ لا حَرَّمنَا مِن شَیئٍ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِینَ مِن قَبلِهِم﴾ (۳)

عنقریب مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ، دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گذر چکے ہیں جھٹلاتے رہے

---

(۱) کہا گیا ہے کہ بعض معتزلہ کے علماء جیسے ابوالحسن بصری اور نجار، تفویض کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔

(۲) سنت مسیحیت میں خداوند عالم نے دنیا کو چھ روز میں خلق کیا ہے اور ساتویں روز آرام کیا ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد پر دنیا اس گھڑی کے مانند ہے جس میں خداوند عالم نے آغاز خلقت ہی میں چابھی بھر دیا ہے اور اس کے بعد دنیا خدا سے جدا اور مستقل ہو کر اپنی حرکت پر باقی ہے۔

(۳) سورہ انعام/۱۴۸۔

دوسری آیت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مشرکین کا اعتقاد ہر طرح کی علمی حمایت سے دور ہے اور یہ نظریہ فقط نصیحت پر مبنی ہے، یوں فرماتا ہے:

﴿وَ قَالُوا لَو شَاءَ الرَّحمٰنُ مَا عَبَدنَاهُم مَا لَهُم بِذٰلِکَ مِن عِلمٍ إن هُم إلا يَخرُصُونَ﴾(۱)

اور کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے ان کو اس کی کچھ خبر ہی نہیں یہ لوگ تو بس الٹی سیدھی باتیں کیا کرتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں جاہل عرب کے عقیدۂ جبر کا قرآن کے نازل ہونے اور اسلام کی سر سخت مخالفت کے بعد اس کا کوئی مقام نہیں رہا۔ اگر چہ کبھی کبھی اس سلسلہ میں بعض مسلمان، بزرگان دین سے سوالات کر کے جوابات حاصل کیا کرتے تھے (۲) لیکن حکومت بنی امیہ کے تین اموی خلفاء نے اسلامی شہروں میں اپنے ظلم کی توجیہ کیلئے عقیدۂ جبر کو رواج دیا اور اس نظریے کے مخالفین سے سختی سے پیش آتے رہے، ان لوگوں نے اپنے جبری نظریہ کی توجیہ کے لئے بعض آیات و روایات سے بھی استفادہ کیا تھا، تفویض کا نظریہ جو معتزلہ کی طرف سے بیان ہوا ہے عقیدہ جبر کے ماننے والوں کی سخت فکری و عملی مخالفت نیز عقیدۂ جبر کے مقابلہ میں یہ (تفویض کا نظریہ) ایک طرح کا عکس العمل تھا۔ جب کہ آیات و روایات اور پیغمبر نیز ان کے سچے ماننے والوں کی زندگی کا طرز عمل بھی مذکورہ دونوں نظریوں کی تائید نہیں کرتا ہے بلکہ اہل بیت کے نظریہ ''الأمر بين الأمرين'' سے مطابقت رکھتا ہے۔

.....

(۱) سورہ زخرف ۲۰۔ (۲) مثال کے طور پر امام علیؑ اس شخص کے جواب میں جس نے قضا و قدر الٰہی کو جبر سے ملا دیا تھا آپ نے فرمایا..... کیا تم گمان کر رہے ہو کہ (جو کچھ جنگ صفین میں اور دوران سفر میں ہم نے انجام دیا ہے) ہمارے اختیار سے خارج، حتمی اور جبری قضا و قدر تھا؟ اگر ایسا ہی ہے تو سزا و جزا، امر و نہی سب کچھ غلط اور بے وجہ ہے۔ صدوق، ابن بابویہ، التوحید، مکتبۃ الصدوق، تہران: ۱۳۷۸م، ص ۳۸۰۔

بہر حال اگر چہ عقلی، نقلی اور درونی (ضمیر) تجربہ کے ذریعہ انسان کے اختیار کا مسئلہ ایک غیر قابل انکار شی ہے جس پر بہت سے تجربی دلائل گواہ ہیں لیکن سیاسی اور بعض دینی و فلسفی تعلیمات سے غلط استفادہ اور اس سلسلہ میں بیان کئے گئے شبہات کے جوابات میں بعض فکری مکاتب کی ناتوانی کی بنا پر اسلامی معاشرہ کا ایک گروہ عقیدۂ جبر کی طرف مائل ہو گیا اور وہ لوگ اس کے معتقد ہو گئے (۱) البتہ یہ شی اسلامی معاشرہ سے مخصوص نہیں ہے دوسرے مکاتب فکر کے دانشمندوں کے درمیان اور متعدد غیر مسلم فرق و مذاہب میں بھی اس عقیدے کے حامی افراد موجود ہیں۔ (۲)

مفہوم اختیار

لفظ اختیار مختلف جہات سے مستعمل ہے یہاں انسان کے اختیار کے معنی کو روشن کرنے کے لئے جو کرامت اکتسابی کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے چار موارد ذکر کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ اضطرار اور مجبوری کے مقابلہ میں اختیار

کبھی انسان کسی خاص شرائط اور ایسے حالات و مقامات میں گھر جاتا ہے جس کی بنا پر مجبور ہو کر کسی عمل کو انجام دیتا ہے مثال کے طور پر ایک مسلمان بیابان میں گرفتار ہو جاتا ہے اور راستہ بھول جاتا ہے بھوک اور پیاس اسے اس حد تک بے چین کر دیتی ہے جس کی وجہ سے اس کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے لیکن ایک مردار کے علاوہ اس کے سامنے کوئی غذا نہ ہو تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے مجبوراً اس حیوان کے گوشت کو اتنی ہی مقدار میں استعمال کر سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ موت سے نجات حاصل کر سکے، اس مقام پر کہا جائے گا کہ اس شخص نے اپنی خواہش اور اختیار سے مردار گوشت نہیں کھایا ہے بلکہ وہ مجبور تھا اور اضطرار کی وجہ سے مردار کے گوشت کو مصرف کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید اس کی غذا

.....

(۱) اس سلسلہ میں مغربی مفکرین و فلاسفہ کے نظریات کو ہم ''ضمائم'' میں بیان کریں گے۔

(۲) انسانی علوم تجربی کے بعض غیر مسلم مفکرین و فلاسفہ کے نظریات ''ضمائم'' میں بیان ہوں گے۔

کے جائز ہونے کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿إنَّمَا حَرَّمَ عَلَيكُمُ المَيتَةَ وَ... فَمَنِ اضطُرَّ غَيرَ بَاغٍ وَ لا عَادٍ فَلا إِثمَ عَلَيهِ﴾(۱)

اس نے تو تم پر بس مردہ جانور اور... لہٰذا جو شخص مجبور ہو اور سرکشی کرنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ ہو تو اس پر گناہ نہیں ہے۔

۲.۱ اکراہ کے مقابلہ میں اختیار

کبھی خود انسان کسی کام کے انجام دینے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے یا کسی کام سے نفرت کرتا ہے لیکن ایک دوسرا شخص اس کو ڈراتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق اس کام کو انجام دینے کے لئے مجبور کرتا ہے اس طرح کہ اگر اس شخص کا خوف نہ ہوتا تو وہ اس فعل کو انجام نہ دیتا اس مسلمان کی طرح جو اسلام کے دشمنوں کی طرف سے قتل ہو جانے کے خوف کی بنا پر ظاہر میں زبان سے اظہار کفر کرتا ہے، اس مقام پر کہا جاتا ہے کہ اس نے بااختیار اس عمل کو انجام نہیں دیا، جیسا کہ سورہ نحل کی ۱۰۶ویں آیہ میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں:

﴿مَن كَفَرَ بِاللّٰهِ مِن بَعدَ إِيمَانِهِ إلا مَن أُكرِهَ وَ قَلبُهُ مُطمَئِنٌّ بِالإِيمَانِ﴾

جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے سوائے اس شخص کے جو اس عمل پر مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو۔(۲)

اضطرار سے اکراہ کا فرق یہ ہے کہ اکراہ میں دوسرے شخص کا خوف زدہ کرنا بیان ہوتا ہے جب کہ اضطرار میں ایسا نہیں ہے بلکہ خارجی حالات اور وضعیت اس عمل کی متقاضی ہوتی ہے۔

.....

(۱) سورہ بقرہ ۱۷۳۔

(۲) سورہ نحل/۱۰۶۔

۳.اختیار یعنی انتخاب وآزمائش کے بعد ارادہ

جب بھی انسان کے سامنے کسی کام کے انجام دینے کے لئے متعدد راہیں ہوں تو وہ اس کا تجزیہ کرتا ہے اسے خوب پرکھتا ہے اس کے بعد ایک راہ کو انتخاب کرتا ہے اور اسی کے مطابق اس فعل کے انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ کام اختیار کے ساتھ انجام پایا ہے لیکن اگر کوئی کام سوچے سمجھے بغیر انتخاب اور اس کا ارادہ کرلیا گیا تو کہا جائے گا کہ یہ فعل غیر اختیاری طور پر سرزد ہوا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس شخص کے ہاتھ میں رعشہ ہو اور اس کا ہاتھ حرکت دینے کے ارادہ کے بغیر ہی لرز رہا ہو۔

۴.اختیار یعنی رغبت، محبت اور مرضی کے ساتھ انجام دینا

اس استعمال میں آزمائش اور انتخاب کی ضرورت نہیں ہے بلکہ کسی فعل میں صرف اکراہ اور مجبوری نہ ہو اور وہ فعل کسی کی رضایت اور خواہش کے ساتھ انجام پائے تو اس فعل کو اختیاری کہا جاسکتا ہے، خدا اور فرشتوں کے افعال میں اسی طرح کا اختیار ہے، اس معنی کے مطابق خداوند عالم اور فرشتوں کے افعال، اختیاری ہیں البتہ ان کی طرف سے کسی کام کے انجام پانے کے لئے آزمائش اور انتخاب کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے مثال کے طور پر خداوند عالم اپنے کام کے انجام دینے میں تجزیہ وتحلیل اور انتخاب کی حاجت نہیں رکھتا ہے اور اس کیلئے کسی بھی شئ میں ایسا ارادہ جو پہلے نہ رہا ہو تصور نہیں ہوتا ہے چنانچہ مختار ہونے کا یہ معنی ہے کہ خواہش، رغبت اور فاعل کی خود اپنی مرضی سے وہ فعل انجام پائے۔(۱)

(۱) افعال انسان کے اختیاری ہونے کو اس کے ارادہ سے ملانا نہیں چاہیئے، کسی فعل کے ارادی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس ارادہ سے پہلے ایک ارادہ ہو اور وہ فعل بھی ارادہ سے پہلے ہو لیکن اختیاری ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس فعل کے صدور میں حقیقی عامل کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود وہ شخص ہے۔اس بیان کے مطابق خود ارادہ انسان کے لئے بھی ایک اختیاری فعل موجود ہے اگر چہ وہ ایک ارادی فعل نہیں ہے یعنی ارادہ کرنے کے لئے کسی سابق ارادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس وضاحت سے ارادہ واختیار میں موجود اہم اعتراض کا جواب واضح ہو جاتا ہے، اس اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ اگر ہر اختیاری فعل سے پہلے ایک ارادہ کا ہونا ضروری ہے تو خود ارادہ کرنا بھی تو ایک نفسیاتی فعل ہے لہٰذا اس سے پہلے...

مذکورہ چار معانی میں سے جو انسان کے اختیاری کاموں میں مورد نظر ہے نیز کرامت اکتسابی کے حاصل کرنے کا طریقۂ عمل بھی ہے وہ تیسرا معنی ہے۔ یعنی جب بھی انسان متعدد موجودہ راہوں اور افعال کے درمیان تجزیہ و تحلیل کے ذریعہ کسی کام کو انتخاب کرلے اور اس کے انجام کا ارادہ کرلے تو اس نے اختیاری فعل انجام دیا ہے اور اپنی اچھی یا بری سرنوشت کی راہ میں قدم بڑھایا ہے، اس لئے تجزیہ و تحلیل، انتخاب اور ارادہ، اختیار انسان کے تین بنیادی عنصر شمار ہوتے ہیں، البتہ منتخب فعل لازمی طور پر انسان کے رغبت اور ارادہ کے مخالف نہیں ہے یہ ہوسکتا ہے کہ خود بخود وہ فعل انسان کے لئے محبوب و مطلوب ہو اس شخص کی طرح جو خدا کی عبادت اور راز و نیاز کا عاشق ہے اور نیمۂ شب میں با اشتیاق بستر خواب سے بلند ہوتا ہے اور نماز شب پڑھتا ہے یا اس شخص کی طرح جس کے پاس موسم گرما میں تھوڑا سا ٹھنڈا اور میٹھا پانی موجود ہے جس سے ہاتھ اور چہرہ دھلنا اس کے لئے لذت بخش ہے لیکن ظہر کے وقت اسی پانی سے وضو کرتا ہے، مطلوب اور اچھا فعل اگر معرفت اور ارادہ کے ہمراہ ہو تو ایک اختیاری فعل اور کرامت اکتسابی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، قدرت انتخاب نہ رکھنے والے جمادات اور فرشتوں میں جن کے سامنے متعدد راہیں نہیں ہوتیں اور غیر ترقی یافتہ انسان میں جو ابھی قدرت انتخاب سے مزین نہیں ہے، اس کے لئے ایسے انتخاب کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔(۱)

انسان کے مختار ہونے پر قرآنی دلیلیں

گذشتہ مفہوم کے مطابق انسان کا اختیار قرآن کی نظر میں بھی مورد تائید ہے اور بہت سی

...بھی ایک ارادہ ہونا چاہیئے اور یہ تسلسل باقی رہے گا اور یہ محال ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ارادہ کوئی ارادی فعل نہیں ہے اور ضروری نہیں ہے کہ اس کے پہلے بھی ایک ارادہ ہو بلکہ یہ ایک اختیاری فعل ہے اور ارادہ و اختیار میں بہت فرق ہے، چونکہ حقیقی عامل و سبب نفس انسان ہے اور اس میں کوئی اضطرار و مجبوری نہیں ہے لہذا فعل اختیاری ہے چاہے اس کے پہلے کوئی ارادہ نہ رہا ہو۔

(۱) اختیار کی تعریف کے اعتبار سے، چاہے بہت کم مقدار ہی میں کیوں نہ ہو کیا حیوانات اختیار رکھتے ہیں؟ اس میں اختلاف نظر ہے لیکن بعض آیات کے ظواہر اور بعض تجربی شواہد بہت معمولی مقدار میں ان کے اختیار کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔

آیات بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں، ان میں سے چار طرح کی آیات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے

۱۔ وہ آیات جو بہت ہی واضح طور پر انسان کے اختیار کو بیان کرتی ہیں:

﴿وَ قُلِ الحَقُّ مِن رَّبِّکُم فَمَن شَاءَ فَلیُؤمِن وَ مَن شَاءَ فَلیَکفُر﴾(۱)

اور تم کہدو کہ سچی بات (قرآن) تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے۔

۲۔ وہ آیات جو اتمام حجت کے لئے پیغمبروں کے بھیجنے اور آسمانی کتب کے نزول کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں:

﴿لِیَھلِکَ مَن ھَلَکَ عَن بَیِّنَةٍ وَ یَحیَیٰ مَن حَیَّ عَن بَیِّنَةٍ ﴾(۲)

تا کہ جو شخص ہلاک ہو وہ حجت تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ ہدایت کی حجت تمام ہونے کے بعد زندہ رہے۔

﴿رُسُلاً مُّبَشِّرِینَ وَ مُنذِرِینَ لِئَلا یَکُونَ لِلنَّاسِ عَلَیٰ اللّٰہِ حُجَّةٌ بَعدَ الرُّسُلِ﴾

بشارت دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر (بھیجے) تا کہ لوگوں کی خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔(۳)

۳۔ وہ آیات جو انسان کے امتحان اور مصیبت میں گرفتار ہونے پر دلالت کرتی ہیں:

﴿إِنَّا جَعَلنَا مَا عَلَیٰ الأَرضِ زِینَةً لَّھَا لِنَبلُوَھُم أَیُّھُم أَحسَنُ عَمَلاً﴾

جو کچھ روئے زمین پر ہے ہم نے اسے زینت قرار دیا ہے تا کہ ہم لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں سے کون سب سے اچھے اعمال والا ہے۔(۴)

.....

(۱) سورہ کہف ۲۹ (۲) سورہ انفال ۴۲

(۳) سورہ نساء ۱۶۵

(۴) سورۂ کہف ۷

۴.وہ آیات جو بشیر ونذیر، وعدووعید، تعریف ومذمت اوراس کے مثل کی طرف اشارہ کرتی ہیں اسی وقت فائدہ منداور مفید ہوں گی جب انسان مختار ہو۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِينَ وَ الْمُنَافِقَاتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا﴾

منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے خدا نے جہنم کی آگ کا وعدہ کرلیا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔(۱)

عقیدۂ جبر کے شبہات

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ انسان کا مختار اور وجدانی ہونا عقلی نقلی دلیلوں کے علاوہ تجربی شواہد سے بھی ثابت اور مورد تائید ہے لیکن کسی بنا پر (منجملہ بعض شبہات کی وجہ سے جو انسان کے اختیار کے بارے میں بیان ہوئے ہیں) بعض لوگ جبر کے قائل ہیں یہاں ہم ان شبہات کا تجزیہ کریں گے۔

جبر الٰہی

مذکورہ شبہات میں سے ایک شبہہ جبر الٰہی ہے، تاریخ اسلام میں ایک گروہ کو "مجبرہ" کہتے ہیں یہ گروہ معتقد تھا کہ دینی تعلیمات کے ذریعہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان اپنے اختیاری افعال میں مجبور ہے، جبر الٰہی کے ماننے والوں کی استناد اوران کے دینی بیانات کو تین دستوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا گروہ

وہ آیات وروایات جو علم غیب کے بارے میں ہیں، ان میں مذکور ہے کہ خداوند عالم، انسان کے افعال اختیاری کے انجام پانے سے پہلے ان افعال اوران کے انجام پانے کی کیفیت سے آگاہ ہے اورانسانوں کی خلقت سے پہلے وہ جانتا تھا کہ کون انسانِ صالح وسعادت مند ہے اور کون براو بدبخت ہے اور یہ حقائق لوح محفوظ نامی کتاب میں ثبت ہیں جیسے:

.....

(۱) سورۂ توبہ ۶۸

﴿وَ مَا یَعزُبُ عَن رَّبِّکَ مِن مِّثقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الأرضِ وَ لا فِی السَّمَاءِ وَ لا أَصغَرَ مِن ذٰلِکَ وَ لا أَکبَرَ إلا فِی کِتَابٍ مُّبِینٍ﴾(۱)

اورتمہارے پروردگار سے ذرہ بھر بھی کوئی چیز غائب نہیں رہ سکتی نہ زمین میں اور نہ ہی آسمان میں چھوٹی، بڑی چیزوں میں سے کوئی ایسی نہیں ہے مگر وہ روشن کتاب میں ضرور ہے۔

دوسرا گروہ

وہ آیات وروایات جو یہ بیان کرتی ہیں کہ انسان کے افعال خدا کے ارادہ اور اس کی طرف سے معینہ حدود میں انجام پاتے ہیں جیسے وہ آیات جو ہر شی کے تحقق منجملہ انسان کے اختیاری اعمال کو خدا کی اجازت، مشیت، ارادہ نیز قضاوقدر الٰہی کا نتیجہ سمجھتی ہیں جیسے یہ آیات:

﴿وَ مَا کَانَ لِنَفسٍ أَن تُؤمِنَ إلا بِإِذنِ اللّٰہِ﴾(۲)

کسی شخص کو یہ اختیار نہیں ہے کہ بغیر اذن خدا ایمان لے آئے

﴿مَن یَشَأ اللّٰہُ یُضلِلہُ وَ مَن یَشَأ یَجعَلہُ عَلَیٰ صِرَاطٍ مُّستَقِیمٍ﴾(۳)

اللہ جسے چاہے اسے گمراہی میں چھوڑ دے اور جسے چاہے اسے سیدھے راستہ پر لادے

﴿ وَ مَا تَشَاءُ ونَ إلا أَن یَشَاءَ اللّٰہُ ﴾(۴)

اورتم لوگ وہی چاہتے ہو (انجام دینا) جو خدا چاہتا ہے۔

پس انسان اس وقت ایمان لاتا ہے اور صحیح وغلط راستہ اختیار کرتا ہے یا کسی کام کو انجام دے

---

(۱) سورۂ یونس/۶۱

(۲) یونس/۱۰۰

(۳) انعام/۳۹

(۴) تکویر/۲۹۔

سکتا ہے جب خدا کی مرضی شامل حال ہو ایک روایت میں امام علی رضاؑ سے بھی منقول ہے کہ: ''لا یکون إلا مَاشَاء اللّه وَ أرَاد وَ قدّر وَ قضیٰ''(۱) کوئی بھی چیز بغیر خدا کی مرضی وارادہ نیز قضاو قدر کے متحقق نہیں ہوتی ہے۔

تیسرا گروہ

وہ آیات وروایات جو بیان کرتی ہیں کہ: انسانوں کی اچھی اور بری فطرت پہلے ہی سے آمادہ ہے فقط طبیعت مختلف ہے۔ بعض انسانوں کی فطرت اچھی ہے اور وہ اسی اعتبار سے ہدایت پاتے ہیں اور بعض دوسرے انسانوں کی فطرت بری ہے جس کی بنا پر گمراہ ہوجاتے ہیں جیسے دو آیتیں ﴿کَلاّ إنَّ کِتَابَ الفُجَّارِ لَفِی سِجِّینٍ﴾(۲) ﴿کَلاّ إنَّ کِتَابَ الأبرَارِ لَفِی عِلّیِّینَ﴾(۳) بیان کرتی ہیں کہ: اچھے لوگوں کی سرنوشت بلند مقام (عِلّیِّینَ) اور برے افراد کی سرنوشت پست مقام (سِجِّینِ) بتائی گئی ہے جیسا کہ مختلف احادیث بیان کرتی ہیں کہ: اچھے انسانوں کی فطرت میٹھے پانی اور برے افراد کی فطرت تلخ پانی سے تخلیق ہوئی ہے نیز ان احادیث میں سے بعض احادیث میں آیا ہے کہ: ''الشَقِی مَن شقیٰ فِی بطنِ أمهِ و السعِید مَن سَعد فِی بطنِ أمهِ''(۴) بد بخت وہی ہے جو شکم مادر میں بد بخت ہے اور سعادت مند وہی ہے جو شکم مادر ہی سے سعادت مند ہے۔

جبر الٰہی کی تجزیہ وتحلیل

پہلے گروہ کے شبہہ کا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم کا کسی شخص کے اچھے یا برے فعل کے انجام

.....

(۱) کلینی، محمد بن یعقوب؛ اصول کافی، ج۱، دار الکتب الاسلامیہ، تہران: ۱۳۴۸، ص ۱۵۸۔

(۲) مطففین/۷۔

(۳) مطففین/۱۸ (۴) مجلسی، محمد باقر؛ بحار الانوار؛ دار الکتب الاسلامیہ، تہران: ۱۳۶۳۔

دینے کا علم، اس فعل کے عالم خارج میں بغیر کسی قید و شرط کے انجام پانے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس فعل کو تمام قیود اور شرائط کے ساتھ انجام دینے کے معنی میں ہے، منجملہ انسان کے اختیاری افعال میں یہ قیود، فعل کو پرکھنا، انتخاب کرنا اور ارادہ کے ذریعہ انجام دینا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کسی کام کے انجام پانے کے بارے میں خدا کا علم، جبر اور اختیار دونوں سے سازگار ہے اس لئے کہ اگر خدا جانتا ہے کہ یہ کام جبر کی بنا پر اور فاعل کے ارادہ کے بغیر انجام اور صادر ہوا ہے جیسے اس شخص کے ہاتھ کی لرزش جسے رعشہ ہو، تو ظاہر ہے وہ فعل جبری ہے لیکن اگر خدا یہ جانتا ہے کہ فاعل نے اس کام کو اپنے اختیار اور ارادہ سے انجام دیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ فعل اختیاری ہے اور فاعل مختار ہے جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کے اختیاری افعال میں کام کے انجام پانے کی ایک شرط اور قید، انسان کا اختیار ہے، اسی بنا پر خدا جانتا ہے کہ انسان مختار ہے اور اس کام کو اپنی مرضی اور اختیار سے انجام دے رہا ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ جبر الٰہی کے معتقدین نے یہ تصور کیا ہے کہ چونکہ خداوند عالم فعل کے صادر ہونے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ ہم کیا کریں گے لہٰذا ہم مجبور ہیں، جب کہ یہ تصور بھی غلط ہے اور ہمیں خود سے خدا کا تقابل نہیں کرنا چاہیئے، خداوند عالم لامحدود اور زمان و مکان سے بالاتر ہے اس کے لئے ماضی، حال و مستقبل کا تصور نہیں ہے۔ مادی مخلوقات اگرچہ زمانہ کے ہمراہ ہیں اور اپنے اور دوسرے کے ماضی و مستقبل کے حالات سے جاہل و بے خبر ہیں اور دھیرے دھیرے ان کے لئے حوادث واقع ہوتے ہیں، لیکن اس خدا کے بارے میں جو زمان و مکان سے بالاتر ہے اس کے لئے حرکت و زمان کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور یہ کائنات اس کے لئے پوری طرح سے آشکار ہے، گذشتہ اور آئندہ کے حوادث کے بارے میں خداوند عالم کا علم ہمارے حال اور موجودہ حوادث کے بارے میں علم رکھنے کی طرح ہے وہ کاروان ہستی اور سلسلۂ حوادث کو ایک ساتھ اور ایک ہی دفعہ میں مشاہدہ کرتا ہے، غرض یہ کہ کسی چیز کے متحقق ہونے سے پہلے اور متحقق ہونے کے وقت، اور متحقق ہونے کے

بعد کا علم اس کے لئے متصور نہیں ہے، بہر حال جس طرح اس شخص کے بارے میں ہمارا علم جو ہمارے ہی سامنے اچھا کام کرتا ہے اس کے مجبور ہونے کا سبب نہیں بنتا ہے اسی طرح خدا کا علم (ہمارے اعتبار سے اس اچھے کام کے متحقق ہونے سے پہلے) بھی اس شخص کے مجبور ہونے کا سبب نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ کی وضاحت میں (قدر، قضا، مشیت اور ارادۂ خدا کی آیات وروایات میں) قابل ذکر یہ ہے کہ قدر چاہے انسان کے اختیاری افعال یا غیر اختیاری افعال میں ہو ضروری شرائط فراہم ہونے کے معنی میں ناکافی ہے اور قدر کے متحقق ہونے سے فعل حتمی اور قطعی متحقق نہیں ہوتا ہے بلکہ تمام شرائط کے فراہم ہونے کی بنا پر حتماً متحقق ہوتا ہے اس لئے انسان کے اختیاری افعال میں قدر یعنی کسی فاعل سے فعل کا حتمی صادر ہونا اور واقع ہونا، جبر کا لازمہ نہیں ہے اس لئے کہ اگر کسی فعل کے صدور کے لئے علت ناقصہ (نہ کہ تامہ) فراہم ہوئی ہے تو صدور فعل حتمی نہیں ہے کہ اس فعل کے سلسلہ میں اختیاری یا جبری ہونے کے بارے میں بحث کیا جائے اور اگر صدور فعل کے تمام شرائط فراہم ہوں اور فقط فاعل نے قصد نہ کیا ہو تو معلوم ہوا کہ فاعل کا قصد ایک دوسری شرط ہے جو فعل کے حتمی متحقق ہونے کے لئے ضروری ہے اور اس صورت میں فعل اختیاری ہوگا۔

قضائے الٰہی

جو قدر کے مقابلہ میں ایک فعل کے متحقق ہونے کے لئے کافی اور ضروری شرائط کے فراہم ہونے کے معنی میں ہے وہ بھی انسان کے اختیار سے منافات نہیں رکھتا ہے اس لئے کہ قضائے الٰہی اس وقت متحقق ہوتی ہے جب کسی کام کے تحقق پانے کے تمام شرائط جن میں سے ایک انسان کا ارادہ بھی ہے فراہم ہو جائے. اور اختیاری افعال میں انسان کے قصد وارادہ کے بغیر قضائے الٰہی انسان کے اختیاری افعال میں متحقق نہیں ہوتا ہے. لہذا قضاء الٰہی بھی انسان کے اختیار سے سازگار ہے.

مشیت، ارادہ اور اذن خدا کو بیان کرنے والی آیات وروایات جو دلالت کرتی ہیں کہ جو بھی فعل انسان انجام دیتا ہے اس کی اجازت اور ارادہ سے متحقق ہوتا ہے اور جس کا خدا نے ارادہ کیا ہے

انسان اس کے علاوہ انجام نہیں دیتا ہے یہ مطلب بھی انسان کے اختیار سے سازگار ہے، اس لئے کہ ان آیات وروایات میں مراد یہ نہیں ہے کہ انسان کا ارادہ خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں اور خدا کے ارادہ اور اجازت کے سامنے قرار پاتا ہے یعنی ہمارے ارادہ کرنے اور اپنے کام کو انجام دینے کے بجائے خدا ارادہ کرے اور اسے انجام دے اور ہم نے کوئی ارادہ نہ کیا ہو یا فعل کے تحقق میں ہمارا ارادہ مؤثر نہ ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے انجام میں مستقل اور خدا سے بے نیاز نہیں ہیں اور مزید یہ کہ کسی بھی فعل کے انجام دینے میں ہمارا قصد اور ارادہ مؤثر ہے، اور طول میں خدا کی اجازت، قصد اور ارادہ موثر ہے. دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ خدا چاہتا ہے کہ ہمارے افعال ہمارے ہی اختیار سے انجام پائیں اس لئے کہ اگر وہ نہ چاہے تو ہم کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتے یا ہمارا ارادہ اثر انداز نہیں ہوتا ہے.(۱)

خدا کے فعّال ہونے کا راز

قرآن نے (تفویض) نام کے غلط نظریہ کی نفی کے لئے خدا کے ارادے کی بہت زیادہ تاکید کی ہے اس نظریہ والوں کا یقین یہ تھا کہ خدا نے دنیا کو خلق کیا اور اسکو اسی کے حال پر چھوڑ کر خود آرام کر رہا ہے یا دنیا خلق ہونے کے بعد اس کی قدرت اختیار سے خارج ہوگئی ہے اور اس میں خدا کا کوئی نقش وکردار نہیں ہے انسان کے سلسلہ میں یعنی خداوند عالم فقط آغاز آفرینش میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور جب انسان کی تخلیق ہوگئی تو پھر انسان پوری طرح خلاق وفعال ہے اور خداوند عالم (نَعُوذُ بِاللّٰہِ) بیکار ہے۔ خدا یہ کہنا چاہتا ہے کہ: ایسا نہیں ہے بلکہ تم اپنے ارادہ سے جو یہ کام انجام دے رہے ہو یہ بھی میری خواہش سے ہے قرآن مجید میں فرماتا ہے:

.....

(۱) مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: محمد حسین طباطبائی؛ المیزان فی تفسیر القرآن؛ ج۱، ص۹۹، محمد تقی مصباح؛ معارف قرآن (خداشناسی، کیھان شناسی، انسان شناسی) ص۲۸۱، ۲۸۲

﴿وَقَالَتِ الیَهُودُ یَدُ اللهِ مَغلُولَةٌ﴾ یہودی کہتے ہیں خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے خداوند عالم فرماتا ہے ایسا نہیں ہے ﴿بَل یَدَاهُ مَبسُوطَتَانِ﴾ (۱) اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں یعنی خدا پوری طرح سے اختیار رکھتا ہے اور فعّال ہے آیات تاکید کرتی ہیں کہ یہ گمان نہ کرنا کہ اگر انسان اپنے اختیار سے فعل انجام دے رہا ہے تو خداوند عالم بیکار ہے.

دنیا اور خدا کا رابطہ گھڑی اور اس شخص کے رابطہ کی طرح ہے جو گھڑی کو چابی دیتا ہے ایسا نہیں ہے کہ دنیا گھڑی کی طرح چابی دینے کے بعد خود حرکت کرے اور کسی چابی دینے والے کی محتاج نہ ہو بلکہ یہ خداوند عالم ہے جو دنیا کو ہمیشہ چلانے والا ہے ﴿کُلَّ یَومٍ هُوَ فِی شَأنٍ﴾ (۲) کہ وہ ہر وقت فعّال ہے. انسان بھی دنیا کے حوادث سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ مشمول تدبیر وتقدیر الٰہی ہے. حتی کہ انسان آخرت میں بھی مشیت وارادۂ خدا سے خارج نہیں ہے. جیسا کہ سورہ ہود کی ۱۰۸ ویں آیہ جو ظلم کر کے ظالمانہ طور پر جہنم میں اور خوش بختی کے ساتھ بہشت میں ورود کو بیان کرنے کے بعد دونوں گروہوں کے بارے میں فرماتی ہے:

﴿خَالِدِینَ فِیهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوَاتُ وَ الأرضُ إلا مَاشَاءَ رَبُّکَ﴾

جب تک آسمان وزمین ہے وہ ہمیشہ اسی (جنت یا جہنم) میں رہیں گے مگر جب تیرا پروردگار چاہے۔

ان دو عبارتوں میں ''لوگ ہمیشہ ہونگے'' اور ''جب تک دنیا باقی ہے'' پر توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ مراد یہ نہیں ہے کہ کسی وقت خداوند عالم خوشبختوں یا ظالموں کو بہشت اور جہنم سے نکالے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ کہیں یہ تصور نہ ہو کہ یہ موضوع قدرت خدا کے حدود سے خارج ہوگیا ہے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے کیونکہ اگر ایسا ہی ہوگا تو خداوند عالم اپنی مخلوق کا محکوم واقع ہوجائے گا۔

.....

(۱) سورہ مائدہ/۶۴۔ (۲) سورۂ رحمٰن/۲۹۔

تیسرے گروہ کی روایات کے سلسلہ میں یعنی وہ روایات جو فطرت انسان کو بیان کرتی ہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ روایات تقاضوں کو بیان کر رہی ہیں علت تامہ کو بیان نہیں کر رہی ہیں یعنی جو لوگ پیدا ہو چکے ہیں ان میں سے بعض کی فطرت گناہ اور ویرانی کی طرف رغبت کا تقاضا کرتی ہے اور بعض افراد کی فطرت اچھائی کی طرف رغبت رکھتی ہے جیسے وہ نوزاد جو زنا سے متولد ہوا ہو اس بچہ کے مقابلے میں جو صالح باپ سے متولد ہوا ہے گناہ کی طرف زیادہ رغبت رکھتا ہے لیکن کسی میں بھی جبر نہیں ہے.

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اچھے یا برے ہونے میں فطرت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ خداوند عالم پہلے سے جانتا ہے کہ کون اپنے اختیار سے صحیح راہ اور کون بری راہ انتخاب کرے گا اسی لئے پہلے گروہ کو اچھی طینت اور دوسرے کو بری طینت سے خلق کیا ہے۔

اس کی مثال ایک باغبان کی طرح ہے جو تمام پھولوں کو اسکی قیمت اور رشد و بالیدگی کے مطابق ایک مناسب گلدان میں قرار دیتا ہے. گلدان پھولوں کے اچھے یا برے ہونے میں تاثیر نہیں رکھتا ہے اسی طرح طینت بھی فقط ایک ظرف ہے جو اس روح کے مطابق ہے جسے اپنے اختیار سے اچھا یا برا ہونا ہے طینت وہ ظرف ہے جو اپنے مظروف کے اچھے یا برے ہونے میں اثر انداز نہیں ہوتا دوسرا جواب بھی دیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس کے لئے فلسفی مقدمات ضروری ہیں لہٰذا اس سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔(۱)

ب) اجتماعی اور تاریخی جبر

اجتماعی اور تاریخی جبر کا عقیدہ بعض فلاسفہ اور جامعہ شناسی کے ان گروہ کے درمیان شہرت رکھتا ہے جو جامعہ اور تاریخ کی اصالت پر زور دیتے ہیں ان کے عقیدہ کے مطابق کسی فرد کی

.....

(۱) ''ضمائم'' کی طرف رجوع کریں۔

معاشرے اور تاریخ سے الگ کوئی حقیقت نہیں ہے. معاشرہ اور تاریخ ایک باعفت وجود کی طرح اپنے تمام افراد کی شخصیت کو مرتب کرتے ہیں لوگوں کا تمام فکری (احساس) اور افعالی شعور، تاریخ اور معاشرے کے تقاضہ کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں اور انسان اپنی شخصیت کو بنانے میں ہر طرح کے انتخاب اور اختیار سے معذور ہے نمونہ کے طور پر ہگل مارکس، اور ڈورکھیم کے نظریوں کو ذکر کیا جاسکتا ہے. ہگل جو تاریخ کے لئے ایک واقعی حقیقت کا قائل ہے معتقد تھا کہ تاریخ صرف تاریخی حوادث یا سادہ سلسلۂ عبرت کے لئے ہے کہ جس کی نظری اور فکری تجزیہ وتحلیل نہیں ہوتی، اس کی نظر میں گوہر تاریخ، عقل ہے (اس کا نظریہ اسی مفہوم کے اعتبار سے ہے) اور تاریخی ہر حادثہ اس کے مطابق انجام پاتا ہے، تاریخ ساز افراد، مطلق تاریخ کی روح کے متحقق ہونے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور بغیر اس کے کہ خود آگاہ ہوں اس راہ میں قدم بڑھاتے ہیں۔ (۱) مارکس کا نظریہ تھا کہ انسان کا ہر فرد تاریخ اور معاشرہ کا نتیجہ ہے. تمام انسانی افعال تہذیت وثقافت، مذہب، ہنر، اجتماعی افراد کے علاوہ تمام چیزیں معاشرہ پر پھیلے ہوے اقتصادی روابط پر مبنی ہیں. (۲) اس لئے انسان کے ہر فرد کی آمادگی کا تنہا حاکم اس کے معاشرے پر حاکم اقتصادی روابط کو سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ اقتصادی روابط زمانہ کے دامن میں متحول ہوتے رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں معاشرہ متحول ہوتا ہے اور معاشرے کے معقول ہونے سے انسانوں کی شخصیت، حقیقت، تہذیب وثقافت اور اس کے اعتبارات بھی متحول ہوجاتے ہیں. ڈورکھیم اس جبر کی روشنی میں ''نظریہ آئیڈیا'' کی طرف مائل ہوا ہے کہ انسان ایک فردی واجتماعی کردار رکھتا ہے. اور اس کا اجتماعی نقش ارادوں، خواہشوں، احساسات اور تمام افراد کے عواطف کے ملنے اور ان کے ظاہر ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور یہی روح معاشرہ ہے۔

.....

(۱) بعض فلاسفۂ تاریخ بھی معمولاً تاریخ کے لئے ایسے اعتبارات، قوانین اور مراحل مانتے ہیں جو غیر قابل تغیر ہیں اور انسانوں کے ارادے، خواہشات، جستجو اور معاشرے انہیں شرائط وحدود میں مرتب ہوتے ہیں (۲) البتہ مارکس کا ''اجتماعی جبر'' فیورنیچ اور ہگل کے تاریخی جبر کی آغوش سے وجود میں آیا ہے۔

اور یہ روح اجتماعی بہت قوی ہے جو افراد کے وجودی ارکان پر مسلط ہے شخصی اور فردی ارادہ اس کے مقابلے میں استادگی کی توانائی نہیں رکھتا ہے. وہ افراد جو اس روح اجتماعی کے تقاضوں کے زیر اثر ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو چیزیں سماج اور معاشرہ نے انسان کو دیا ہے اگر وہ اس کو واپس کر دے تو حیوان سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

اجتماعی اور تاریخی جبر کی تجزیہ و تحلیل

پہلی بات: سماج اور تاریخ کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ یہ مرکب اعتباری ہیں جو افراد کے اجتماعی اور زمان و مکان کے دامن میں انکے روابط سے حاصل ہوتے ہیں اور وہ چیزیں جو وجود رکھتی ہیں وہ ہر فرد کے روابط اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں عمل و ردعمل کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔

دوسری بات: ہم اجتماعی و تاریخی عوامل، اقتصادی روابط جیسے، اعتبارات، آداب و رسوم اور تمام اجتماعی و تاریخی عناصر کی قدرت کے منکر نہیں ہیں اور ہمیں افراد کی شخصیت سازی کی ترکیبات میں ان کے نقش و کردار سے غافل بھی نہیں ہونا چاہئے. لیکن اجتماعی اور تاریخی عوامل میں سے کوئی بھی انسان کے اختیار کو سلب کرنے والے نہیں ہیں اگر چہ معاشرہ زمان و مکان کی آغوش میں اپنے مخصوص تقاضے رکھتا ہے اور انسان سے مخصوص اعمال و رفتار کا خواہاں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان مجبور ہے اور اس سے اختیار سلب ہو گیا ہے جبکہ انسان ان تمام عوامل کے مقابلہ میں مقاومت کر سکتا ہے حتی معاشرہ کی سرنوشت میں اثر انداز ہو سکتا ہے. جیسا کہ اس طرح کے اثرات کے نمونوں کو معاشروں کی تاریخ میں بہت زیادہ دریافت کیا جا سکتا ہے.

ج) فطری جبر

فلسفۂ مادی اور مادہ پرستی کے ہمراہ ارثی صفات کے سلسلہ میں علمی ارتقاء انسان کی جبری زندگی کا عقیدہ پیش کرتا ہے. جو لوگ انسان کے اندر معنوی جوہر کے وجود کے منکر ہیں اور اس کو صرف

اپنی تمام تر قدرتوں سے مزین ایک پیکر اور جسم سے تعبیر کرتے ہیں. اور اس کی بہت سی توانائیاں انسانی خصوصیات کے ارثی و وراثتی عوامل کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں اور انسان کے تمام نفسیاتی و ذہنی حالات کی مادی توجیہ کرتے ہیں. اور لذت، شوق، علم، احساس اور ارادہ کو مغز کے اندر سلسلۂ اعصاب اور الکٹرانک حرکتوں کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں لہٰذا طبیعی طور پر عقیدہ جبر کی طرف گامزن ہیں. (۱) ایسی صورت میں انسان کو اخلاقاً اس کے اعمال کے مقابلے میں ذمہ دار نہیں سمجھا جا سکتا ہے. کیونکہ ایسی حالت میں جزا و سزا اپنے معنی و مفہوم کھو دیں گے اس لئے کہ ان سوالوں کے مقابلہ میں کہ کیوں فلاں شخص مرتکب جرم ہوا ہے؟ تو جواب دینا چاہئے کہ اس کے ذہن میں مخصوص الکٹرانک اشیا کا تحقق اس کے تحریک کا باعث ہوا ہے اور یہ حادثہ وجود میں آیا ہے اور اگر سوال یہ ہو کہ کیوں یہ مخصوص اشیاء اس کے ذہن اور اعصاب میں حاصل ہوئیں؟ تو جواب یہ ہے کہ فلاں حادثہ بھی فلاں فطری اور الکٹرانک حوادث کی وجہ سے تھا. اس تحلیل کی روشنی میں مغز کے مادی حوادث انسان کے خارجی افعال و حوادث کے اسباب ہیں. مغز کے مادی حوادث میں سے کوئی بھی ارادی، اختیاری افعال اور انسانوں میں تبدیلی وغیرہ اُن ارثی صفات اور فطری بناوٹ میں تبدیلی کی بنا پر ہے جن کا ان کی ترکیبات میں کوئی کردار نہیں ہے. یعنی لوگوں نے ترقی کرتے ہوئے کہا ہے کہ: بیرونی فطرت کے قوانین کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان سے مخصوص افعال سرزد ہوں اور یہ عوامل جدا ہونے والے نہیں ہیں. وہ افعال جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں نہ مخصوص نفسیاتی مقدمات (فہم و خواہشات) ہیں جو فطری اور بیرونی طبیعی حوادث سے بے ربط نہیں ہیں. مثال کے طور پر ہمارا دیکھنا، اگرچہ یہ فعل ہے جو نفس انجام دیتا ہے. لیکن نفس کے اختیار میں نہیں ہے. عالم خارج میں فطری بصارت کی شرطوں کا متحقق ہونا موجب بصارت ہوتا ہے اور یہ بصارت ایک ایسا عنصر ہے جو ہمارے اختیاری فعل میں موثر ہے۔

(۱) اسکینر، کتاب ''فراسوی آزادی و منزلت'' میں کہتا ہے کہ: جس طرح بے جان اشیاء کو جاندار سمجھنا (بے جان چیزوں سے روح کو نسبت دینا) غلط ہے اسی طرح لوگوں کو انسان سمجھنا اور ان کے بارے میں فکر کرنا اور صاحب ارادہ سمجھنا بھی غلط ہے، ملاحظہ ہو: اسٹیونسن، لسلی ہفت نظریہ دربارۂ طبیعت انسان؛ ص ۱۶۳۔

اس تاثیر کی دلیل یہ ہے کہ انسان جب تک کسی چیز کو نہیں دیکھے گا اس کی طرف احساس تمایل بھی نہیں کرے گا لیکن جب اس کو دیکھتا ہے تو اس کا ارادہ مورد نظر فعل کے انجام سے مربوط ہو جاتا ہے۔(۱) دیکھنا، ایک غیر اختیاری شی ہے اور طبیعی قوانین کے تابع ہے. پس جو بھی چیز اس پر مرتب ہوگی اسی قوانین کے تابع ہوگی۔

انسان بھی اگر چہ خواہشات سے وجود میں آتا ہے جو ہمارے اندر موجود ہے لیکن فطرت سے بے ربط نہیں ہے. نفسیاتی علوم کے ماہرین نے بھی اس بات کو ثابت کیا ہے کہ عوامل طبیعی خصوصاً انسان میں خواہشات کے برانگیختہ کرنے کا موجب ہوتا ہے. ہم لوگوں نے بھی تھوڑا بہت آزمایا ہے اور معروف بھی ہے کہ زعفران خوشی دلاتا ہے اور مسور کی دال قلب میں نرمی پیدا کرتی ہے. قانون وراثت کی بنیاد پر انسان اپنے اباء واجداد کی بہت سی خصوصیات کا وارث ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے.

یہ تمام چیزیں طبیعی وفطری عوامل کے مطابق انسان کے مجبور ہونے کی دلیل ہے اور ان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ارادہ، فطری اور طبیعی عوامل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے گر چہ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ

.....

(۱) بابا طاہر کہتے ہیں:

زدست دیدہ ودل ہر دو فریاد — کہ ہر چہ دیدہ بیند دل کند یاد
بسازم خنجری نیشش زپولاد — زنم بر دیدہ، تا دل گردد آزاد

میں چشم ودل، دونوں سے رنجیدہ ہوں کہ جو کچھ آنکھ دیکھتی ہے اسے دل محفوظ کر لیتا ہے۔ میں ایسا خنجر بنانا چاہتا ہوں جس کی نوک فولاد کی ہو اور اسی سے آنکھ پھوڑ دوں گا تا کہ دل آزاد ہو جائے۔

اور اس کا عکس بھی صادق ہے کہ کہا گیا ہے:

از دل برود، ہر آن کہ از دیدہ برفت

جو کچھ آنکھ سے پوشدہ ہو جاتا ہے دل سے بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

بغیر کسی مقدمہ کے ارادہ کیا ہے۔(۱)

فطری جبر کی تجزیہ و تحلیل

اس طرح کے جبر کا عقیدہ انسان کے کردار و شخصیت سازی اور طبیعی، فکری اور موروثی عوامل کے کردار میں افراط و مبالغہ سے کام لینا ہے. انسانوں کی متفاوت و متفرق زندگی اور وراثت کے عنصر کا کسی طرح سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن انسان کے کردار و شخصیت سازی کے سلسلہ میں تمام موثر عوامل سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ارثی علت میں منحصر کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے. انسان کو اس زاویہ سے نگاہ کرنے میں بنیادی اشکال اس کے معنوی اور روحانی جہت سے چشم پوشی کرنا ہے. جبکہ گذشتہ فصلوں میں قرآنی آیات اور فلسفی براہیں سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے انسانوں کے فہم و احساسات کے مرکز، معنوی اور غیر مادی جوہر کے وجود کو ثابت کیا ہے. نفس مجرد کے وجود کو ثابت کرنے کے بعد اس قسم کے جبر پر اعتقاد کے لئے کوئی مقام نہیں ہے اس لئے کہ ارادہ کا آزاد ہونا انسان کے روح مجرد کی قابلیتوں میں سے ایک ہے اور انسان کے آزاد ارادے کو مورد نظر قرار دیتے ہوئے، اگر چہ مادی ترکیبات کے فعل و انفعالات اور فطری عوامل کا کردار قابل قبول ہے لیکن ہم اس نکتہ کی تاکید کر رہے ہیں کہ ان امور کا فعال ہونا اختیار انسان کے سلب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے. مادی ترکیبات کے فعل و انفعالات کے حصول اور بعض خواہشات کے برانگیختہ ہونے میں خارجی عوامل اور ان کی تاثیروں کے باوجود کیا ہم ان عوامل کے مقابلہ میں مقاومت کر سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں اپنی اور دوسروں کی روزمرہ زندگی میں بہت زیادہ نمونوں سے روبرو ہوتے رہے ہیں۔

(۱) قابل ذکر بات یہ ہے کہ حیاتی اور مادی جبر میں انسان کے معنوی جوہر اور روحانی حالات کی نفی پر تاکید ہوئی ہے اور انسان کو ہمیشہ ایک مادی مخلوق سمجھا جاتا ہے لیکن فطری شبہہ کا جبر میں کوئی اصرار پایا نہیں جاتا ہے بلکہ فطری اسباب و علل اور ان پر حاکم قوانین کے مقابلہ میں فقط انسان کے تسلیم ہونے کی تاکید ہوئی ہے یعنی اگر انسان میں روح اور حالات نفسانی ہیں تو یہ حالات فطری علتوں کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں اور اس میں انسان کے ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے.

قانون وراثت کا بھی یہ تقاضا نہیں ہے کہ جو فرزند اپنے آباء واجداد سے بعض خصوصیات کا وارث ہوا ہے وہ کسی بھی انتخاب کی قدرت نہیں رکھتا ہے. اگر مذکورہ امور کو بعض انسانی اعمال کا نتیجہ فرض کرلیا جائے تو یہ جزء العلۃ ہوں گے لیکن آخر کار، انسان بھی اختیار استعمال کرسکتا ہے اور تمام ان عوامل کے تقاضوں کے برخلاف دوسرے طریقہ کار کے انتخاب کی بنا پر انسان کے بارے میں مادی فعل وانفعال اور وراثت کی صحیح پیش بینی، فطری عوامل کے اعتبار سے نہیں کی جاسکتی ہے۔

خلاصہ فصل

۱۔ گذشتہ فصل میں ہم نے بیان کیا ہے کہ کرامت اکتسابی، انسان کے اختیار وارادہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہے. ہم اس فصل میں مسئلہ اختیار اور اس کے حدود کے اعتبار سے تجزیہ وتحلیل کریں گے۔

۲۔ انسان ایسی مخلوق ہے جو آزمائش، انتخاب اور قصد وارادے سے اپنے افعال کو انجام دیتا ہے. عقلی ونقلی دلیلیں انسان کے اندر پائے جانے والے عنصر (اختیار) کی تائید کرتی ہیں. لیکن اس کے باوجود کچھ شبہات بیان کئے گئے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے.

۳۔ مسلمانوں کے درمیان ایک گروہ (مجبرہ) ہے جو بعض آیات وروایات سے استفادہ کرتے ہوئے انسان کو ارادۂ الٰہی کے زیر اثر، فاقد اختیار سمجھتا ہے۔ وہ آیات وروایات جو خدا کے علم مطلق اور وہ آیات وروایات جو یہ بیان کرتی ہیں کہ کوئی بھی چیز خدا کے اذن وارادے سے خارج نہیں ہے اور وہ دلیلیں جو بیان کرتی ہیں کہ انسانوں کا مقدر پہلے سے ہی آراستہ ہے. اس گروہ (مجبرہ) نے ایسی ہی دلیلوں سے استناد کیا ہے۔

۴۔اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ تمام مورد نظر دلیلیں عقیدہ تفویض کی نفی کر رہی ہیں اور اس نکتہ کو ثابت کر رہی ہیں کہ خداوند عالم ابتداء خلقت سے تا ابد دنیا کا عالم ونگراں نیز محافظ ہونے کے باوجود انسان سے اختیار سلب نہیں کرتا ہے اور یہ کہ تمام چیزیں اس کے قضاء وقدر سے مربوط ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر واقعہ کے متحقق ہونے کے لئے کافی ووافی شرائط کا ہونا ضروری ہے منجملہ شرائط، انتخاب کے بعد قصد کا ہونا ہے اور یہ کہ تمام اشیاء خداوند عالم کے ارادے اور اذن کے حدود میں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کا ارادہ انسان کے ارادے کے مقابلہ میں ہے. بلکہ ہمارا ارادہ بھی ارادۂ پروردگار کے ہمراہ اور طول میں موثر ہے۔

۵۔دوسرا شبہ اجتماعی وتاریخی جبر کے نام سے معروف ہے اور کہا جاتا ہے کہ انسان قدرت مقاومت نہ رکھنے کے باوجود تاریخی واجتماعی عوامل اور تقاضوں سے متاثر ہے''. ہگل، ڈورکھیم اور مارکس'' فرد واجتماع کے درمیان رابطہ کے سلسلہ میں ایسا ہی نظریہ رکھتے تھے. علم جنٹک کی پیشرفت کے ساتھ یہ شبہ ایجاد ہوتا ہے کہ انسان کا انتخاب دراصل دماغ کے شیمیائی فعل وانفعالات کا نتیجہ ہے اور انسان کا ایک دوسرے سے متفاوت ہونا اس کے جسمی اور موروثی تفاوت کی وجہ سے ہے، لہٰذا انسان اپنی جسمی اور طبیعی خصلتوں سے مغلوب ومقہور ہے۔

۶۔ان دو شبہوں کے جواب میں مذکورہ عوامل کے وجود کا منکر نہیں ہونا چاہے. حقیقت یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کی تکمیل میں سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی روابط بھی بہت زیادہ اثر انداز ہیں. اور انسانوں کی زندگی کے تفاوت میں عنصر وراثت بھی دخیل ہے. لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس نظریہ کے ماننے والوں نے ان عوامل کی تاثیر کے مقدار میں مبالغہ کیا ہے اور درونی ومعنوی عوامل کی تاثیر کو بھول بیٹھے ہیں. انسان کا نفس ایک غیر مادی عنصر ہے اور ارادہ اس کی قوتوں میں سے ہے جو مادی اور ضمنی محدودیتوں کے باوجود بھی اسی طرح فعالیت اور مقاومت انجام دے رہا ہے.

تمرین

۱۔انسان کے فردی اور اجتماعی حالات وکردار کے چند نمونے جو اس کے مختار ہونے کی علامت ہیں ذکر کریں؟

۲۔مفہوم اختیار کے استعمال کے چار موارد کی وضاحت کریں؟

۳۔(امر بین الامرین) سے مراد کیا ہے جو اہل بیت علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں کے نظریہ کو بیان کرتا ہے؟

۴۔بعض لوگوں نے خداوند عالم کے علم غیب سے متعلق شبہٴ جبر کے جواب میں کہا ہے کہ: جس طرح بہت ہی صمیمی اور گہرے دوست کی اپنے دوست کے آئندہ کاموں کے سلسلہ میں پیشن گوئی اس کے دوست کے مجبور ہونے کا سبب نہیں بنتے اسی طرح خداوند عالم کا علم غیب بھی انسان کے مجبور ہونے کا سبب نہیں ہوتا ہے. آپ کی نظر میں کیا یہ جواب متقن اور قانع کرنے والا ہے؟

۵۔کیا انسان کے افعال میں خدا کو فعّال سمجھنا اس بات کا مستلزم نہیں ہے کہ ہم انسان کے برے کاموں، تمام گناہوں اور ظلم کو اللہ کی طرف نسبت دیں؟ اور کیوں؟

۶۔کیا آیۂ شریفہ (ومارميت إذ رميت ولكن الله رمى) عقیدۂ جبر کی تائید نہیں کر رہی ہے؟ اور کیوں؟

۷۔انسان کا مختار ہونا، انسانی حوادث کے قانون مند ہونے سے کس طرح سازگار ہے؟

۸۔وہ اختیار جو حقوقی اور فقہی مباحث میں تکلیف، ثواب اور عقاب کے شرائط میں سے ہے اور وہ اختیار جو کلامی وفلسفی اور انسان شناسی کے مباحث میں مورد نظر ہے ان دونوں کے درمیان

کیا نسبت ہے؟

۹۔ اختیاری کاموں کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل توضیحات میں سے کون سی توضیح صحیح ہے؟

اختیاری فعل وہ فعل ہے جو انسان کے قصد کے تحت ہو۔ اور

(الف) اچانک ظاہر ہوتا ہے اور انجام پاتا ہے۔

(ب) صاحب علت ہے اور انجام پاتا ہے۔

مزید مطالعہ کے لئے:

۱.جبر وتفویض اور اس کے غلط ہونے کے بارے میں ملاحظہ ہو:

۔حسن زادہ آملی، حسن (۱۳۶۶) خیر الاثر در رد جبر وقدر: قم: انتشارات قبلہ۔
۔سبحانی، جعفر (۱۴۱۱) الٰہیات علی ھدی الکتاب والسنۃ والعقل. ج۲، قم: المرکز العالمی للدراسات الاسلامیہ۔
۔کاکایی، قاسم (۱۳۷۴) خدامحوری (اکازیونالیزم) در تفکر اسلامی وفلسفہ مالبرانچ، تہران: حکمت۔
۔مجلسی، محمد باقر (۱۳۶۸) جبر وتفویض، تحقیق مہدی رجائی؛ مشہد: بنیاد پژوہش ھای اسلامی۔
۔مرعشی شوشتری، محمد حسن (۱۳۷۲) ''جبر واختیار وامر بین الامرین'' مجلّہ رہنمون، ش۶۔
۔ملاصدرا شیرازی، صدرالدین (۱۳۴۰) ''رسالہ جبر واختیار، خلق الاعمال، اصفہان: بی نا۔
۔موسوی خمینی، روح اللہ (امام خمینی) (۱۳۶۲) طلب وارادہ، ترجمہ وشرح سید احمد فہری، تہران: مرکز انتشارات علمی وفرہنگی۔

۲.جبر کے شبہات اور اس کی تحقیقات کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو:

۔جعفر، محمد تقی؛ جبر واختیار، قم: انتشارات دار التبلیغ اسلامی۔
۔جعفر سبحانی (۱۳۵۲) سرنوشت از دیدگاہ علم وفلسفہ، تہران: غدیر۔
۔سعید مہر، محمد (۱۳۷۵) علم پیشین الٰہی واختیار انسان، تہران: پژوہشگاہ فرہنگ واندیشہ اسلامی۔
۔صدر، محمد باقر (۱۳۵۹) انسان مسؤول وتاریخ ساز، ترجمہ محمد مہدی فولادوند، تہران: بینادقرآن۔
۔محمد حسین طباطبائی (۱۳۶۱) نہایۃ الحکمۃ، تعلیق: محمد تقی مصباح یزدی، ج۲، ص۳۴۶، تہران:

انتشارات، الزہراء۔

۔طوسی، نصیرالدین (۱۳۳۰) جبر وقدر، تہران: دانشگاہ تہران۔

۔محمد تقی مصباح؛ آموزش فلسفہ، تہران: سازمان تبلیغات اسلامی۔

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی و انسان شناسی) قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۴۵) انسان وسرنوشت، تہران: شرکت سہامی انتشار۔

۔.....مجموعہ آثار، ج۱، تہران: صدرا۔

۔احمد واعظی (۱۳۷۵) انسان از دیدگاہ اسلام، قم: دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ۔

ملحقات

۱۔ مغربی انسان شناسی کے منکرین اور مسئلہ اختیار

ناٹالی ٹربوویک نے انسان کے اختیار یا جبر کے باب میں مغربی منکرین کے نظریوں کو دو سوالوں کے ضمن میں یوں بیان کیا ہے:

الف) کیا انسان کے اعمال و کردار، اس کے آزاد ارادے کا نتیجہ ہیں یا تقریباً بہ طور کامل ماحول، وراثت، طفلی کے ابتدائی دور یا خدا کی طرف سے تعیین ہوتا ہے؟ مختلف فکری مکاتب کے ابتدائی نظریوں کو عقیدۂ جبر کے کامل جنون سے لے کر اس کے کامل ضدیت کو مندرجہ ذیل انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے:

- عقیدۂ جبر تام (۱)
  - آزاد ارادہ کا نسبی یا کامل طور پر انکار
    - عقیدہ تجربہ (ہابز)
    - عقیدہ ہمبستگی (۲) (ہارٹلی (۳) ہیوم)
    - عقیدہ نفع (بنٹام، میل)
    - فرائیڈ کے ماننے والے
    - عقیدہ کردار (واٹسن، اسکینر)
  - معمولی آزادیۂ ارادہ
    - عقیدۂ جبر معتدل
      - فرائیڈ کے نئے ماننے والے (فروم، اریکسن)
      - انسان محوری (مازلو، روجرز)
      - عقیدہ خرد (وکارسٹ)
    - وجود پسند، انسان محوری (۴) (می (۵)، فرینکل (۶))
    - خدا کو قبول کرنے والوں کا عقیدہ وجود (۷)

.....

(1)Total determinism (2)associationists (3)Hartley (4)existential humanists (5)May (6)Farnkl (7)theistic Existentialists.

عقیدۂ جبر یا ضدیت تمام ارادہ کی آزادی — (ببر(۱)، ٹلیچ (۲)، فورنیر (۳))
عقیدہ عروج و بلندی (۴) (کانٹ)
عقیدہ وجود (سارٹر)

(ب) عقیدۂ جبر کے اصول کیا ہیں؟

فطری خواہشات

فرائیڈ کے ماننے والے: انسان اپنی معرفت زندگی (جنسیت، بھوک، دور کرنا (۵) اور ان کے مثل چیزوں) اور فطری خواہشات کے زیر نظر ہے انسان کے تمام رفتار و کردار صرف ان سازشوں کا نتیجہ ہیں جو فطری ضرورتوں اور مختلف اجتماعی تقاضوں کے درمیان حاصل ہوتی ہیں. فطری خواہشیں غالباً بے خبر ضمیر میں موثر ہیں. اس طرح کہ انسان نہ صرف ان کے زیر اثر قرار پاتا ہے بلکہ اکثر خود بھی اس کنٹرول سے بے خبر ہے.

آرتھونلک کے اعصابی اطباء: (نیوبلڈ) اس گروہ کا نظریہ، عقیدۂ اخلاق کے نظریہ کی طرح ہے

انسان محوری (روجرز، مازلو) انسان مادرزاد خواہشات کا حامل ہے جو اسے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے پیش کرتا ہے۔

موروثی وجود

وراثت سے استفادہ کا مکتب: (۶) (جنسن (۷)، شاکلے (۸) ہرنشٹائن (۹)) اکثر انسان

.....

(1)Buber (2)Tillich (3)Fournier

(4)transcendentalists

(5)Elimination (6)Inherited L.O.School.

(7)Jensen. (8)Shockley. (9)Hernstien.

کا شعور میراثی ہوتا ہے. عقل وخرد سے مربوط تمام رفتار وکردار، ایسے حصہ میں قرار پاتے ہیں جو مخصوص طریقے سے وارث کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔(۱) نظریۂ علم حیات کے مطابق اکثر انسان کے رفتار وکردار اور اس کی افسردگی، بیرونی درونی ارثی توجہ کا نتیجہ ہیں۔

ماحول کی توانائیاں

افعال گرائی کے نظریہ کے حامی: (واٹسن) کے مطابق انسان کے رفتار وکردار کو ماحول ہی معین کرتا ہے۔

اصول پسندی کے حامی: (اسکینر) کا کہنا ہے اسباب ماحول، رفتار وکردار کے مہم ترین معین کرنے والوں میں سے ہیں. اگر چہ فطری عوامل بھی موثر ہیں۔

اجتماعی محافظت کا نظریہ پیش کرنے والے: (بانڈرا، برکوٹز (۲)) اکثر رفتار وکردار، مخصوصاً اجتماعی رفتار وکردار، ماحول کی دین ہے نہ کہ فطری خواہشات کا میلان۔

فرائڈ کے نئے ماننے والے: (فردم، اریکسن) کا کہنا ہے فرہنگی اور اجتماعی ماحول، انسان کے رفتار وکردار کو ترتیب دینے والی بہت ہی مہم قوت ہے. علم حیات کی فطری خواہشات کم اہمیت کی حامل ہے۔

کارل مارکس کے عقیدہ کے حامی کہتے ہیں: اسباب صنعت یا اقتصادی نظام انسان کے اعتباری چیزوں اور یقینیات کو ترتیب دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اس کے رفتار وکردار کے ایک عظیم حصہ کو بھی معین کرتے ہیں۔

انسان محوری کے دعویدار: (روجرز، مازلو) کے مطابق رفتار وکردار کو اجتماعی عوامل اور معین ماحول ترتیب دے سکتا ہے۔

.....

(1)Eysenck .(2)Berkowitz.

اگر معنوی احترام اور جسمانی آسودگی کی ابتدائی ضرورت حاصل نہ ہوں تو ماحول ومحیط کے اسباب انسان کو منحرف کر سکتے ہیں اور تکامل وارتقاء کی راہ میں مانع ہو سکتے ہیں. لیکن اگر یہ ابتدائی ضرورت حاصل ہو تو انسان ترقی کر سکتا ہے اور اپنے ہی طرح (۱) دوسرے اہداف کو متحقق کر سکتا ہے جو بیرونی ماحول کے زیر اثر نہیں ہیں.

معنوی قوتیں (۲)

اکثر مفکرین ایسی طاقتوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں جو کسی اندازے یا وضاحت سے روشن نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن اکثر بزرگ علماء انسان کے رفتار وکردار میں خدا یا خداؤں کی دخالت کے معتقد ہیں، پوری تاریخ میں حتیٰ گذشتہ چند سالوں میں بھی اکثر معاشروں نے مادیات کے مقابلہ میں معنویات کی زیادہ تاکید کی ہے.

۲۔ خداوند عالم کی عالم گیر خالقیت اور مسئلہ اختیار

خداوند عالم کی عالم گیر خالقیت جو کہ انسان کے اختیاری اعمال میں بھی شامل ہے اور قرآن کی آیات میں بھی اسکی وضاحت ہوئی ہے جیسے ﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيءٍ﴾ (۳) ﴿وَاللهُ خَلَقَكُم وَمَا تَعمَلُونَ﴾ (۴) یہ آیات عقیدۂ جبر رکھنے والوں کے لئے ایک دلیل وسند بھی ہو سکتی ہے. لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات میں غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات بھی اس کی فعالیت کی نفی نہیں کر رہی ہیں بلکہ حقیقی توحید اور انسان کے اختیاری کاموں میں خداوند عالم کے مقابلہ میں انسان کی فعالیت کے برابر نہ ہونے کو بیان کر رہی ہیں. اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب کسی فعل کو دو یا چند فاعل کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو مذکورہ فعل کا متعدد فاعل سے انجام پانا مندرجہ ذیل چار صورتوں میں سے ایک ہی صورت میں ہوگا۔

---

(1)self-actualization. (2)spiritual forces.

(۳) رعد/۱۶ (۴) صافات/۹۶۔

الف) ایک حقیقی فاعل ہے اور دوسرا مجازی فاعل شمار ہوتا ہے اور فعل کے انجام دینے میں کوئی کردار نہیں رکھتا ہے۔

ب) ایک فاعل حقیقی ہے اور دوسرا اس کا مددگار ہے.

ج) متعدد فاعل نے ایک دوسرے کی مدد سے کام کو انجام دیا ہے اور کام کا بعض حصہ ہر ایک سے منسوب ہے.

د) دو یا چند فاعل فعل کو انجام دینے میں حقیقی کردار ادا کرتے ہیں اور یہ فعل ان میں سے ہر ایک کا نتیجہ ہے. لیکن ہر ایک کی علت فاعلی دوسرے سے بالاتر اور طول میں واقع ہے.

قرآن مجید کی آیات فقط چوتھی صورت سے مطابقت رکھتی ہے اور خداوند عالم کی فاعلیت کو انسان کی فاعلیت کے طول میں بیان کرتی ہیں لہذا انسان کا اختیاری فعل درحقیقت فعل خدا بھی ہے اور فعل انسان بھی، مخلوق خدا بھی ہے اور مخلوق انسان بھی اس لئے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے طول میں واقع ہیں اور فعل کو ان دونوں کی طرف نسبت دینے میں بھی کوئی عقلی مشکل نہیں ہے.(۱)

۳۔ طینت کی روایات کا دوسرا جواب

ایک فلسفی مقدمہ قرآن میں موجود ہے جس کے بہت ہی دقیق ہونے کی وجہ سے ہم آسان لفظوں میں اشارہ کرتے ہوئے اس مقدمہ کو پیش کریں گے۔ البتہ یہ مقدمہ بہترین جواب اور روایات طینت کے لئے بہترین توجیہ ہے:

عالم مادی کے علاوہ عالم برزخ، عالم قیامت اور عالم آخرت جیسے دوسرے جہان بھی ہیں اور روایات، مذکورہ عالم میں سے عالم آخرت کو بیان کر رہی ہے. عالم آخرت میں زمان و مکان وجود نہیں رکھتا ہے جو کچھ اس دنیا میں زمان و مکان کے دامن میں واقع ہوتا ہے اس عالم میں اکٹھا اور بسیط

---

(۱) اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: جوادی آملی، عبداللہ؛ تفسیر موضوعی قرآن کریم، توحید و شرک، مصباح یزدی، محمد تقی؛ معارف قرآن (خداشناسی، کیھان شناسی، انسان شناسی) ص ۱۰۶، ۱۲۴۔

انداز میں ذخیرہ ہوتا رہتا ہے اس دنیا کے ماضی، حال اور آئندہ، اس دنیا میں یکجا ہوں گے. پوری یہ دنیا جس میں ایک طولانی زمان ومکان موجزن ہے، اس دنیا میں صرف ایک وجود کی طرح بسیط اور بغیر اجزا کے ہوں گے. لہذا وہ چیزیں جو اس دنیا میں موجود ہیں وہاں بھی ہیں. (۱) روایات طینت اُس دنیا اور اس نکتہ کو بیان کرنا چاہتی ہیں کہ یہ انسان جو پوری زندگی بھر ترقی کرتا ہے اور بعد میں اپنے اختیار سے ایسے اعمال انجام دیتا ہے جس کی وجہ سے اچھا یا برا ہو جاتا ہے. یہ تمام چیزیں اس دنیا میں یکجا موجود ہیں اور انسان کا اچھا یا برا ہونا اس کے دنیا میں آنے سے پہلے اس عالم میں معلوم ہے. اس لئے کہ اس دنیا کے یا اسی کے تمام مراحل وہاں موجود ہیں. آیا اب یہ گفتگو یعنی اس دنیا میں اچھا یا برا معلوم ہونے کا معنی جبر ہے؟ نہیں، اگر لوگ اس دنیا میں با اختیار عمل انجام دیتے ہیں تو اس دنیا میں بھی اسی طرح یکجا ہوں گے اور اگر مجبور ہیں تو وہاں بھی یکجا جبر ہی ہوگا. قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید انسان کو اس دنیا میں مختار بتا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کا یکجا اور بسیط وجود بھی مختار ہے. ایسے عالم کا ہونا، اس میں انسان کا حاضر ہونا اور وہاں اچھا اور برا معلوم ہونا انسان کے مختار ہونے سے منافات نہیں رکھتا ہے. پس روایات طینت، انسان کے مجبور ہونے کا سبب نہیں ہیں۔

۴۔ فلسفی جبر

بعض فلسفی قواعد بھی انسان کے اختیاری افعال میں جبر کے توہم کا سبب بنے ہیں اسی بنا پر بعض لوگوں نے ان قواعد کو غلط یا قابل استثناء کہا ہے اور بعض لوگوں نے انسان کے اختیاری افعال کو جبری قرار دیا ہے. منجملہ قاعدہ (الشَیئ مَالم یجِب لم یُوجد) ہے (ہر وہ چیز جب تک سرحد ضرورت ووجوب تک نہ پہونچے وجود میں نہیں آئے گی) جبر ایجاد کرنے میں اس قاعدہ کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قاعدہ انسان کے اختیاری افعال کو بھی شامل ہے اختیاری افعال بھی جب تک سرحد ضرورت ووجوب تک نہ پہونچیں متحقق نہیں ہوں گے چونکہ ایسا ہی ہے لہٰذا ہر اختیاری فعل جب تک سرحد

(۱) اس عالم میں ''ابھی'' کی تعبیر مجبوری کی وجہ سے ہے ورنہ اس دنیا میں حال، گذشتہ اور آئندہ نہیں ہے۔

وجوب تک نہیں پہونچا ہے محقق نہیں ہوگا اور جب سر حد ضرورت و وجوب تک پہونچ جائے گا تو انسان چاہے یا نہ چاہے قطعاً وہ فعل محقق ہوگا. اسی لئے انسان محکوم و مجبور ہے اور اس کے ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس شبہہ کے جواب میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ قاعدہ عقلی اور کلی ہے اور قابل استثناء نہیں ہے اور یہ بات اپنی جگہ ثابت اور مسلم ہے. لیکن اس قاعدہ سے جبر کا استخراج اس سے غلط استفادہ کرنے کا نتیجہ ہے. اس لئے کہ یہ قاعدہ یہ نہیں بتاتا ہے کہ انسان کے اختیاری افعال کن شرائط میں مرحلہ وجوب وضرورت تک پہونچتے ہیں بلکہ صرف مرحلہ ضرورت و وجوب تک پہونچنے کی صورت میں اختیاری فعل کے حتمی متحقق ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اختیاری افعال میں یہ وجوب وضرورت ارادہ کے تحقق ہونے سے وابستہ ہے اور جب تک ارادہ متحقق نہ ہو وہ مرحلہ ضرورت و وجوب تک نہیں پہونچے گا لہذا اگر چہ اس قاعدہ کے مطابق جس وقت اختیاری فعل مرحلہ ضرورت تک پہونچے گا تحقق حتمی ہے لیکن اسکا مرحلہ ضرورت تک پہونچنا ارادہ کے تحقق سے وابستہ ہے اور ایسی صورت میں یہ قاعدہ نہ صرف انسان کے اختیار سے کوئی منافات نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے معنی انسان کا حقیقی مختار ہونا ہے۔

دوسرا قاعدہ جو جبر کے توہم کا باعث ہوا ہے وہ قاعدہ (ارادہ کا بے ارادہ ہونا) ہے. اس شبہہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہر اختیاری فعل ارادہ سے پہلے ہونا چاہیئے اور خود ارادہ بھی انسان کے درونی اختیاری افعال میں سے ہے لہذا اسکے اختیاری ہونے کے لئے دوسرے ارادہ کا اس کے پہلے ہونا ضروری ہے اور پھر تیسرے ارادہ کا بھی دوسرے ارادہ سے پہلے ہونا ضروری ہوگا، اور یہ سلسلہ لامحدود ہونے کی وجہ سے متوقف ہو جاتا ہے جس کا یہ معنی ہے کہ وہ ارادہ اب اختیاری نہیں رہا بلکہ جبر ہو گیا ہے اور جب وہ ارادہ جبری ہو گیا تو اختیاری فعل بھی جو اس سے وابستہ ہے جبری ہو جائے گا۔

اس کا جواب جو کم از کم فارابی کے زمانے سے رائج ہے متعدد و متنوع جوابات سے مزین ہیں جن میں سے سب سے واضح جواب ذکر کیا جا رہا ہے۔

اختیاری فعل کا معیار یہ نہیں ہے کہ ارادہ سے پہلے ہو، تا کہ اختیاری فعل کے لئے کوئی ارادہ نہ ہو، بلکہ اختیاری فعل کا معیار یہ ہے کہ ایسے فاعل سے صادر ہو جو اپنے کام کو رضایت اور رغبت سے انجام دیتا ہے. ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرا عامل اس کو اس کی رغبت کے خلاف مجبور کرے. انسان کے تمام اختیاری افعال منجملہ انسان کا ارادہ اسی طرح ہے اور ہمیشہ انسان کی خواہش سے انجام پاتا ہے اور انسان ان کے انجام دینے میں کسی جبر کا شکار نہیں ہے۔

تیسرا قاعدہ جو فلسفی جبر کے توہم کا موجب ہوا ہے وہ قاعدہ (ایک معلول کے لئے دو علت کا محال ہونا) (استحالةُ توارِدِ العلّتين علىٰ معلولٍ واحدٍ) ہے، اس شبہہ میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام مخلوقات منجملہ انسان کے اختیاری افعال خداوند عالم کی مخلوق اور معلول ہیں. اور یہ موضوع متعدد عقلی و نقلی دلیلوں پر مبنی ہے جسے ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے. اس وقت اگر انسان کے اختیاری افعال کے بارے میں کہا جائے کہ یہ حوادث انسان کے اختیار و ارادہ سے وابستہ ہیں تو اس کا معنی یہ ہیں کہ انسان بھی ان حوادث کے رونما ہونے کی علت ہے اور اس کا لازمہ، ایک معلوم کے لئے (انسان کا اختیاری فعل) دو علت (خدا و انسان) کا وجود ہے اور اس کو فلسفہ میں محال مانا گیا ہے کہ ایک معلوم کے لئے دو علتوں کا ایک دوسرے کے مقابلہ میں اور ہم رتبہ ہونا لازم آتا ہے، لیکن طول میں دو علتوں کا وجود اس طرح کہ ایک دوسرے سے بالاتر ہوں یہ فلسفی اعتبار سے نہ فقط محال نہیں ہے بلکہ فلسفی مباحث کے مطابق دنیا کی خلقت اسی اصول پر استوار ہے اور انسان کے اختیاری افعال کے سلسلہ میں صورت یوں ہے کہ انسان کے اختیاری افعال سے منسوب خداوند عالم کی علت اور اس کی فاعلیت بالاتر ہے اور انسان اور اس کا اختیار ارادۂ خدا کے طول میں واقع ہے. اسی بنا پر خداوند عالم کی علیت، انسان اور اس کے اختیار کی علیت بھی قابل قبول ہے. اور یوں کسی طرح کا کوئی جبر لازم نہیں آتا ہے۔(۱)

---

(۱) اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: سبحانی؛ الالٰہیات علی ھدی الکتاب والسنۃ والعقل ج۲ ص ۲۰۳، ۲۰۴؛ محمد تقی مصباح؛ معارف قرآن (خداشناسی، کیھان شناسی، انسان شناسی) ص ۳۷۸، ۳۸۹۔

مقدمات اختیار

اس فصل کے مطالعہ سے اپنی معلومات کو آزمائیں:

۱۔ ان عناصر کا نام بتائیں جن کا انسان ہر اختیاری عمل کے تحقق میں محتاج ہے؟

۲۔ انسان کے اختیاری اعمال میں تین عناصر میں سے ہر ایک کی وضاحت کریں؟

۳۔ معرفت انسان کے اسباب کو آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے بیان کریں؟

۴۔ درونی کشش (خواہشات) کی تقسیم کرتے ہوئے ہر ایک کے بارے میں مختصر سی وضاحت کریں؟

۵۔ انتخاب اعمال کے معیار کی وضاحت کریں؟

۶۔ عالم آخرت کے کمالات ولذتوں کے چار امتیاز اور برتری کو بیان کریں؟

گذشتہ فصل میں ہم نے انسان کے متعلق اختیاری رفتار وافعال کو مرتب کرنے والے مختلف اسباب کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ذکر کیا ہے کہ ان اسباب کے درمیان انسان کا اختیار بہت ہی اہم رول ادا کرتا ہے اور انسان کا قصد وانتخاب اس کے اختیاری افعال ورفتار میں سرنوشت ساز ہیں. اس طرح اختیاری رفتار وکردار میں دقت وتوجہ، حقیقت واختیار کی ساخت وساز میں معاون ومددگار ہیں. اسی بنا پر خصوصاً اختیار کی کیفیت کی ترتیب میں قدیم الایام سے متنوع ومتعدد سوالات بیان ہوئے ہیں جن میں سے بعض اہم سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کیا انسان کا اختیار بے حساب وبہت زیادہ ہے اور کیا کسی قاعدہ واصول پر مبنی نہیں ہے یا اختیار کی ترتیب بھی دوسرے عوامل واسباب کے ماتحت ہے؟

۲۔ اختیار کو فراہم کرنے والے اسباب کون ہیں اور انسان کی توانائی، خواہش اور معلومات کا اس سلسلہ میں کیا کردار ہے؟

۳۔ اختیاری افعال میں انتخاب وتعیین کا معیار کیا ہے اور فعّال وعقلمند انسانوں اور بہت زیادہ متاثر افراد کہ جو اپنے انتخاب کی باگ ڈور معاشرے کے حالات وماحول کے شانے پر ڈال دیتے ہیں اور غفلت یا کسی جماعت کے ساتھ اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں. اس سلسلہ میں کون سے تفاوت واختلاف موجود ہیں بیان کریں؟

۴۔کیا انسان کی معرفت کے عام اسباب اورطرز عمل (تجربہ اور تعقل وتفکر) صحیح راہ کے انتخاب ومعرفت کے لئے تمام مراحل میں کفایت کرتے ہیں؟

۵۔خصوصاً وحی کے ذریعہ استفادہ کی بنیاد پر اور گذشتہ سوالات کے جوابات کے منفی ہونے کی صورت میں حقیقی سعادت کے حصول اور صحیح راستہ کے انتخاب اور اس کی معرفت میں (خصوصاً طریقہ وحی)اور(عام طریقہ معرفت) میں سے ہر ایک کا کیا کردار ہے؟ اور کیا اس موضوع میں دونوں طریقہ ایک دوسرے سے ہماہنگ ہیں؟ اس فصل میں ہم مذکورہ بالا سوالات کے بارے میں تجزیہ وتحلیل کریں گے.

اختیار کو مہیا کرنے والے عناصر

ہر اختیاری عمل کا تحقق کم از کم تین عنصروں کا محتاج ہے ا۔ معلومات ومعرفت ۲۔خواہش وارادہ ۳۔قدرت وتوانائی.

معرفت

اختیاری افعال میں معرفت ایک چراغ کے مانند ہے جو امور اختیاری میں واضح اور روشن کردینے والا کردار ادا کرتی ہے، چونکہ ہمارے لئے طریقۂ انجام اور افعال کو پہچاننا اور ان کی اچھائی اور برائی کو جدا کرنا ضروری ہے تا کہ ہم سب سے بہتر کو انتخاب کرسکیں اور ہمارا یہ اختیاری فعل حکیمانہ اور عقل پسندی پر مبنی ہو.لیکن افعال کے اچھے اور برے کی معرفت ، حقیقی کمال کے سلسلہ میں صحیح معلومات اور اس کی راہ حصول پر مبنی ہے. جب تک ہم اپنے حقیقی اور نہائی کمال اور اس کے راہ حصول کو نہیں سمجھ سکیں گے اس وقت تک افعال کی اچھائی اور برائی کو صحیح طرح مشخص نہیں کرسکتے اور نہ ہی معقول ودرست انتخاب کرسکتے ہیں۔ حقیقی کمال اور اس کے راہ حصول کی معرفت بھی تین دوسری معرفت پر مبنی ہے، اور وہ مبداء، معاد، دنیا اور آخرت کی شناخت ہے اس لئے کہ جو نہیں جانتا کہ اس کا اور موجودات کا وجود مستقل اور کافی ہے یا خالق دو عالم سے وابستہ ہے وہ حقیقی اور نہائی کمال اور اپنے

وجود کے بارے میں صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا ہے اور دوسری طرف جو اللہ پر عقیدہ نہیں رکھتا اس کے لئے یہ فرضیہ واضح نہیں ہے کہ وہ خدا تک پہونچ سکتا ہے یا خدا سے قریب ہوسکتا ہے یا اس کی آخری آرزو لقاء اللہ ہے تو کیا اس تک دست رسی ہوسکتی ہے یا نہیں؟! لہٰذا ایسے انسان کا طریقۂ عمل اس شخص سے جدا ہوگا جو اپنے وجود اور تمام موجودات کو خدا کی ملکیت جانتا ہے، اور اپنا کمال خدا سے نزدیک ہونے کو سمجھتا ہے ان دونوں افراد میں کمال کے حصول کی راہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے.

معاد کا موضوع بھی کچھ اسی طرح کا ہے اگر زندگی، مادی دنیا کی زندگی میں منحصر نہ ہو تو قابل حصول معنوی کمالات، دُنیاوی لذتوں سے کہیں بالاتر ہوں گے اور انسان کو اپنے طریقۂ عمل میں اس معرفت کو حاصل کرنا چاہئیے کہ کس طرح اپنے اختیاری تلاش سے اس کمال کو حاصل کرے اور ضرورت کے وقت بہت ہی جلد ختم ہونے والی دنیاوی لذتوں کو آخرت کی برتر اور پایدار لذت پر قربان کردے، پس مرحلۂ معرفت میں مسئلہ مبدا، معاد، دنیا و آخرت کا رابطہ اور کمال نہائی کی راہ افعال اختیاری کے انجام میں عقلائی اور ضروری ہے. اور یہ مسئلہ یعنی قرآن مجید کا مبدا و معاد اور اِس کے بارے میں معلومات نیز دنیاوی و اخروی زندگی کی خصوصیات اور ان دونوں کے درمیان رابطہ پر تاکید کرنا اس قضیہ کے اہم رازوں میں سے ایک راز ہے۔

انسان کے امکانات اور ضروری معرفت

اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ اختیاری فعل کے انجام میں معرفت ایک مہم کردار ادا کرتی ہے اور شناخت میں ہم نہائی کمال کی معرفت اور اس کی راہ حصول کے محتاج ہیں دوسرا مہم سوال جو بیان ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کن راہوں سے اس ضروری معرفت کو حاصل کیا جاسکتا ہے اور کیا معرفت کے عام اسباب و امکانات اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں؟

قرآن مجید نے حواس، عقل اور دل کو اسباب کے عنوان سے ذکر کیا ہے جن کو خداوند عالم نے راہ کمال طے کرنے کے لئے انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے اور اس راہ میں ان سے استفادہ کی

تاکید کی ہے، اور کافروں اور منافقوں کی ان اسباب کے استعمال نہ کرنے یا ان کے تقاضوں کے مطابق عمل نہ کرنے پر مذمت وملامت کی ہے. سورہ دھر کی دوسری آیہ میں حواس کو قابو میں رکھنے کو انسان کے لئے آزمائش قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿إِنَّا خَلَقنَا الإِنسَانَ مِن نُطفَةٍ أَمشَاجٍ نَّبتَلِيهِ فَجَعَلنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً﴾

ہم نے انسان کو مخلوط نطفے (مختلف عناصر) سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں (اسی وجہ سے) ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔

یہ آیہ مواقع آزمائش کے فراہم ہونے میں انسان کی سماعت وبصارت اور آخر کار اسکے صعود یا نزول کے اہم کردار کی طرف اشارہ کرتی ہے سورہ نحل کی ۷۸ ویں آیہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اللّٰهُ أَخرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُم لا تَعلَمُونَ شَيئاً وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمعَ وَ الأبصَارَ وَ الأفئِدَةَ لَعَلَّكُم تَشكُرُونَ﴾

اور خدا ہی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، تم بالکل ناسمجھ تھے اور تم کو کان دیا اور آنکھیں دیں اور دل عطا کئے تا کہ تم شکر کرو۔

یہ آیت بھی انسان کی سعادت میں عمومی (حواس ودل) اسباب معرفت کے کردار اور خداوند عالم سے تشکر کے بارے میں بیان ہوئی ہے.

اس آیہ کریمہ کے سلسلہ میں متعدد ومختلف سوالات کئے گئے ہیں یہاں ہم ان دو سوالوں کے بارے میں تجزیہ وتحلیل کریں گے جو ہمارے موضوع سے بہت زیادہ مربوط ہیں.

۱۔ فلسفی مباحث میں کہا گیا ہے کہ ہر موجود مجرد اپنے آپ سے آگاہ ہے اور انسان کا نفس ایک موجود مجرد ہے لہٰذا اپنی ذات کے بارے میں معلومات رکھنا چاہئے البتہ انسان بھی ابتدائی بدیہی چیزوں کو فطری طور پر جانتا ہے اور فطرت کی بحث میں ہم نے بیان بھی کیا ہے کہ انسان فطری طور پر خدا سے آشنا ہے جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے کہ بعض انبیاء اور ائمہ معصومین شکم مادر ہی میں صاحب دانش تھے تو کیوں

آیہ شریفہ میں بالکل انسان کوولادت کے وقت کسی بھی طرح کی معلومات سے عاری بتایا گیا ہے.

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیہ اس ظاہری علوم کو بیان کررہی ہے جوانسان عام طور پر حاصل کرتا ہے اور انبیاء وائمہ کے استثنائی علوم نیز انسان کے نامعلوم اور نصف معلوم علوم (۱) کو بیان نہیں کررہی ہے، لہٰذا اپنے سلسلہ میں نفس کی معلومات اور ابتداء خلقت کے تمام فطری معارف میں خدا کے بارے میں نامعلوم حضوری معرفت اور معصوم رہبروں کے علوم بھی (**لاتعلمون شیئاً** کی عبارت سے) کوئی منافات نہیں رکھتے ہیں. اسکے علاوہ اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ عبارت معلوم اور نامعلوم تمام بشری علوم کوشامل ہے تو یہ جملہ عام ہے جو قابل تخصیص ہے اور ہم عقلی یا نقلی دلائل سے مذکورہ موارد کو تخصیص دیں گے اور آیہ ان موارد کوشامل نہیں ہوگی.

۲۔ لفظ ''فؤاد'' اور اس کی جمع ''افئدہ'' سے مراد اور قرآن کی اصطلاح میں قلب اور فلسفہ کی اصطلاح میں ''نفس'' سے کیا مراد ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں فواد لفظ قلب کے مترادف ہے اسی بنا پر ہم حضرت موسیٰ کی داستان میں پڑھتے ہیں:

.....

(۱) جب لفظ علم، عرف میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد معلومات ہے لیکن دقیق فلسفی اعتبار سے علم کی تین قسمیں ہیں: ''بے خبری''، ''نصف معلومات''، ''پوری معلومات''۔ ''بے خبری'' وہ علم ہے جس کے بارے میں انسان کوئی درک وفہم نہیں رکھتا ہے حتی اس سے متعلق سوال کے مقابلہ میں کہتا ہے کہ: میں نہیں جانتا ہوں! لیکن تجربیات اور عقلی دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ایسی بے خبری کا علم انسان میں بہت زیادہ ہے، ''نصف آگاہی'' وہ علم ہے جس میں انسان اس بات سے باخبر ہے کہ وہ نہیں جانتا ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ باخبر ہوجائے، جس طرح ہم بہت سی چیزوں کے بارے میں جانتے ہیں لیکن فعلاً ہم غافل ہیں، لیکن کسی انگیزۂ معانی یا اس کے متناسب محرک سے روبرو ہونے یا انسان کو متوجہ کرنے والے دوسرے عوامل کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم اسے جانتے ہیں، ''پوری معلومات'' یہ ہے کہ ہمارے پاس علم ہے اور اس بات کا بھی علم ہے کہ ہم جانتے ہیں، جب عرف میں کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں مسئلہ کا علم رکھتا ہے تو یہی تیسرا معنی مراد ہوتا ہے۔

﴿وَ أَصبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَیٰ فَارِغاً إِن کَادَت لَتُبدِی بِهِ لَو لا أَن رَّبَطنَا عَلَیٰ قَلبِهَا لِتَکُونَ مِنَ المُؤمِنِینَ﴾(۱)

اور موسیٰ کی ماں کا دل ایسا بے چین ہو گیا اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کر دیتے تو قریب تھا کہ راز کو فاش کر دیتی تا کہ مومنوں میں سے ہو جائے۔

اس آیہ میں فواد اور قلب کا ایک ہی چیز پر اطلاق ہوا ہے اور حالت اضطراب (دل کا متحیر ہونا) اور احساس آرام کو دل کی طرف نسبت دی گئی ہے.

حقیقت میں یہ دو لفظیں انسان یا حیوان کے بدن میں ایک مخصوص عضو کے معنی میں ہیں کہ جن کا کام خون کو صاف کرنا اور اس کو گردش دینا ہے اور عام طور پر سینہ کے بائیں حصہ میں ہے لیکن عرف میں احساسات، عواطف اور مرکز ادراکات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس لفظ کے لغوی وعرفی معنی کے درمیان رابطہ شاید اس طرح سے ہو کہ عرف عام تصور کرتا تھا کہ ادراک واحساس اس مخصوص اعضا سے مربوط ہیں اور انہیں کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔(۲)

.....

(۱) سورہ قصص آیت: ۱۰۔(۲) قرآن میں بھی کبھی لفظ قلب اسی عرفی اصطلاح میں استعمال ہوتا ہے جیسے ﴿فَإِنَّهَا لا تَعمَی الأَبصَارُ وَ لَکِن تَعمَی القُلُوبُ الَّتِی فِی الصُّدُورِ﴾ حج/۴۶ (کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ دل جو ان سینہ میں ہے وہی اندھا ہو جایا کرتا ہے) ممکن ہے کہا جائے کہ یہ رابطہ ایک خیالی رابطہ ہے تو کیوں قرآن اشارتاً اس کی تائید کرتا ہے؟ جواب میں کہا جا سکتا ہے: چونکہ قرآن مجید انسانوں کی زبان میں نازل ہوا ہے لہٰذا اس حصہ میں ان کی اصطلاحات کے مطابق گفتگو کی ہے اور مراد یہ ہے کہ تمہارے چہرے کی آنکھوں کے بارے میں نہیں کہا ہے بلکہ تمہارے دل کی آنکھیں اندھی ہیں، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ صدور سے مراد جسمانی سینہ نہیں ہے بلکہ دل سے مراد درک کرنے والی قوت ہے اور صدر سے مراد انسان کا باطن ہے؛ اس لئے کہ عرف میں معمولاً جب باطن کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ: ''میرے سینہ میں راز ہے''۔ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلِیمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ لقمان/۲۳. خداوند عالم سینوں کے اندر کے حالات کو بھی جانتا ہے، اس...

بہر حال قرآن میں فواد وقلب کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد سینہ کے اندر مادی عضو یا کوئی روح نہیں ہے بلکہ متعدد قوتوں کا مالک ہونا ہے اس لئے کہ آیات قرآن میں مختلف امور کو قلب اور فواد کی طرف نسبت دی گئی ہے جو ہر قسم کی روحی توانائی سے مربوط ہے، مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیتوں میں ''فقہ'' جو دقیق فہم کے معنی میں ہے اور ''عقل'' جو حقیقی دریافت کے معنی میں ہے قلب کی طرف نسبت دی گئی ہے.

﴿أَ فَلَم يَسِيرُوا فِي الأرضِ فَتَكُونَ لَهُم قُلُوبٌ يَعقِلُونَ بِهَا﴾

کیا یہ لوگ روئے زمین پر چلتے پھرتے نہیں (اور غور وفکر نہیں کرتے) تا کہ ان کے ایسے دل ہوتے جس سے حق باتوں کو سمجھتے۔(۱)

﴿وَ لَقَد ذَرَأنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِنَ الجِنِّ وَ الإِنسِ لَهُم قُلُوبٌ لا يَفقَهُونَ بِهَا وَ لَهُم أَعيُنٌ لا يُبصِرُونَ بِهَا وَ لَهُم آذَانٌ لا يَسمَعُونَ بِهَا. . .﴾(۲)

اور گویا ہم نے بہت سے جنات اور آدمیوں کو (اپنے اختیار سے عمل انجام دیں چونکہ غلط راستہ کو انتخاب کیا ہے) جہنم ہی کے واسطے پیدا کیا ان کے پاس دل تو ہیں مگر اسسے سمجھتے نہیں ہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر

... لئے کہ بدن کی سب سے چھپی اور مخفی جگہ سینہ ہے۔ لہٰذا قلب یعنی مرکز ادراک اور صدر یعنی انسان کے باطن کا ایک حصہ ہے. حتی اگر ہم یہ قبول نہ کریں کہ قلب مرکز احساس وادراک ہے تو کم از کم ایک ایسا عضو ہے جو ہر عضو کے مقابلہ میں بہت زیادہ روح سے مربوط ہے اور ایسا عضو ہے جو بدن سے روح کی جدائی کے وقت سب سے آخر میں بیکار ہوتا ہے. روح کا بدن کے تمام اعضا سے رابطہ مساوی نہیں ہے. اور بعض اعضا جیسے قلب ومغز میں یہ رابطہ سب سے پہلے اور قوی ہوتا ہے اور شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ: قلب سے روح کا رابطہ سب اعضا پر مقدم ہے۔

(۱) سورہ حج/۴۶۔

(۲) سورہ اعراف/۱۷۹۔

اس سے دیکھتے نہیں اور انکے پاس کان تو ہیں مگر اس سے سنتے ہی نہیں۔

دوسری طرف احساسات اور عواطف چاہے مثبت ہوں یا منفی مثال کے طور پر اچھا لگنے اور برا لگنے کو دل کی طرف نسبت دی گئی ہے جیسے

﴿إِنَّمَا المُؤمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَت قُلُوبُهُم﴾(۱)

سچے ایماندار تو بس وہی لوگ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپنے لگتے ہیں۔

﴿وَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحدَهُ إِشمَأَزَّت قُلُوبُ الَّذِينَ لا يُؤمِنُونَ بِالآخِرَةِ﴾

اور صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل متنفر ہو جاتے ہیں۔(۲)

دوسری آیات میں قلب کو، مکان ایمان (۳) مرکز انحراف (۴) بیماری (۵) اور مہر زدہ (۶) سمجھا گیا ہے، بعض آیات کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قلب علم حضوری بھی رکھتا ہے جیسے.

﴿كَلاّ بَل رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكسِبُونَ كَلاّ إِنَّهُم عَن رَّبِّهِم يَومَئِذٍ لَّمَحجُوبُونَ﴾(۷)

ہرگز نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو اعمال کرتے ہیں ان کا انکے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے بیشک اس دن اپنے پروردگار سے روک دیئے جائیں گے۔

---

(۱) انفال/۲۔(۲) زمر/۴۵۔

(۳) حجرات/۷

(۴) آل عمران/۷

(۵) بقرہ/۱۰

(۶) بقرہ/۷۔(۷) مطففین/۱۴، ۱۵۔

ان لوگوں کو روز قیامت خداوند عالم کا جلوہ دیکھنا چاہیئے لیکن ان کے اعمال آئینہ دل پر تصویر کے مانند ہو گئے ہیں جو مانع ہے کہ انوار الٰہی اس میں جلوہ گر ہو اس لئے دل وہ شی ہے جو خداوند عالم کا مشاہدہ کرتا ہے اور یہ معنی روایات میں بھی آیا ہے:

"لا تدرکُهُ العُیُون بِمشاهدةِ العیان ولکِن تُدرکُه القلُوب بحقَائقِ الإیمان"

ظاہری آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتی ہیں لیکن قلوب اس کو حقائق ایمان کے ذریعہ درک کرتے ہیں.(۱)

قرآن میں انتخاب واختیار کو بھی دل کی طرف نسبت دیا گیا ہے:

﴿لا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغوِ فِی أَیمَانِکُم وَلکِن یُؤَاخِذُکُم بِمَا کَسَبَت قُلُوبُکُم﴾(۲)

تمہاری لغو قسموں پر خدا تم سے گرفت نہیں کرے گا مگر ان قسموں پر ضرور تمہاری گرفت کرے گا جو تم نے قصداً دل سے کھائی ہو۔

﴿وَ لَیسَ عَلَیکُم جُنَاحٌ فِیمَا أَخطَأتُم بِهِ وَلکِن مَّا تَعَمَّدَت قُلُوبُکُم وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوراً رَحِیماً﴾(۳)

اور ہاں اگر بھول چوک ہو جائے تو اس کا تم پر کوئی الزام نہیں ہے مگر جب تم دل سے (انتخاب کیا ہے) جان بوجھ کر کرو (مواخذہ کیا جائے گا) اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ قلب قرآن مجید میں ایسی شئ ہے جو علم حضوری اور علم حصولی بھی رکھتا ہے

.....

(۱) نہج البلاغہ، خ/۱۷۹۔(۲) سورہ بقرہ /۲۲۵۔

(۳) سورہ احزاب/۵۔

اوراحساس،ادراک، ہیجان،عواطف،انتخاب اوراختیارکوبھی اسی کی طرف نسبت دی جاتی ہے.تنہا وہ چیز جس کونفس کی طرف نسبت دی جاتی اور قلب کی طرف نسبت نہیں دی جاتی ہے وہ افعال بدن ہیں.اس لئے کہ'' قلب وفؤاد'' ایک مخصوص قوت نہیں ہیں.(۱) قرآن مجید میں ان کے موارد استعمال کے اعتبار سے اس چیز کے مترادف ہے جسے فلسفہ میں روح یانفس کہاجاتا ہے۔بہرحال بعض آیات سے استفادہ ہوتاہے کہ خداوندعالم نے معرفت کے لئے اسباب خلق کئے جن میں سب سے مہم آنکھ،کان اوردل ہیں.(۲)

.....

(۱)فلسفی بحثوں میں انسان سے سرزدہونے والے ہرکام کے لئے ایک مخصوص مبداہے۔جب ہم مختلف اقسام کے ادراکات کامشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ اورمختلف ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ان سب چیزوں کے لئے ایک قوت ہے جیسے حس مشترک،خیال،حافظہ اور عقل لیکن نفسیاتی کیفیات اورانفعالات کے لئے کسی فاعلی مبداکے قائل نہیں ہیں اوراس کونفس کی طرف نسبت دیتے ہیں۔(۲)قرآن مجید مختلف وسائل سے معرفت ودانش کے حصول کے سلسلہ میں ایک خاص اہمیت و احترام کا قائل ہے لیکن انسان کے لئے بعض ایسے علم کوبھی شمار کیاہے.جومعمولی راہوں سے حاصل نہیں ہوتے ہیں،ان میں سے منجملہ وہ علوم ہیں جووحی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں:﴿الرَّحمٰنُ عَلَّمَ القُرآنَ ﴾رحمٰن ۱/۲۔ہم معمولی راہوں سے عالم قرآن ہوتے ہیں،لیکن پیغمبرؐ علم حضوری سے حقیقت وذات وحی کوحاصل کرکے عالم قرآن ہوتاہے۔انبیاء پروحی کے علاوہ،'' علم لدنی''نیز غیرانبیاء کے لئے وحی سے حاصل ہونے والے علوم غیر معمولی راہوں کوبیان کرتے ہیں۔لفظ لدنی قرآن میں نہیں آیاہے لیکن ایسے علم کانام لیاگیاہے.جوخداوندقدوس کی طرف (لدنی) سے ہے:﴿وَ عَلَّمنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلماً ﴾کہف/ ۶۵۔ہم نے اسے اپنے پاس سے علم دیا۔اورحضرت مریم اور مادرموسی کے سلسلہ کی وحی میں آیاہے کہ:﴿وَ أَوحَينَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَن أَرضِعِيهِ فَإِذَا خِفتَ عَلَيهِ فَأَلقِيهِ فِي اليَمِّ وَ لاتَخَافِي وَ لا تَحزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيكِ وَ جَاعِلُوهُ مِنَ المُرسَلِينَ﴾ قصص/۷۔(اورہم نے موسی کی ماں کے پاس یہ وحی بھیجی کہ تم اس کودودھ پلالو پھر جب اس کی نسبت کوئی خوف ہوتو اس کودریا میں ڈال دواورتم بالکل نہیں ڈرنااورنہ ہی سہمنا ہم اس کو پھرتمہارے پاس پہونچادیں گےاوراس کورسول بنائیں گے۔) مادرموسی نے اسی وحی کے ذریعہ اپنے فرزند کے مستقبل کے بارے میں علم وخبرحاصل کیاتھا۔اورحضرت مریم کے بارے میں فرماتاہے: ﴿إِذ قَالَتِ المَلَائِكَةُ يَامَرِيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنهُ اسمُهُ المَسِيحُ عِيسَى ابنُ مَرِيَمَ ...﴾آل عمران/۴۵۔(جب فرشتوں نے کہااے مریم خداتم کوصرف اپنے حکم کی خوشخبری دیتاہے.جس کانام عیسی مسیح ابن مریم ہوگا)

مذکورہ اسباب انسان کو صحیح راہ کی طرف متوجہ اور راہ معرفت میں گمراہی سے بچانے نیز مبدأ ومعاد اور کمال کے حصول کی راہ کے بارے میں عمومی معارف کے درک میں مدد پہونچانے کے لئے مہم کردار ادا کرتے ہیں. اور اگر کوئی ان کو استعمال کرے اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے تو مبدا، معاد اور راستہ کی راہنمائیوں کو پہچان لے گا لیکن یہ اسباب، کمال کے حصول کی راہ کو لمحہ بہ لمحہ اور دقیق انداز میں بتانے سے ناتواں ہیں اور یہ کہ کون سا کام سعادت لاتا ہے اور کون سا کام برائی پیدا کرتا ہے و... کے لئے بالکل صحیح راہ عمل کی تعیین کے سلسلہ میں ان پر اکتفاء نہیں کیا جا سکتا ہے. حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کے درمیان لمحہ بہ لمحہ اور بالکل صحیح رابطہ کے تعیین کو کشف کرنا ان اسباب کی توانائی سے باہر ہے. اسی لئے وحی کی ضرورت ہے اور اس طرح معارف وحی کی اہمیت ہم پر آشکار ہو جاتی ہے البتہ یہ وہی مخصوص راہ ہے جسے خداوند عالم نے بشر کی حقیقی اور نہائی سعادت حاصل کرنے کے لئے انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے. اسی لئے عمومی اسباب معرفت، راہ سعادت کے عمومی طریقے بیان کرنے میں بہت کارساز ہیں لیکن خطا کا احتمال اور متاثر ہونے کا امکان نیز ان کی محدودیت وغیرہ کی وجہ سے راہ سعادت کی تفصیلی معرفت میں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے، لہذا ایک اور راہ کی ضرورت ہے اور وہ راہ وحی و نبوت ہے۔

خواہش اور ارادہ

خواہش و ارادہ جو اختیاری کاموں میں توانائی کا کردار ادا کرتا ہے اختیاری فعالیت میں دوسرا ضروری عنصر ہے. جو معرفت انسان کو قصد و حرکت عطا نہیں کرتی ہے بلکہ صرف راستہ بتاتی ہے. یہ تو خواہشات ہیں جو راہ کی شناخت کے بعد انسان کو جستجو میں ڈال دیتے ہیں. خواہش و ارادہ کا رابطہ ایک مہم بحث ہے جس کے بارے میں دو مختلف نظریے بیان ہوئے ہیں. بعض لوگوں نے ارادہ کو شدید خواہش کہا ہے اور بعض لوگوں نے شدید شوق یا شدید خواہش کو ارادہ کے تحقق کی شرط مانا ہے. دونوں صورتوں میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسان اور اس کے مشابہ مخلوق کسی بھی مقام پر ارادہ نہیں کر سکتی ہے مگر

یہ کہ اس میں خواہش موجود ہو. انسان کے اندر حیوانی اور پست نیز انسانی ومتعالی و بلند خواہشات ہیں جن سے انسان، جنسی یا غذا اور دوسرے جسمانی امور کی خواہش کرتا ہے اس سلسلہ میں بہت زیادہ بحث ہوئی ہے اور متعدد و مختلف تقسیم بندی ہوئی ہے جن میں سے مہم مندرجہ ذیل ہیں.

خواہشات کی تقسیم بندی

سب سے اہم تقسیم بندی میں سے ایک تقسیم اندرونی رغبتوں کو چار قسم غرائز، عواطف انفعالات اور احساسات میں منقسم کرنا ہے.

غرائز

انسان کی حیاتی ضرورتوں کو بیان کرنے والی اور جسم کے کسی ایک اعضاء سے مربوط باطنی رغبت کو غریزہ کہا جاتا ہے جیسے کھانے اور پینے کی خواہش جو انسان کی طبیعی ضرورت کو بھی دور کرتی ہے اور معدہ سے مربوط ہے یا جنسی خواہش نسل کی بقا کا ضامن ہے اور مخصوص عضو سے مربوط ہے.

عواطف

عواطف. وہ خواہش ہے جو دوسرے انسان کیلئے ظاہر ہوتی ہے جیسے بچوں کے لئے والدین کی محبت اور اسکے برعکس یا کسی دوسرے انسان کے لئے ہماری مختلف رغبتیں اجتماعی، طبیعی یا معنوی رابطہ جس قدر زیادہ ہوگا محبت بھی اتنی ہی شدید تر ہوگی. جیسے والدین اور فرزند کے رابطہ میں ایک فطری حمایت موجود ہے. اور استاد و شاگرد کے رابطہ میں معنوی حمایت موجود ہے.

انفعالات

انفعالات یا منفی میلان جو عواطف کے مقابلہ میں ہے اور اس کے برعکس یعنی ایک روحی حالت ہے جس کی بنیاد پر انسان ناپسندیدگی یا احساس ضرر کی وجہ سے کسی سے دوری کرتا ہے یا اس کو ترک کر دیتا ہے اسی وجہ سے نفرت، غصہ، کینہ وغیرہ کا انفعالات میں شمار ہوتا ہے.

احساسات

بعض اصطلاحات کے مطابق احساسات ایسی کیفیت ہے جو مذکورہ تینوں موارد سے بہت شدید ہے اور فقط انسان سے مربوط ہے. گذشتہ تینوں کیفیات کم وبیش حیوانات میں بھی موجود ہیں لیکن احساسات جیسے احساس تعجب ، احساس احترام ، احساس عشق وعبادت، یہ درونی رغبتیں کبھی سبھی چیزوں میں موثر ہوتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے منضم اور ملکر اثر انداز ہوتی ہیں .اور یہ ادراک ومعرفت کے اسباب سے مربوط ہیں اوران پر ادرا کی قوتیں بھی موثر ہیں اورانھیں سے بعض خواہشات جنم لیتی ہیں۔

خواہشات کی دوسری تقسیم فردی واجتماعی خواہشات کی تقسیم ہے .فطری خواہشات معمولاً فردی اور عواطف کی طرح ہیں اور دوسری خواہشات غالبًا اجتماعی ہیں۔

دوسرے اعتبار سے خواہشات کو مادی وروحی اور پھر روحی خواہشات کو پست اور بلند خواہشات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے. خواہشات اوراس کے مانند غرائز کی تامین سے بدن کی ضرورت ختم ہوجاتی ہے یہ مادی خواہشات ہیں .اور وہ خواہشات جو بدن کی ضرورت کے پورا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں انہیں روحی خواہشات کہا جاتا ہے جیسے اس وقت خوشی کی ضرورت جب جسم تو سالم ہے لیکن روح مسرور نہیں ہے .اس لئے اس تقسیم بندی کے اعتبار سے خواہشات تین طرح کی ہیں:

(۱) وہ خواہشات جو مادی اور جسمانی پہلو رکھتی ہیں.

(۲) وہ خواہشات جو مادی اور روحی پہلو رکھتی ہیں لیکن وہ روح کی پست خواہشات میں سے ہیں جیسے خوشی اور سکون.

(۳) وہ خواہشات جو مادی اور روحی پہلو رکھتی ہیں اور روح کی عالی خواہشات میں سے ہیں جیسے ہدف تک رسائی اور آزادی کی خواہش اسی لئے بعض لوگوں نے عالی ضرورتوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱)حق کی تلاش اور حقائق کی معرفت.

(۲)فضیلت کی خواہش نیز عدالت، حریت کی آرزو۔

(۳)مطلق خوبصورتی کی خواہش، اس لئے کہ وہ خوبصورتیاں جن سے انسان کی خواہش مربوط ہوتی ہے. بہت زیادہ اور مختلف ہیں بعض بصارت سے مربوط ہیں تو بعض سماعت سے اور بعض شعر وشاعری کی طرح خیالات سے مربوط ہیں لیکن مطلقاً خوبصورتی کی خواہش بلند وبالا آرزوں میں سے ہے.

بعض لوگوں نے چوتھی قسم کا بھی اضافہ کیا ہے اور اس کو ''مذہبی حس'' کا نام دیا ہے اور بعض لوگوں نے ان تینوں کو بھی اسی چوتھی قسم کے زیر اثر قرار دیا ہے.

ایک دوسرے اعتبار سے خواہشات دو گروہ میں تقسیم ہوتے ہیں:

ا۔ وہ خواہشات جن کی حفاظت، انسان کی موجودیت اور بقا میں مددگار ہے؛ جیسے کھانا پینا لباس اور حفاظت ذات کی خواہش.

۲۔ وہ خواہشات جو کسی کی حفاظت کے لئے نہیں ہیں بلکہ تکامل کے لئے ہیں.

اس سلسلہ میں بھی تجزیہ وتحلیل ہوئی ہے کہ خواہشات میں سے حقیقی کون ہیں اور غیر حقیقی کون سی ہیں تحقیق وتحلیل کی روشنی میں انسان کے لئے ۲ سے لیکر ۱۲ حقیقی خواہشیں تسلیم کی گئی ہیں. مذکورہ خواہشات کبھی ایک طرف اور ایک جہت میں ہیں تو کبھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہیں مثال کے طور پر اکثر حیوانی اور انسانی خواہشات کے درمیان تعارض اور ناہماہنگی پائی جاتی ہے اور جب انسان دونوں خواہشوں کو بطور کامل انجام نہیں دے پاتا ہے تو مجبوراً ایک کو انتخاب کر کے دوسرے پر ترجیح دیتا ہے اور دوسرے کو محدود یا اس سے چشم پوشی کر لیتا ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں مسئلہ انتخاب اور ایک خواہش کو دوسری خواہش یا بہت سی خواہشوں پر ترجیح دینے اور اسکے معیار کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔

خواہشات کا انتخاب

معمولاً انسان کہ جس طرح نفسیات کے ماہرین نے کہا ہے؛ خواہشات کے ٹکراؤ کے وقت

ایسی خواہش کی طرف حرکت کرتا ہے اور ایسی خواہشات کے زیر اثر آجاتا ہے جو جذباتی ہوتی ہیں یا اس خواہشات سے بار بار سیر ہونے کی وجہ سے ایک عادت سی ہوگئی ہو یا بہت زیادہ تبلیغ کی بنا پر لوگوں کی توجہ اس کی طرف مائل ہوگئی ہو اور تمام خواہشات کے سلسلہ میں ایک قسم کی غفلت اور بے توجہی برتی گئی ہو۔ بہت ہی اہم اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ماہر نفسیات کی یہ گفتگو متاثر انسانوں کے بارے میں ہے لیکن ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ فعّال ہو منفعل نہ ہو تو کن معیاروں کی بنا پر بعض خواہشات کو بعض پر ترجیح دے گا؟

قرآن مجید ایک عام نگاہ میں عالی خواہشات کو مادی اور پست خواہشات پر ترجیح کی تاکید کرتا ہے. قرآن مجید میں بعض حیوانی خواہشات حقارت و مذمت کے ساتھ ذکر ہوئے ہیں. سورہ معارج کی ۱۹ ویں آیہ میں فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً وَ إِذَا مَسَّهُ الخَيرُ مَنُوعاً إِلا المُصَلِّينَ﴾

بیشک انسان بڑا ہی لالچی پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف اور ناگواری کا سامنا ہوتا ہے تو گھبرا جاتا ہے اور جب اسے بھلائی اور آسودگی حاصل ہوئی تو بخیل بن جاتا ہے مگر جو لوگ نمازیں پڑھتے ہیں۔

آیہ شریفہ یہ ماننے کے بعد کہ انسان کو اس طرح خلق کیا ہے کہ اس کے اندر بعض پست خواہشات موجود ہیں آگاہ کرتی ہے کہ اگر اپنے اختیار سے بہت ہی بلند کمالات کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو ان خواہشات کا اسیر نہیں ہونا چاہئیے. بلکہ انہیں عظیم کمالات کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہئیے. چونکہ کمال، ایثار کے دامن میں جنم لیتا ہے اسی لئے شہوت پرستی اور شکم پُری اور اس کے مثل چیزیں اس کی سد راہ نہیں ہونا چاہئیے. اور جس وقت کمال فداکاری سے مربوط ہو تو مادی حیات کو اس کے شہادت کے فیض سے روکنا نہیں چاہئیے. مذکورہ حقیقت مندرجہ ذیل دو آیتوں میں بھی مورد توجہ اور

تاکید ہے۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَ البَنِينَ وَ القَنَاطِيرِ المُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الفِضَّةِ وَ الخَيلِ المُسَوَّمَةِ وَ الأنعَامِ وَ الحَرثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الحَيٰوةِ الدُّنيَا وَ اللّٰهُ عِندَهُ حُسنُ المَئَابِ...﴾(۱)

لوگوں کوان کی مرغوب چیزیں بیویوں اور بیٹوں اور سونے چاندی کے بڑے بڑے لگے ہوئے ڈھیروں اور عمدہ عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی کے ساتھ الفت بھی کر کے دکھادی گئی ہے یہ سب دنیاوی زندگی کے فائدہ ہیں اور اچھا ٹھکانا تو خدا ہی کے یہاں ہے۔

﴿اعلَمُوا أَنَّمَا الحَيٰوةَ الدُّنيَا لَعِبٌ وَلَهوٌ وَ زِينَةٌ وَ تَفَاخُرٌ بَينَكُم وَ تَكَاثُرٌ فِي الأموَالِ وَ الأولادِ كَمَثَلِ غَيثٍ أَعجَبَ الكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَيٰهُ مُصفَرّاً ثُمَّ يَكُونُ حُطَاماً وَ فِي الآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَ مَغفِرَةٌ مِنَ اللّٰهِ وَ رِضوَانٌ وَ مَا الحَيٰوةُ الدُّنيَا إلا مَتَاعُ الغُرُورِ﴾(۲)

جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال واولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ خواہش یہ اس بارش کی سی طرح ہے (جو سبزہ اگاتی ہے) جس کی ہریالی کسانوں کو خوش کر دیتی ہے اور پھر وہ کھیتی سوکھ جاتی ہے اور اس کی ہریالی زرد پڑ جاتی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیاوی زندگی تو بس غرور کا ساز وسامان ہے۔

---

(۱) سورہ آل عمران/۱۴۔ (۲) سورہ حدید/۲۰۔

دوسری طرف بلند و بالا خواہشوں کی بہتری وتقویت کی قرآن مجید میں بھی تاکید ہوئی ہے.
مثال کے طور پر قرآن کی روشنی میں مقام ومنزلت (۱) اور ہمیشہ باحیات رہنے کی خواہش اور خداوند عالم کی طرف تمایل کی خواہش کو مورد توجہ قرار دیا گیا ہے. اس سلسلہ میں بعض آیتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں. سورہ فاطر کی ۱۰ ویں آیت میں انسان کے مقام ومنزلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے ذریعہ متعالی اور بلند معارف کی نشاندہی کی گئی ہے۔

﴿ مَن كَانَ يُرِيدُ العِزَّةَ فَلِلّٰهِ العِزَّةُ جَمِيعاً ﴾

جو شخص عزت کا خواہاں ہے (تو جان لے) ساری عزت تو خدا ہی کیلئے ہے

سبھی مقام وعزت چاہتے ہیں. (۲) حقیقت میں عزت واحترام اور آبرو کا حاصل کرنا برا نہیں ہے. لیکن یہ جاننا چاہئے کہ عزت فقط معاشرہ میں پائی جانے والی اعتباری عزتوں سے مخصوص نہیں ہے. مذکورہ آیہ اسی خواہش کو بیان کر رہی ہے کہ: اگر تم فقیر اور محتاج لوگوں میں عزیز ہونا چاہتے ہو تو غنی وبلند پروردگار کے نزدیک کیوں عزیز نہیں ہونا چاہتے؟ جبکہ عزت حقیقی فقط خداوند عالم کے لئے ہے۔

---

(۱) قدر ومنزلت چاہنا ان خواہشات میں سے ہے جو اصل میں فطری ہے اور غالبًا اس کی ابتدائی تجلیات نوجوانی میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور نفسیات شناسی میں بلوغ، انسان کا نقطۂ الفت شمار ہوتا ہے۔ اس کے پہلے بچے اکثر بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں، اس زمانے میں بچہ چاہتا ہے کہ ''خود مختار ہو'' دوسروں کی باتوں پر عمل نہ کرے، جو خود سمجھتا ہے اس پر عمل کرے اور امر ونہی سے حساس ہو جاتا ہے۔ یہ حالت بھی اپنی جگہ انسان کے تکامل میں مفید وموثر ہے، یہ حکمت خداوند قدوس ہے کہ جس کی حقیقت حب کمال ہے لیکن معرفت کے نقص کی بنیاد پر محدود شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، قدر ومنزلت چاہنا، بزرگوں میں اور اجتماع میں دھیرے دھیرے مقام ومرتبہ کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ وہ شخص چاہتا ہے کہ حاکم ہو جائے اور دوسرے اس کی بات کو سنیں اور مانیں، اس کی بھی مختلف شکلیں ہیں جن میں سے منجملہ شہرت، ریاست، مقام ومرتبہ اور مشہور ہونے کی خواہش ہے۔ (۲) قرآن کہتا ہے کہ حتی بعض بت پرست عزت واحترام حاصل کرنے کے ارادہ سے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ﴿وَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللّٰهِ آلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُم عِزّاً﴾ مریم/۸۱۔ اور ان لوگوں نے خدا کے علاوہ دوسرے معبود انتخاب کر لئے ہیں تا کہ ان کی عزت کا سبب ہوں۔

بقا کی خواہش بھی انسان کی فطری خواہشوں میں سے ہے انسان کبھی مرنا نہیں چاہتا ہے اس لئے کہ وہ سوچتا ہے کہ مرنا، نابود ہونے کے معنی میں ہے یا یہ چاہتا ہے کہ اس کی عمر طولانی ہو. قرآن مجید بنی اسرائیل کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ لوگ ہزار سال زندہ رہنا چاہتے ہیں:

﴿ يَوَدُّ أَحَدُهُم لَو يُعَمَّرُ أَلفَ سَنَةٍ ﴾(۱)

ہر شخص چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار برس کی عمر دی جاتی۔

ہزار کثرت کی علامت ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک ہزار ایک سال نہیں چاہتا ہے یہ خواہش تمام انسانوں میں ہے حتی ہمارے جد، حضرت آدمؑ میں بھی موجود تھی اسی خواہش کی بنا پر شیطان نے ان کو دھوکا دیا ہے:

﴿هَل أَدُلُّکَ عَلیٰ شَجَرَةِ الخُلدِ وَ مُلکٍ لایَبلَیٰ﴾(۲)

کیا میں تمہیں ہمیشگی کا درخت اور وہ سلطنت جو کبھی زائل نہ ہو بتادوں۔

یہ آیہ بھی بقا اور مقام و منزلت کی خواہش کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس نکتہ کو بھی بیان کررہی ہے کہ انسان میں یہ خواہش فطری ہے اس کو منفی عنصر نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ معرفت میں موجودہ نقص کو برطرف کرنا چاہیے اور متوجہ رہیں کہ یہ دنیا بقا کے قابل نہیں ہے اور ابدی حکومت خدا کے پاس ہے. انسان کو دنیا کے بجائے آخرت سے علاقہ مند ہونا چاہئے:

﴿وَ الآخِرَةُ خَيرٌ وَ أَبقَیٰ﴾(۳)

اور آخرت کہیں بہتر اور دیرپا ہے۔

.....

(۱) بقرہ/۹۶۔

(۲) طہ/۱۲۰

(۳) اعلیٰ/۱۷

آخر کار تمام خواہشات پر نہائی خواہش برتر ہے خصوصاً انسان کا عمیق ووسیع وجود قرب خدا کے لئے اور اسی کی طرف موجزن ہے، افسوس! کہ جس سے اکثر ماہر نفسیات ناواقف ہیں۔ یہ خواہش احساسات وعواطف کی طرح نہیں ہے بلکہ ان دونوں سے بہت زیادہ لطیف اور پوشیدہ ہے، چونکہ انسان کا نہائی کمال اسی سے وابستہ ہے لہذا اس کو فعال کرنا بھی خود انسان کے ہاتھ میں ہے.

غرائز اور طبعی خواہشات، خود بخود فعال ہوتے ہیں مثال کے طور پر خلقت کے وقت ہی سے بچہ کے اندر بھوک کا احساس ہوتا ہے نیز جنسی خواہش بالغ ہونے کے وقت فعال ہوتی ہے اور انسان اس کو پورا کرنے کے راستہ بھی تعیین کرتا ہے. لیکن معنوی کمالات اولاً خود بخود فعال نہیں ہوتے ان کو فعال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے. دوسرے موضوع اور اس کے متعلق کو پہچاننے کے بعد اختیاری انداز میں اس کو انجام دیا جاتا ہے یعنی جب کوئی خواہش انسان کے اندر فعال ہو تو دھیرے دھیرے قدم بڑھانا چاہئے تا کہ نہائی مراحل سے نزدیک ہوسکیں، اس سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کی داستان سے مربوط آیتیں رہنمائی کرتی ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کے ڈوبنے کے بعد فرمایا:

﴿ لا أُحِبُّ الأفِلِينَ ﴾(۱)

غروب ہونے والی چیز کو میں پسند نہیں کرتا۔

یعنی تمام انسان غروب نہ کرنے والے وجود کی طرف متمایل ہوجاتے ہیں. خواہش اور عبادت کی رغبت کو ایسی چیز سے مرتبط ہونا چاہئے جو ہمیشہ موجود ہو ایسا محبوب ہو جو ہمیشہ اسکے پاس رہ سکتا ہو اور وہ خداوند عالم کے علاوہ کوئی نہیں ہے. خداوند عالم سے محبت کے لئے جو چیز خدا سے مربوط ہے (منجملہ ایمان) انسان کے لئے بھی محبوب ہوجانا چاہئے:

﴿وَ لكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيكُمُ الإِيمَانَ﴾(۲)

.....

(۱) انعام/۷۶ (۲) حجرات/۷

لیکن خدا نے تو تمہیں ایمان کی محبت دی ہے۔

خداوند عالم پر ایمان کی وجہ سے انسان محبوب ہوتا ہے اور یہ قرب الٰہی کے لئے ایک راہ ہے .اور اس راہ میں اس وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب انسان اپنی زندگی میں خدا اور اس کی رضا کے علاوہ کوئی خواہش نہ رکھتا ہو:

﴿إلا ابتِغَاءَ وَجهِ رَبِّهِ الأعلَىٰ﴾(۱)

(کوئی بھی نعمت خدا کی بارگاہ میں جزا کے لئے سزاوار نہیں ہے) مگر یہ کہ صرف اپنے عالیشان پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انجام دیا ہو۔

خواہشات کے انتخاب کا معیار

یہاں یہ سوال درپیش ہے کہ مادی خواہشات پر عالی خواہشات کی ترجیح کے لئے قرآن مجید کا کیا معیار ہے؟ ایک آسان تجزیہ وتحلیل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک خواہش کے دوسری خواہش پر ترجیح کے لئے انسان کے پاس حقیقی معیار، لذت ہے .انسان ذاتاً یوں خلق ہوا ہے کہ اس چیز کی جستجو میں رہے جو اس کی طبیعت کے لئے مناسب اور لذیذ ہو اور ہر رنج والم کا باعث بننے والی شئی سے گریزاں ہو .اور وہ فوائد جو بعض نظریات میں خواہشات کے معیار انتخاب کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں وہ ایک اعتبار سے لذت کی طرف مائل ہیں۔

اب یہ سوال درپیش ہے کہ اگر دو لذت بخش خواہشوں کے درمیان تعارض واقع ہو تو ہم کس کو ترجیح دیں اور کس کا انتخاب کریں؟ جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے جس میں زیادہ لذت ہو یا جو زیادہ دوام رکھتی ہو یا زیادہ کمال آفرین ہو اسی کو مقدم کیا جائے گا .لہذا اکثیر پائدار یا زیادہ کمال کا جو باعث ہو، اسے انتخاب کا معیار قرار دیا جائے گا۔

.....

(۱) سورہ لیل آیت ۲۰۔

بعض خواہشات کی تامین بہت زیادہ لذت بخش ہے لیکن کمال آفرین نہیں ہے بلکہ کبھی تو نقص کا باعث ہوتی ہے یا دوسری خواہشات کی بہ نسبت اس میں بہت کم لذت ہوتی ہے اور بہت کم کمال کا سبب بنتی ہے ایسی حالت میں انتخاب کے لئے ایجاد کمال بھی مد نظر ہونا چاہیئے ۔ بہت زیادہ لذت، بادوام اور ایجاد کمال کو مد نظر قرار دینے سے انسان مزید سوالات سے دوچار ہوتا ہے، مثال کے طور پر اگر دو خواہشیں زمان یا بہت زیادہ لذت کے اعتبار سے برابر ہوں تو کسے مقدم کیا جائے ؟ اگر ایک مدت کے اعتبار سے اور دوسرا بہت زیادہ لذت کے اعتبار سے برتری رکھتا ہو تو ایسی حالت میں کسے انتخاب کیا جائے ؟ آیا جسمانی اور مادی لذتیں بھی برابر ہیں ؟ اور کون سی جسمانی لذت کس روحی لذت پر برتری رکھتی ہے؟ آپ نے مشاہدہ کیا کہ یہ تینوں معیار، مقام عمل ونظر دونوں میں مشکلات سے روبرو ہیں اور گذشتہ دلیلوں کے اعتبار سے تمام انسانوں کے لئے بعض خواہشات کو بعض پر مقدم کرنا اور انتخاب کے سلسلہ میں صحیح قضاوت کرنا ممکن نہیں ہے۔

ایک بار پھر یہاں مسئلہ معرفت کی اہمیت اور مبدا ومعاد کی عظمت واضح ہوجاتی ہے۔ گذشتہ مشکلات کو حل کرنے کے لئے انسان کی حقیقت اور دوام وپایداری کی مقدار نیز اس کمال کے ساتھ رابطہ اور حد کو جسے حاصل کرنا چاہتا ہے، معلوم ہونا ضروری ہے. سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ کیا انسان موت سے نابود ہوجاتا ہے اور اسکی زندگی اسی دنیاوی زندگی سے مخصوص ہے یا کوئی دائمی زندگی بھی رکھتا ہے .اس کے بعد یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کون سے کمالات انسان حاصل کرسکتا ہے اور بالخصوص کمال نہائی کیا ہے؟ اگر یہ دو مسئلے حل ہوجائیں اور انسان اس نتیجہ پر پہونچ جائے کہ موت سے نابود نہیں ہوتا ہے اور اس کی ایک دائمی زندگی ہے نیز اسکا حقیقی کمال قرب الٰہی ہے اور اس کے لئے کوئی حد نہیں ہے تو معیار انتخاب واضح ہوجائے گا. جو چیز انسان کو اس دائمی کمال تک پہونچائے اسے فوقیت دیتے ہوئے اسی کے مطابق عمل انجام دیا جائے یہی عام معیار ہے لیکن رہی یہ بات کہ کون سی خواہش کن شرائط کے ساتھ اس نقش کو انجام دے گی اور کون سی حرکت ہمیں

اس دائمی اور بے انتہا کمال سے نزدیک یا دور کرتی ہے، ہمیں اس راہ کو وحی کے ذریعہ دریافت کرنا ہوگا اس لئے کہ وحی کی معرفت وہ ہے جو اس سلسلہ میں اساسی اور بنیادی رول ادا کرے گی لہٰذا سب سے پہلے مسئلہ مبدأ و معاد کو حل کرنا چاہیئے اور اسکے بعد وحی و نبوت کو بیان کرنا چاہئے تا کہ حکیمانہ اور معقول انتخاب واضح ہو جائے۔ اس نقطۂ نظر میں انتخاب کو سب سے زیادہ اور پایدار لذت اور سب سے زیادہ ایجاد کمال کے معیاروں کی مدد سے انجام دیا جا سکتا ہے انسان کی پوری زندگی کے مشخص و معین نہ ہونے اور اس کمال کی مقدار جسے حاصل کرنا چاہتا ہے اور سب سے بہتر خواہش کی تشخیص میں اس کی معرفت کے اسباب کی نارسائی کی بنا پر مذکورہ مشکلات جنم لیتے ہیں اور یہ تمام چیزیں اس (وحی کے) دائرہ میں حل ہو سکتی ہیں۔

اخروی لذتوں کی خصوصیات

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ قرآن کی روشنی میں دنیاوی لذتوں کے علاوہ اخروی لذتوں کے موارد ذکر ہیں۔ اور انسان کو لذتوں کے انتخاب میں انھیں بھی مورد توجہ قرار دینا چاہیئے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ لذت بخش اور سب سے زیادہ پائدار اور جو ایجاد کمال کا باعث ہو اسے انتخاب کرنا چاہیئے اسی بنا پر قرآن مجید نے آیات (نشانیاں) کے بیان کرنے کا ہدف دنیا و آخرت کے بارے میں تفکر اور دونوں کے درمیان موازنہ بتایا ہے:

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الآيَاتِ لَعَلَّكُم تَتَفَكَّرُونَ ☆ فِي الدُّنيَا وَ الآخِرَةِ﴾

یوں خداوند عالم اپنے احکامات تم سے صاف صاف بیان دیئے ہیں تا کہ تم دنیا و آخرت کے بارے میں غور و فکر کرو۔ (۱)

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اخروی کمالات و لذتوں کو بیان کرنے والی آیات کی تحقیق و تحلیل ہمیں یہ نتیجہ عطا کرتی ہیں کہ یہ لذتیں اور کمالات، دنیاوی لذتوں کے مقابلہ میں فزونی، پایداری، برتری اور

(۱) سورہ بقرہ ۲۱۹۔

خلوص کی حامل ہیں. لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ اپنی زندگی میں ایسی خواہشوں کو انتخاب کرے جو اخروی لذت وکمال کو پورا کرسکتی ہوں. ان آیتوں میں چار خصوصیات اور اخروی کمالات ولذتوں کی برتری کے بارے میں مندرجہ ذیل انداز میں گفتگو ہوئی ہے:

۱۔ پایداری اور ہمیشگی

قرآن کی نظر میں دنیاوی زندگی ناپایدار ومحدود ہے اور اخروی زندگی دائمی اور محدودیت زمانی سے عاری ہے:

﴿بَل تُؤثِرُونَ الحَیَاةَ الدُّنیَا ☆ وَ الآخِرَةُ خَیرٌ وَ أَبقَیٰ﴾(۱)

مگر تم لوگ دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور دیرپا ہے۔

﴿مَا عِندَکُم یَنفَدُ وَ مَا عِندَ اللّٰهِ بَاقٍ...﴾(۲)

جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہوجائے گا اور جو خدا کے پاس ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گا

۲۔ اخلاص اور رنج والم سے نجات

دنیاوی زندگی میں نعمتیں اور خوشی، رنج وغم سے مخلوط ہیں لیکن اخروی زندگی سے خالص خوشی اور حقیقی نعمت حاصل کرسکتے ہیں. قرآن مجید بہشتیوں کی زبان میں فرماتا ہے:

﴿الَّذِی أَحَلَّنَا دَارَ المُقَامَةِ مِن فَضلِهِ لا یَمَسُّنَا فِیهَا نَصَبٌ وَ لا یَمَسُّنَا فِیهَا لُغُوبٌ﴾(۳)

جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشگی کے گھر میں اتارا جہاں ہمیں نہ تو کوئی تکلیف پہونچے گی اور نہ ہی کوئی تکان آئے گی۔

.....

(۱) سورہ اعلیٰ ۱۶، ۱۷۔

(۲) سورہ نحل ۹۶۔ (۳) سورہ فاطر ۳۵۔

۳۔وسعت وفراوانی

اخروی نعمتیں، دنیاوی نعمتوں کے مقابلہ میں جو کم وکیف کے اعتبار سے محدود اور بہت کم ہیں بہت زیادہ اور فراوان ہیں قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَ سَارِعُوا إِلَىٰ مَغفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُم وَ جَنَّةٍ عَرضُهَا السَّمٰوَاتُ وَ الأَرضُ﴾

اور اپنے پروردگار کے بخشش اور جنت کی طرف دوڑ پڑو جس کی وسعت سارے آسمان اور زمین کے برابر ہے۔(۱)

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ فِيهَا مَا تَشتَهِيهِ الأَنفُسُ وَ تَلَذُّ الأَعيُنُ﴾(۲)

اور وہاں (بہشت میں) جس چیز کا جی چاہے اور جس سے آنکھیں لذت اٹھائیں (موجود ہیں)۔

۴۔مخصوص کمالات اور لذتیں

اخروی دنیا میں ان نعمتوں کے علاوہ جو دنیاوی نعمتوں کے مشابہ ہیں مخصوص نعمتیں بھی ہیں جو دنیا کی نعمتوں سے بہت بہتر اور عالی ہیں قرآن مجید دنیاوی نعمتوں سے مشابہ نعمتوں کو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَ رِضوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الفَوزُ العَظِيمُ﴾(۳)

اور خدا کی خوشنودی ان سب سے بالاتر ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

.....

(۱) سورہ آل عمران ۱۳۳۔

(۲) سورہ زخرف ۷۱۔

(۳) سورہ توبہ آیت ۷۲۔

ایک روایت میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ''فیُعطھم اللہ مَالا عینٌ رأت ولا أُذنٌ سمعت ولم یخطر علیٰ قلب بشر''(۱)

خداوند عالم انہیں (اپنے صالح بندوں) ایسی نعمتیں عطا کرے گا جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ ہی کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ ہی کسی قلب نے محسوس کیا ہوگا. مذکورہ خصوصیات پر توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید فقط اخروی زندگی کو زندگی سمجھتا ہے اور دنیا کی زندگی کو مقدمہ اور اس کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے اور جب دنیاوی زندگی اخروی زندگی کے حصول کا ذریعہ نہ ہو تو اسے کھیل بے خبری وغفلت کی علت، فخر کا ذریعہ نیز ظاہری آرائش اور جاہلانہ عمل شمار کرتا ہے. اور اسکی فکر وجستجو میں ہونا اور اس کو پورا کرنے والی خواہشوں کو انتخاب کرنا ایک غیر عقلی فعل کہا ہے اور ایسی زندگی کو حیوانات کی زندگی اور انسان کے حیوانی پہلو کو پورا کرنا بتایا ہے۔

﴿وَ مَا ھٰذِہِ الحَیٰوۃُ الدُّنیَا إِلا لَھوٌ وَ لَعِبٌ وَ إِنَّ الدَّارَ الآخِرَۃَ لَھِیَ الحَیَوَانُ لَو کَانُوا یَعلَمُونَ﴾(۲)

اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشا کے سوا کچھ نہیں اگر یہ لوگ سمجھیں بوجھیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ابدی زندگی تو بس آخرت کا گھر ہے۔

قدرت:

اختیاری افعال میں تیسرا بنیادی عنصر قدرت ہے جو اس سلسلہ میں امکانات واسباب کا رول ادا کرتا ہے. انسان جن خواہشات کو اپنے لئے حقیقی کمال کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اسکے مقدمہ حصول کو تشخیص دیتا ہے انھیں معارف کی روشنی میں حاصل کرنا چاہیئے. اور وہ افعال جو اس کو اُس کمال نہائی کے حصول سے روکتے ہیں یا دور کرتے ہیں اس سے پرہیز کرنا چاہیئے. یہ قدرت اندرونی اعمال پر

.....

(۱) نوری، میرزا حسین؛ مستدرک الوسایل ج۶ ص۶۳۔ (۲) سورہ عنکبوت ۶۴۔

محیط ہے جیسے نیت، ایمان لانا، رضایت، غصہ، محبت، دشمنی، قصد اور ارادہ خارجی، عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور قرآن کی نظر میں، انسان ان تمام مراحل میں قدرت کو نافذ کرنے کے لئے ضروری امکانات سے استوار ہے. قدرت کے مختلف اقسام ہیں جسے ایک نظریہ کے اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

الف۔ قدرت طبعی: یعنی طبیعت سے استفادہ کرتے ہوئے چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان ہو اپنے مقاصد کو حاصل کیا جاتا ہے.

ب۔ قدرت علمی: یعنی وہ قدرت جو ٹکنیکل آلات سے استفادہ کر کے اپنے اہداف کو حاصل کر لے اور اپنے مورد نظر افعال کو انجام دے۔

ج: قدرت اجتماعی: ہماہنگی وتعاون کے ذریعہ یا طاقت و قبضہ اور اجتماعی مرکز کے حصول، مشروع یا غیر مشروع طریقہ سے اپنے جیسے افراد کو ہی اپنے فائدہ کے لئے اپنی خدمت میں استعمال کرتا ہے اور ان کی توانائی سے استفادہ کر کے اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے۔

د: قدرت غیر طبیعی: اپنی روحی قدرت سے استفادہ یا غیبی امداد اور الٰہی عنایت، انسانوں کی جاندار بے جان طبیعت میں تصرف کر کے یا جن وشیاطین کی مدد سے جس چیز کو چاہتا ہے حاصل کر لیتا ہے۔

اختیار کی اصل وبنیاد کے عنوان سے جو باتیں قدرت کی وضاحت میں گذر چکی ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ قدرت کو جسمانی توانائی، اعضاء وجوارح کی سلامتی اور افعال کے انجام دہی میں بیرونی شرائط کے فراہم ہونے سے مخصوص نہیں کرنا چاہیئے بلکہ توجہ ہونا چاہیئے کہ ان کے نہ ہونے کی صورت میں بھی اندرونی اختیاری عمل کا امکان موجود رہتا ہے جیسے محبت کرنا، دشمنی کرنا، نیت کرنا، کسی کام کے انجام کا ارادہ کرنا یا کسی شخص کے عمل سے راضی ہونا وغیرہ۔ البتہ انسان اندرونی اعمال کے ذریعہ خود کو خدا سے نزدیک کر سکتا ہے اور اختیاری اصول مثال کے طور پر معرفت، خواہشات اور مذکورہ درونی امور کا ارادہ خصوصاً جو چیزیں حقیقی عمل کو ترتیب دیتی ہیں یعنی نیت، ان شرائط میں بھی فراہم ہیں اور جس قدر

نیت خالص ہوگی اعتبار اور اس کے قرب کا اندازہ بھی زیادہ ہوگا لہٰذا انسان اعمال ظاہری کے انجام پر بھی مامور ہے اور افعال باطنی کے انجام کا بھی ذمہ دار ہے البتہ اگر کوئی ظاہری عمل انجام دے سکتا ہے تو اس کے لئے صرف باطنی عمل کی نیت کافی نہیں ہے اسی بنا پر ایمان و عمل صالح ہمیشہ باہم ذکر ہوئے ہیں اور دل کے صاف ہونے کا فائدہ ظاہری اعمال میں ہوتا ہے اگر چہ اعمال ظاہری سے ناتوانی اس کے اعمال کے سقوط میں، باطنی رضایت کا نہ تو سبب ہے اور نہ ہی باطنی رفتار سے اختلاف، ظاہری عمل میں اعلان رضایت کے لئے کافی ہے مگر یہ کہ انسان عمل ظاہری کے انجام سے معذور ہو۔

خلاصہ فصل

۱۔ افعال اختیاری کو انجام دینے کے لئے ہم تین عناصر (معرفت، انتخاب اور قدرت) کے محتاج ہیں۔

۲۔ اچھے اور برے کا علم، حقیقی کمال کی شناخت اور معرفت نیز اس کی راہ حصول کے بارے میں اطلاع اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم مبدا، معاد اور دنیا و آخرت کے رابطہ کو پہچانیں.

۳۔ قرآن مجید اگر چہ آنکھ اور کان (حواس) اور قلب (عقل و دل) کو معرفت اور سعادت کی عام راہوں میں معتبر مانتا ہے لیکن یہ اسباب محدود ہونے کے ساتھ ساتھ امکان خطاء سے لبریز نیز تربیت و تکامل کے محتاج ہیں. اس لئے ایک دوسرے مرکز کی ضرورت ہے تا کہ ضروری مسائل میں صحیح و تفصیلی معرفت کے ذریعے انسان کی مدد کر سکے. اور وہ منبع و مرکز، وحی الٰہی ہے جو ہمارے لئے بہت ضروری ہے

۴۔ خواہش یا ارادہ، اختیار و قصد کے لئے ایک دوسرا ضروری عنصر ہے البتہ یہ کوئی ایسا ارادے والا فعل نہیں ہے جس میں خواہش اور چاہت کا کردار نہ ہو حالانکہ بعض لوگوں نے ارادہ کو شدید خواہش یا مزید شوق کہا ہے۔

۵۔ بہت سی جگہوں میں جہاں چند ناہماہنگ خواہشیں باہم ہوتی ہیں اور انسان مجبور ہوتا ہے

کہ کسی ایک کو ترجیح دے تو اس سلسلہ میں قرآن مجید کی شفارش یہ ہے کہ انسان اپنے کمال کو مدنظر قرار دے اور اس کو معیار انتخاب سمجھے۔

۶۔قرآن مجید ایسے بلند و بالا خواہشات کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس میں شخصیت و منزلت کی خواہش اور ایک معبود کی عبادت فقط خداوند عالم کی عبادت کے سایہ میں پوری ہو سکتی ہے۔

۷۔قرآن مجید اعلی خواہشوں کو ایجاد کمال، پائدار اور زیادہ لذت بخش ہونے کے معیار پر ترجیح دیتا ہے اور اس بات کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ یہ مذکورہ امور فقط آخرت میں حاصل ہونگے جس کی نعمتیں پائدار، حقیقی، رنج و غم سے عاری اور باکمال ہیں۔

۸۔قدرت، مقدمات اختیار کے ایک مقدمہ کے عنوان سے کسی بھی عمل کے لئے درکار ہے مثلا شناخت اور معرفت کے لئے انتخاب اور ارادے کی قدرت۔البتہ قرآن کی نظر میں ان تمام موارد کے لئے انسان ضروری قدرت سے آراستہ ہے۔

تمرین

۱۔اصول اختیار کی تین قسمیں ہیں جو اختیاری افعال میں ایک ہی طرح کا کردار ادا کرتی ہیں یا بعض کا کردار دوسرے سے زیادہ ہے، اس اختلاف کا کیا سبب ہے؟

۲۔مقتضائے معرفت کے لئے کون سے امور معرفت سے انحراف کا سبب ہیں اور کس طرح یہ عمل انجام دیتے ہیں؟

۳۔معرفت کے اہم کردار کی روشنی میں انسان کے حقیقی کمال کے حصول کے لئے قرآن مجید میں ہر چیز سے زیادہ کیوں ایمان و عمل صالح کی تاکید ہوتی ہے؟

۴۔ایمان و تقویٰ سے معرفت کا کیا رابطہ ہے؟

۵۔ایمان، عقل و انتخاب اور کردار کے مقولوں میں سے کون سا مقولہ ہے؟

۶۔اگر خواہشات کا انتخاب انسان کی عقل کے مطابق سب سے زیادہ پائدار، حقیقی لذت اور سب سے زیادہ ایجاد کمال کی بنیاد پر ہو تو کیا یہ معیار غیر دینی ہوگا؟ کیوں اور کیسے؟

۷۔اگر ایمان کے حصول اور قرب الٰہی میں معرفت کا اہم رول ہے تو میدان عمل میں کیوں بعض مفکرین بالکل ہی خدا اور معاد کے منکر ہیں یا اس کے مطابق عمل نہیں کرتے ہیں؟ اور کیوں علم بشر کی ترقی دینداری اور ایمان کی وسعت سے بلاواسطہ تعلق نہیں رکھتی ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے:

۱۔شناخت کے تمام گوشوں کے اعتبار سے انسان کی سعادت کے لئے ملاحظہ ہو:

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۵) تفسیر موضوعی قرآن کریم، تہران: رجاء ۱۳۶۵، ج۴ ص۹۳۔۱۱۱

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۰) شناخت شناسی در قرآن، تنظیم و پیش کش، حمید پارسانیا، قم: مرکز مدیریت حوزہ علمیہ قم۔

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (راہ و راہنما شناسی) قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ

۲۔قرآن کی نظر میں انسان کے مختلف خواہشات کے بارے میں ملاحظہ ہو:

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۸) تفسیر موضوعی قرآن، ج ۱۲ (فطرت در قرآن) قم: اسراء۔

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۶) تفسیر موضوعی قرآن، ج ۵، تہران: رجاء

۔شیروانی، علی (۱۳۷۶) سرشت انسان پژوہشی در خداشناسی فطری، قم: نہاد نمایندگی مقام معظم رہبری در دانشگاہ ہا (معاونت امور اساتید و دروس معارف اسلامی).

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۷) اخلاق در قرآن، قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

۔.....(۱۳۷۷) خودشناسی برای خودسازی، قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

۔نجاتی، محمد عثمان (۱۳۷۲) قرآن و روان شناسی، ترجمہ عباس عرب، مشہد: بنیاد پژوہش ہای آستانہ قدس۔

۹

کمال نہائی

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات:

۱۔ (کمال) کا معنی ذکر کرتے ہوئے اس کی تشریح کریں؟

۲۔ انسان کے کمال نہائی سے مراد کیا ہے؟ وضاحت کریں؟

۳۔ قرب الٰہی کے حصول کی راہ کو آیات قرآن سے استدلال کرتے ہوئے بیان کریں؟

۴۔ ایمان اور مقام قرب کے رابطے کی وضاحت کریں؟

کمال خواہی اور سعادت طلبی ہر انسان کی ذاتی وفطری خواہشات میں سے ہے اور انسان کی پوری کوشش اسی خواہش کو پورا کرنا اور نقائص کو دور کرنا ہے. البتہ یہ بات کہ کمال کی خواہش اور سعادت طلب کرنا خود ایک حقیقی اور مستقل رغبت وخواہش ہے، یا ایک فرعی خواہش ہے جو دوسری خواہشوں کا نتیجہ ہے جیسے خود پسندی وغیرہ میں یہ مسئلہ اتفاقی نہیں ہے اگر چہ نظریہ کمال کو مستقل اور حقیقی سمجھنا ہی اکثر لوگوں کا نظریہ ہے۔

انسان کی سعادت وکمال کی خواہش میں ایک مہم اور سرنوشت ساز مسئلہ، کمال اور سعادت کے مراد کو واضح کرنا ہے جو مختلف فلسفی ودینی نظریوں کی بنیاد پر متفاوت اور مختلف ہے. اسی طرح کمال وسعادت کے حقیقی مصداق کو معین کرنا اور ان کی خصوصیات نیز کیفیت اور اس کے حصول کا طریقہ کاران امور میں سے ہے جس کے بارے میں بہت زیادہ تحقیق وتحلیل اور بحث ہو چکی ہے اور مزید ہوگی. ظاہر ہے کہ مادی مکاتب جو معنوی اور غیر فطری امور کے منکر ہیں، ان تمام مسائل میں دنیاوی پہلو اختیار کرتے ہیں اور کمال وسعادت کے معنی ومفہوم اور ان دونوں کا حقیقی مصداق اور اس کے راہ حصول کو مادی امور ہی میں منحصر جانتے ہیں. لیکن غیر مادی مکاتب خصوصاً الہی مکاتب فکر، مادی و دنیاوی اعتبار سے بلند اور وسیع وعریض نظریہ پیش کرتے ہیں. اس فصل میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ قرآنی نظریہ کے مطابق مذکورہ مسائل کا جواب تلاش کریں.

مفہوم کمال اور انسانی معیار کمال

دنیا کی باحیات مخلوق جن سے ہمارا سروکار ہے، ان میں سے نباتات نیز حیوان و انسان گوناگوں صلاحیت کے حامل ہیں، جس کے لئے مناسب اسباب وعلل کا فراہم ہونا ظاہر وآشکار اور پوشیدہ توانائیوں کے فعال ہونے کا سبب ہیں. اور ان صلاحیتوں کے فعال ہونے سے ایسی چیزیں معرض وجود میں آتی ہیں جو اس سے قبل حاصل نہیں تھیں. اس طرح تمام باحیات مخلوق میں درونی قابلیتوں کو پوری طرح سے ظاہر کرنے کے لئے طبیعی تلاش جاری ہے. البتہ یہ فرق ہے کہ نباتات موجودات کے ان طبیعی قوانین کے اصولوں کے پابند ہیں، جو ان کے وجود میں ڈال دی گئی ہیں. جانوروں کی سعی وکوشش حب ذات جیسے عوامل پر مبنی ہے جو فطری الہام وفہم کے اعتبار سے اپنے امور انجام دیتے ہیں لیکن انسان کی جستجو، اختیار وعلم کی روشنی میں ہوتی ہے۔

اس وضاحت کے مطابق جو اختیار اور اس کے اصول کی بحث میں گذر چکا ہے. اس کے کمال نہائی کا مقصد دوسری مخلوق سے بالکل علیحدہ اور جدا ہے۔

گذشتہ مطالب کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ''کمال'' ایک وجودی صفت ہے جو ایک وجود کا دوسرے وجود کے مقابلہ میں حقیقی توانائی وقوت کی طرف اشارہ کرتا ہے. اور کامل وجود اگر فہم وشعور کی نعمت سے مالا مال ہو تو کمال سے مزین ہونے کی وجہ سے لذت محسوس کرتا ہے. گذشتہ مفہوم کی بنیاد پر کمال اگر طبیعی اور غیر اختیاری طور پر حاصل ہو جائے جیسے انسان کی حیوانی توانائی کا فعال ہونا (جیسے جنسی خواہش) تو اسے غیر اکتسابی وغیر طبیعی کمال کہا جاتا ہے اور اگر دانستہ اور اختیاری تلاش کی روشنی میں حاصل ہو تو کمال اکتسابی کہا جاتا ہے. پس جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہر موجود کا کمال منجملہ انسان کا کمال ایک قسم کی تمام قابلیت کا ظاہر اور آشکار ہونا ہے. تو بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کا حقیقی کمال کیا ہے اور کون سی قابلیت کا ظاہر ہونا انسانی کمال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ بے شک انسان کی قابلیتوں اور خواہشوں کے درمیان حیوانی اور مادی خواہشوں کے ظاہر ہونے کو انسانی کمالات میں شمار نہیں کیا

جاسکتااس لئے کہ یہ خواہشیں انسان اور حیوان کے درمیان مشترک ہیں اور حیوانی پہلو سے ان قابلیتوں کے فعال ہونے کا مطلب انسان کا تکامل پانا ہے۔

ایسے مرحلہ میں انسان کی انسانیت ابھی بالقوہ ہے اوراس کی حیوانیت بالفعل ہوچکی ہے اور یہ محدود، ناپایدار اور سریع ختم ہونے والی صلاحیتیں انسان کی واقعی حقیقت یعنی نا قابل فنا روح، اور ہمیشہ باقی رہنے والی لامحدود خواہش سے سازگار نہیں ہے. انسان کی انسانیت اس وقت بالفعل ہوگی جب اس نا قابل فنا روح کی قابلیت فعال ہواور کمال وسعادت اور ختم نہ ہونے والی خالص اور نا قابل فنالذت بغیر مزاحمت ومحدودیت کے حاصل ہو۔

انسان کا کمال نہائی

انسانی کمال اوراس کی عام خصوصیات کے واضح ہونے کے بعد یہ بنیادی سوال درپیش ہوتا ہے کہ انسانی کمال کا نقطۂ عروج اور مقصد حقیقی جسے ہر انسان اپنی فطرت کے مطابق حاصل کرنا چاہتا ہےاوراپنی تمام فعالیت جس کے حصول کے لئے انجام دیتا ہے وہ کیا ہیں؟ یادوسرے لفظوں میں یوں کہاجائے کہ انسان کا کمال نہائی کیا ہے؟

اس سوال کے جواب کے وقت اس نکتہ پر توجہ ضروری ہے کہ حوادث زندگی میں انسان کی طرف سے جن مقاصد کی جستجو ہوئی ہے وہ ایک جیسے مساوی اور برابر نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض اہداف، ابتدائی اہداف ہیں جو بلند وبالا اہداف کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور بعض نہائی اور حقیقی اہداف شمار ہوتے ہیں اور بعض درمیانی ہیں جو مقدماتی اور نہائی اہداف کے درمیان حد وسط کے طور پر واقع ہوتے ہیں. دوسرے لفظوں میں، یہ تین طرح کے اہداف ایک دوسرے کے طول میں واقع ہیں. انسان کے نہائی کمال وہدف سے مراد وہ نقطہ ہے جس سے بڑھ کر کوئی کمال، انسان کے لئے متصور نہیں ہےاور انسان کی ترقی کا وہ آخری زینہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے یہ تلاش وکوشش جاری ہے قرآن مجید نے اس نقطۂ عروج کو فوز (کامیابی)، فلاح (نجات) اور سعادت (خوشبختی) جیسے

ناموں سے یاد کیا ہے اور فرماتا ہے:

﴿ وَ مَن یُطِعِ اللّٰہَ و رَسُولَہُ فَقَد فَازَ فَوزاً عَظِیماً ﴾(۱)
اور جس شخص نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ تو اپنی مراد کو بہت اچھی طرح پہونچ گیا۔

﴿أُولٰئِکَ عَلَیٰ هُدًی مِن رَّبِّهِم وِ أُولٰئِکَ هُمُ المُفلِحُونَ﴾(۲)
یہی لوگ اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ اپنی دلی مرادیں پائیں گے

﴿ وَ أَمَّا الَّذِینَ سُعِدُوا فَفِی الجَنَّةِ خَالِدِینَ فِیهَا ﴾
اور جو لوگ نیک بخت ہیں وہ تو بہشت میں ہوں گے۔(۳)

قرآن مذکورہ مفاہیم کے نقطۂ مقابل کو ناکامی: ﴿إِنَّهُ لا یُفلِحُ الظَّالِمُونَ ﴾(۴)(اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوں گے) ناامیدی اور محرومی: ﴿وَ قَد خَابَ مَن دَسَّیٰهَا ﴾(اور یقیناً جس نے اسے بنا دیا وہ نامراد رہا) شقاوت اور بدبختی سے تعبیر کرتا ہے: ﴿فَأَمَّا الَّذِینَ شَقُوا فَفِی النَّارِ لَهُم فِیهَا زَفِیرٌ وَشَهِیقٌ ﴾(۵)(تو جو لوگ بدبخت ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے اور اسی میں ان کی ہائے وائے اور چیخ پکار ہوگی)

گذشتہ مطالب کی روشنی میں معلوم کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی توانائیوں میں سے ہر ایک کو کمال اور فعلیت کے مرحلہ میں پہونچنے کے لئے فقط اتنی ہی مقدار معتبر ہے جس میں ایجاد کمال نیز دائمی اور لازوال کمال کے تحقق کے اسباب فراہم ہو سکیں اور کمال نہائی کے حصول کا مقدمہ بن سکیں. دوسرے لفظوں میں ان کا رشد و کمال ایک مقدمہ ہے اور اگر مقدماتی پہلو کا فقدان ہو جائے تو انسان اپنی مطلوبیت اور اعتبار کو کھو دیتا ہے۔

---

(۱) سورہ احزاب ۷۱۔(۲) سورہ بقرہ ۵۔
(۳) سورہ ھود ۱۰۸۔(۴) سورہ قصص ۳۷۔(۵) سورہ ھود/۱۰۶۔

قرب الٰہی

اہم گفتگو یہ ہے کہ اس کمال نہائی کا مقام ومصداق کیا ہے؟ قرآن کریم اس کمال نہائی کے مصداق کو قرب الٰہی بیان کرتا ہے جس کے حصول کے لئے جسمانی اور بعض روحی کمالات صرف ایک مقدمہ ہیں اور انسان کی انسانیت اسی کے حصول پر مبنی ہے اور سب سے اعلی، خالص، وسیع اور پایدار لذت، مقام قرب کے پانے سے حاصل ہوتی ہے. قرب خدا کا عروج وہ مقام ہے جس سے انسان کی خدا کی طرف رسائی ہوتی ہے اور رحمت الٰہی سے فیضیاب ہوتا ہے. اس کی آنکھ اور زبان خدا کے حکم سے خدائی افعال انجام دیتی ہیں۔ منجملہ آیات میں سے جو مذکورہ حقیقت پر دلالت کرتی ہیں درجہ ذیل ہیں:

۱. إِنَّ المُتَّقِينَ فِي جَنّاتٍ وَ نَهَرٍ فِي مَقعَدِ صِدقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُقتَدِرٍ

بے شک پرہیز گار لوگ باغوں اور نہروں میں پسندیدہ مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہوں میں ہوں گے۔(۱)

۲. ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَ اعتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدخِلُهُم فِي رَحمَةٍ مِّنهُ وَ فَضلٍ وَ يَهدِيهِم إِلَيهِ صِرَاطاً مُّستَقِيماً﴾(۲)

پس جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور اسی سے متمسک رہے تو خدا بھی انھیں عنقریب ہی اپنی رحمت وفضل کے بیخزاں باغ میں پہونچا دیگا اور انھیں اپنی حضوری کا سیدھا راستہ دکھا دے گا۔

اس حقیقت کو بیان کرنے والی روایات میں سے منجملہ حدیث قدسی ہے:

"ما تقرب إلیّ عبد بشیٔ أحبّ إلیّ ممّا إفترضت علیه و أنّه لیتقرب

.....

(۱) سورہ قمر/۵۴، ۵۵۔ (۲) سورہ نساء/۱۷۶۔

إلی بالنافلة حتیٰ أحبه فإذا أحببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به و لسانه الذی ینطق به و یده التی یبطش بها"(۱)

کوئی بندہ واجبات سے زیادہ محبوب شیٔ کے ذریعے مجھ سے نزدیک نہیں ہوتا ہے. بندہ ہمیشہ (درجہ بہ درجہ) مستحب کاموں سے (واجبات کے علاوہ) مجھ سے نزدیک ہوتا ہے حتی کہ میں اس کو دوست رکھتا ہوں اور جب وہ مرا محبوب ہوجاتا ہے تو اسکا کان ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی زبان ہوجاتا ہوں جس سے وہ گفتگو کرتا ہے اور اسکا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ اپنے امور کا دفاع کرتا ہے۔

قربت کی حقیقت

اگر چہ مقام تقرب کی صحیح اور حقیقی تصویر اور اس کی حقیقت کا دریافت کرنا اس مرحلہ تک پہونچنے کے بغیر میسر نہیں ہے لیکن غلط مفاہیم کی نفی سے اس کو چاہے ناقص ہی سہی حاصل کیا جاسکتا ہے.

کسی موجود سے نزدیک ہونا کبھی مکان کے اعتبار سے اور کبھی زمان کے لحاظ سے ہوتا ہے.

یہ بات واضح ہے کہ قرب الٰہی اس مقولہ سے نہیں ہے اس لئے کہ زمان ومکان مادی مخلوقات سے مخصوص ہیں اور خداوند عالم زمان ومکان سے بالاتر ہے. اسی طرح صرف اعتباری اور فرضی تقرب بھی مدنظر نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اس طرح کا قرب بھی اسی جہاں سے مخصوص ہے اور اس کی حقیقت صرف اعتبار کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اگر چہ اس پر ظاہری آثار مترتب ہوتے ہیں. کبھی قرب سے مراد دنیاوی موجودات کی وابستگی ہے منجملہ انسان خداوند عالم سے وابستہ ہے اور اسکی بارگاہ میں تمام موجودات ہمیشہ حاضر ہیں جیسا کہ روایات وآیات میں مذکور ہے:

.....

(۱) کلینی، محمد بن یعقوب؛ اصول کافی؛ ج۲ ص۳۵۲۔

﴿وَ نَحنُ أَقرَبُ إِلَيهِ مِن حَبلِ الوَرِيدِ﴾(۱)

اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

قرب کا یہ معنی بھی انسان کے لئے کمال نہائی کے عنوان سے ملحوظ نظر نہیں ہے اس لئے کہ یہ قرب تو تمام انسانون کے لئے ہے.

دوست، نزدیک تر از من بہ من است وین عجیب تر کہ من از وی دورم

''دوست مرے نفس سے زیادہ مجھ سے نزدیک ہے لیکن اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ میں اس سے دور ہوں''

بلکہ مراد یہ ہے کہ انسان اس شائستہ عمل کے ذریعہ جو اس کے تقویٰ اور ایمان کا نتیجہ ہے اپنے وجود کو ایک بلندی پر پاتا ہے اور اسکا حقیقی وجود استحکام کے بعد اور بھی بلند ہو جاتا ہے. اس طرح کہ اپنے آپ کو علم حضوری کے ذریعہ درک کرتا ہے اور اپنے نفسانی مشاہدے اور روحانی جلوے نیز خدا کے ساتھ حقیقی روابط اور خالص وابستگی کی بنا پر الٰہی جلوے کا اپنے علم حضوری کے ذریعہ ادراک کرتا ہے:

﴿ وُجُوهٌ يَومَئِذٍ نَاضِرَةٌ ☆ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ . (۲)

اس روز بہت سے چہرے حشاش و بشاش اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے۔

قرب الٰہی کے حصول کا راستہ

گذشتہ مباحث میں بیان کیا جا چکا ہے کہ انسانی تکامل، کرامت اکتسابی اور کمال نہائی کا حصول اختیاری اعمال کے زیر اثر ہے. لیکن یہ بات واضح رہے کہ ہر اختیاری عمل، ہر انداز اور ہر طرح کے اصول کی بنیاد پر تقرب کا باعث نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اشارہ ہوا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ اعمال، کار ساز ہیں جو خدا، معاد اور نبوت پر ایمان رکھنے سے مربوط ہوں اور تقوی کے ساتھ انجام دیئے گئے

.....

(۱) سورہ ق/۱۶۔ (۲) سورہ قیامت ۲۲، ۲۳۔

ہوں۔عمل کی حیثیت ایمان کی حمایت کے بغیر ایک بے روح جسم کی سی ہے اور جو اعمال تقویٰ کے ساتھ نہ ہوں بارگاہ رب العزت میں قابل قبول نہیں ہیں: ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾(۱)(خدا تو بس پرہیز گاروں سے قبول کرتا ہے) لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم سے تقرب کے عام اسباب وعلل، ایمان اور عمل صالح ہیں. اس لئے کہ جو عمل تقویٰ کے ہمراہ نہ ہو خداوند عالم کے سامنے پیش ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسے عمل صالح بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

گذشتہ مطالب کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ جو چیز حقیقت عمل کو ترتیب دیتی ہے وہ دراصل عبادی عمل ہے یعنی فقط خدا کے لئے انجام دینا اور ہر عمل کا خدا کے لئے انجام دینا یہ اس کی نیت سے وابستہ ہے "إنّما الأعمال بالنيات "(۲) آگاہ ہو جاؤ کہ اعمال کی قیمت اس کی نیت سے وابستہ ہے اور نیت وہ تنہا عمل ہے جو ذاتاً عبادت ہے لیکن تمام اعمال کا خالصۃً لوجہ اللہ ہونا، نیت کے خالصۃً لوجہ اللہ ہونے کے اوپر ہے، یہی وجہ ہے تنہا وہ عمل جو ذاتاً عبادت ہو سکتا ہے وہ نیت ہے اور تمام اعمال، نیت کے دامن میں عبادت بنتے ہیں اسی بنا پر نیت کے پاک ہوئے بغیر کوئی عمل تقرب کا وسیلہ نہیں ہو سکتا ہے. یہی وجہ ہے کہ تمام بااختیار مخلوقات کی خلقت کا ہدف عبادت بنایا گیا ہے: ﴿وَ مَا خَلَقتُ الجِنَّ وَ الإنسَ إِلا لِيَعبُدُونَ﴾(۳)(اور میں نے جنوں اور آدمیوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کی زبان میں مقام قرب الٰہی کو حاصل کرنا ہر کس وناکس، ہر قوم وملت کے لئے ممکن نہیں ہے اور صرف اختیاری ہی عمل سے (اعضاو جوارح کے علاوہ) اس تک رسائی ممکن ہے۔

مذکورہ تقریب کے عام عوامل کے مقابلہ میں خداوند عالم سے دوری اور بدبختی سے مراد؛

---

(۱) سورہ مائدہ ۲۷۔

(۲) مجلسی، محمد باقر؛ بحار الانوار؛ ج ۶۷، ص ۲۱۲۔

(۳) ذاریات ۵۶۔

خواہش دنیا، شیطان کی پیروی اور خواہش نفس (ہوائے نفس) کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے. حضرت موسیٰؑ کے دوران بعثت، یہودی عالم "بلعم باعور" کے بارے میں جو فرعون کا ماننے والا تھا قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَاتلُ عَلَيهِم نَبَأَ الَّذِى آتَينَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنهَا فَأَتبَعَهُ الشَّيطَانُ فَكَانَ مِنَ الغَاوِينَ وَ لَوشِئنَا لَرَفَعنَاهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهُ أَخلَدَ إِلَىٰ الأَرضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ﴾

اور تم ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کی تھیں پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا اور آخر کار وہ گمراہ ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ہم اسے انہی آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے مگر وہ تو خود ہی پستی کی طرف جھک پڑا اور اپنی نفسانی خواہش کا تابعدار بن بیٹھا۔(۱)

تقرب خدا کے درجات

قرب الٰہی جو انسان کا کمال نہائی اور مقصود ہے خود اپنے اندر درجات رکھتا ہے حتی انسان کا سب سے چھوٹا اختیاری عمل اگر ضروری شرائط رکھتا ہو تو انسان کو ایک حد تک خدا سے قریب کر دیتا ہے اس لئے انسان اپنے اعمال کی کیفیت و مقدار کے اعتبار سے خداوند قدوس کی بارگاہ میں درجہ یا درجات رکھتا ہے. اور ہر فرد یا گروہ کسی درجہ یا مرتبہ میں ہوتا ہے: ﴿هُم دَرَجَاتٌ عِندَ اللّٰهِ﴾ (۲) (وہ لوگ (صالح افراد) خدا کی بارگاہ میں (صاحب) درجات ہیں۔) اسی طرح پستی اور انحطاط نیز خداوند عالم سے دوری بھی درجات کا باعث ہے اور ایک چھوٹا عمل بھی اپنی مقدار کے مطابق انسان کو پستی میں گرا سکتا ہے. اسی بنا پر انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ اور توقف کا کوئی مفہوم نہیں ہے. ہر عمل انسان کو یا خدا سے قریب کرتا ہے یا دور کرتا ہے، ٹھہراؤ اس وقت متصور ہے جب انسان مکلّف نہ ہو. اور خدا کے ارادہ کے مطابق عمل انجام دینے کے لئے جب تک انسان اختیاری تلاش و جستجو میں ہے مکلّف

(۱) سورہ اعراف/۱۷۵، ۱۷۶۔ (۲) سورہ آل عمران ۱۶۳۔

ہے چاہے اپنی تکلیف کے مطابق عمل کرے یا نہ کرے، تکامل یا تنزل سے ہمکنار ہوگا۔

﴿وَ لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعمَلُونَ﴾

اور جس نے جیسا کیا ہے اسی کے موافق (نیکوکاروں اور صالحین کے گروہ میں سے) ہر ایک کے درجات ہیں اور جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں تمہارا پروردگار اس سے بے خبر نہیں ہے۔(۱)

انسان کے اختیاری تکامل وتنزل کا ایک وسیع میدان ہے؛ ایک طرف تو فرشتوں سے بالاتر وہ مقام جسے قرب الٰہی اور جوار رحمت حق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ مقام جو حیوانات و جمادات سے پست ہے اور ان دونوں کے درمیان دوزخ کے بہت سے طبقات اور بہشت کے بہت سے درجات ہیں کہ جن میں انسان اپنی بلندی وپستی کے مطابق ان درجات وطبقات میں جائے گا۔

ایمان ومقام قرب کا رابطہ

ایمان وہ تنہا شی ہے جو خدا کی طرف صعود کرتی ہے اور اچھا ونیک عمل ایمان کو بلندی عطا کرتا ہے:

﴿إِلَيهِ يَصعَدُ الكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ العَمَلُ الصَّالِحُ يَرفَعُهُ﴾(۲)

اس کی بارگاہ تک اچھی باتیں پہونچتی ہیں اور اچھے کام کو وہ خوب بلند فرماتا ہے۔

انسان مومن بھی اپنے ایمان ہی کے مطابق خداوند عالم سے قریب ہے. اس لئے جس قدر انسان کا ایمان کامل ہوگا اتنا ہی اس کا تقرب زیادہ ہوگا.(۳) اور کامل ایمان والے کی حقیقی توحید یہ ہے کہ قرب الٰہی کے سب سے آخری مرتبہ پر فائز ہو اور اس سے نیچا مرتبہ شرک ونفاق سے ملا ہوا ہے. جو تقرب

.....

(۱) سورہ انعام ۱۳۲۔ (۲) سورہ فاطر ۱۰۔

(۳) مزید وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو: محمد تقی مصباح؛ خودشناسی برای خودسازی۔

کے مراتب میں شرک اور نفاق خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے نیچے کا درجہ جو مقام قرب کے ماسواء ہے شرک اور نفاق جلی کا ہے اور کہا جا چکا ہے کہ یہ شرک ونفاق صاحب عمل وفعل کی نیت سے مربوط ہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"نیّة الشرک فی أمتی أخفی من دبیب النملة السوداءِ علی صخرة الصمّاً فی اللیلة الظلماء"(۱)

میری امت کے درمیان نیتِ شرک، تاریک شب میں سیاہ سنگ پر سیاہ چیونٹیوں کی حرکت سے زیادہ مخفی ہے۔(۱)

خلاصہ فصل

۱۔انسان کی تمام جستجو وتلاش کمالات کو حاصل کرنے اور سعادت کو پانے کے لئے ہے۔

۲۔وہ مادی مکاتب جو معنوی اور غیر فطری امور کے منکر ہیں دنیاوی فکر رکھتے ہیں نیز کمال وسعادت اور اس کے راہ حصول کے معانی ومفاہیم کو مادی امور میں منحصر جانتے ہیں.

۳۔ہر موجود کا کمال منجملہ انسان، اس کے اندر موجودہ صلاحیتوں کا فعلیت پانا نیز اس کا ظاہر وآشکار ہونا ہے.

۴۔قرآن مجید انسان کے کمال نہائی کو فوز (کامیابی) فلاح (نجات) اور سعادت (خوشبختی) جیسے کلمات سے تعبیر کرتا ہے. اور کمال نہائی کے مصداق کو قرب الٰہی بتاتا ہے.

۵۔اچھے لوگوں کے لئے مقام قرب الٰہی ایمان کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور شائستہ اختیاری عمل ہی کے ذریعہ ممکن ہے.

.....

(۱) طوسی، خواجہ نصیرالدین؛ اوصاف الاشراف۔

۶۔قرب الٰہی جس انسان کا کمال نہائی اور مقصود ہے خود اپنے اندر درجات کا حامل ہے حتی کہ انسان کا سب سے چھوٹا اختیاری عمل اگر ضروری شرائط کے ہمراہ ہو تو انسان کو ایک حد تک خدا سے قریب کر دیتا ہے. اس لئے اپنے اعمال کی کیفیت و مقدار کی بنیاد پر لوگوں کے مختلف درجات ہوتے ہیں. جس قدر انسان کا ایمان کامل ہوگا اسی اعتبار سے اس کا تقرب الٰہی زیادہ ہوگا اور ایمان کامل اور توحید خالص، قرب الٰہی کے آخری مرتبہ سے مربوط ہے۔

تمرین

۱۔صاحب کمال ہونے اور کمال سے لذت اندوز ہونے کے درمیان کیا فرق ہے؟

۲۔انسان کی انسانیت اور اس کی حیوانیت کے درمیان کون سا رابطہ برقرار ہے؟

۳۔کمال نہائی کے حاصل ہونے کا راستہ کیا ہے؟

۴۔آیات وروایات کی زبان میں اعمال نیک کو عمل صالح کیوں کہا گیا ہے؟

۵۔اسلام کی نظر میں انسان کامل کی خصوصیات کیا ہیں؟

۶۔اگر ہر عمل کا اعتبار نیت سے وابستہ ہے تو اس شخص کے اعمال جو دینی واجبات کو خلوص نیت کے ساتھ لیکن غلط انجام دیتا ہے کیوں قبول نہیں کیا جاتا ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے

۔آذربائجانی، مسعود (۱۳۷۵) ''انسان کامل از دیدگاہ اسلام وروان شناسی'' مجلۂ حوزہ و دانشگاہ، سال نہم، شمارہ پیاپی۔

۔بدوی، عبدالرحمن (۱۳۷۶) الانسان الکامل فی الاسلام؛ کویت: وکالة المطبوعات۔

۔جبلی، عبدالکریم؛ (۱۳۲۸) الانسان الکامل فی معرفة الاوایل والاواخر؛ قاہرہ: المطبعة الازهرية المصرية۔

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۲) تفسیر موضوعی قرآن، ج۶، تہران: رجاء۔

۔حسن زادہ آملی، حسن (۱۳۷۲) انسان کامل از دیدگاہ نہج البلاغہ؛ قم: قیام۔

ـزیادہ، معن، (۱۳۸۶) الموسوعة الفلسفية العربية؛ بیروت: معهد الانماء العربی۔
ـسادات، محمد علی، (۱۳۶۴) اخلاق اسلامی، تہران: سمت۔
ـسبحانی، جعفر (۱۳۷۱) سیمای انسان کامل در قرآن؛ قم: دفتر تبلیغات اسلامی۔
ـشولٹس، ڈوال (بی تا) روان شناسی کمال؛ ترجمہ، گیتی خوشدل، تہران: نشر نو۔
ـمحمد تقی مصباح (بی تا) خودشناسی برای خودسازی؛ قم: موسسہ در راہ حق۔
ـمطہری، مرتضی (۱۳۷۱) انسان کامل؛ تہران: صدرا۔
ـنصری، عبداللہ؛ سیمای انسان کامل از دیدگاہ مکاتب؛ تہران: انتشارات دانشگاہ علامہ طباطبائی۔

ملحقات

ناٹالی ٹربوویک، انسان کے نہائی ہدف اوراس کے راہ حصول کے سلسلہ میں علماء علوم تجربی کے نظریات کو جو کہ صرف دنیاوی نقطہ نگاہ سے ہیں اس طرح بیان کرتا ہے۔

مغربی انسان شناسی کے اعتبار سے کمال نہائی

انسان کو بہتر مستقبل بنانے کیلئے کیا کرنا چاہیئے؟ انسان کی ترقی کے آخری اہداف کیا ہیں؟

فرایڈ کے ماننے والے کہتے ہیں: انسان کا مستقبل تاریک ہے، انسان کی خود پسند فطرت اس کے مشکلات کی جڑ ہے اوراس فطرت کی موجودہ جڑوں کو پہچاننا اوراس کی اصلاح کرنا راہ تکامل (۱) کے بغیر دشوار نظر آتا ہے، فرایڈ کا دعویٰ ہے کہ زندگی کے نیک تقاضوں کو پورا کرنا (جیسے جنسی مسائل) اور برے تقاضوں کو کمزور بنانا (جیسے لڑائی جھگڑے وغیرہ) شاید انسان کی مدد کرسکتا ہے جب کہ فرایڈ خود ان اصول پر عمل پیرا نہیں تھا۔

ڈاکٹر فرایڈ کے نئے ماننے والے (مارکس، فروم): انسان کی خطائیں معاشرے کے منفی آثار کا سرچشمہ ہیں لہٰذا اگر سماج اور معاشرہ کو اس طرح بدل دیا جائے کہ انسان کا قوی پہلو مضبوط اور ضعیف پہلو نابود ہوجائے تو انسان کی قسمت بہتر ہوسکتی ہے، انسان کی پیشرفت کا آخری مقصد ایسے معاشرے کی ایجاد ہے جو تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ نیک کاموں کو انجام دینے کے لئے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کریں۔

مارکسیزم مذہب کے پیروی کرنے والے (مارکس، فروم): جن کا مقصد ایسے اجتماعی شوسیالیزم کا وجود میں لانا تھا جس میں معاشرے کے تمام افراد، ایجادات اور محصولات میں شریک

.....

(1) Evolution.

ہوں، جب کہ انسان کی مشکلوں کے لئے راہ حل اور آخری ہدف اس کی ترقی ہے، معاشرے کے افراد اس وقت اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوشنود پائیں گے جب سب کے سب اجتماعی طور پر اہداف کو پانے کے لئے ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

فعالیت اور کردار کو محور قرار دینے والے افراد مثلاً اسکینر کا کہنا ہے: انسان کی ترقی کا آخری ہدف، نوع بشر کی بقاء ہے اور جو چیز بھی اس ہدف میں مددگار ہوتی ہے وہ مطلوب و بہتر ہے۔ اس بقا کے لئے ماحول بنانا، بنیادی اصول میں سے ہے، اور وہ ماحول جو تقاضے کے تحت بنائے جاتے ہیں وہ معاشرے کو مضبوط بنا سکتے ہیں نیز اس میں بقا کا احتمال زیادہ رہتا ہے (جیسے زندگی کی بہتری، صلح، معاشرہ پر کنٹرول وغیرہ)

نظریہ تجربیات کے حامی (ہابز) کا کہنا ہے: انسان کے رفتار و کردار کو کنٹرول اور پیشن گوئی کے لئے تجربیات سے استفادہ کرنا اس کی ترقی کی راہ میں بہترین معاون ہے۔

سودخوری کرنے والے (بنٹام، میل) کا کہنا ہے: معاشرے کو چاہیئے کہ افراد کے اعمال و رفتار کو کنٹرول کرے اس طرح کہ سب سے زیادہ فائدہ عوام کی کثیر تعداد کو ملے۔

انسان محوری کا عقیدہ رکھنے والے (مازلو، روجر): مازلو کے مطابق ہر شخص میں ایک فطری خواہش ہے جو اس کو کامیابی و کامرانی کی طرف رہنمائی کرتی ہے لیکن یہ اندرونی قوت اتنی نازک و لطیف ہے جو متعارض ماحول کے دباؤ سے بڑی سادگی سے متروک یا اس سے پہلو تہی کر لیتی ہے۔ اسی بنا پر انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کی کلید، معاشرے کو پہچاننے اور پوشیدہ قوتوں کی ہلکی جھلک، انسان کی تشویق میں مضمر ہے۔

روجر کا کہنا ہے: جملہ افراد دوسروں کی بے قید و شرط تائید کے محتاج ہیں تا کہ خود کو ایک فرد کے عنوان سے قبول کریں اور اس کے بعد اپنی انتہائی صلاحیت کے مطابق ترقی و پیش رفت کریں، اسی لئے تائید کی میزان افزائش انسان کی وضعیت کے بہتر بنانے کی کلید ہے اور ہر انسان کی اپنی

شخصیت سازی ہی اس کی ترقی کا ہدف ہے۔

انسان گرائی کا عقیدہ رکھنے والے (می، فرینکل) کے مطابق:

می: کا کہنا ہے کہ دور حاضر کے انسان کو جاننا چاہیئے کہ جب تک وہ صاحب ارادہ ہے اپنے اعمال کے لئے مواقع کی شناخت کرنا چاہیئے اور اپنے حسِ ارادہ کو حاصل کر کے اپنی وضعیت بہتر بنانی چاہیئے۔

فرینکل کہتا ہے کہ: ہر وہ انسان جو کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی کے واسطے زندگی گذارنا چاہتا ہے، اس کو چاہیئے کہ وہ اس کی حیات کو اہمیت دے۔ یہ معنی اور نظریہ ہر ارادہ کرنے والے کو ایک مبنیٰ فراہم کراتا ہے اور انسان کو مایوسی اور تنہائی سے نجات دلاتا ہے۔

خدا کا یقین رکھنے والے (ببر، ٹلیچ، فورنیر): کا کہنا ہے کہ ہمارا خدا اور اس کے بندے سے دوگانہ رابطہ ہمارے آزادانہ افعال کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے اور انسانی ترقی کا پیش خیمہ ہے۔

۱۰

دنیاوآخرت کارابطہ

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات:

۱۔قرآن مجید میں کلمہ دنیاوآخرت کے استعمالات میں سے تیں موارد بیان کریں؟

۲۔دنیاوآخرت کے باری میں مختلف نظریات کی تجزیہ وتحلیل کریں؟

۳۔رابطہ دنیاوآخرت کے مہم نکات کوذکرکریں؟

۴۔آخرت میں دنیاوی حالت سے مربوط افراد کے چاردستوں کانام ذکرکریں؟

گذشتہ فصلوں میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ انسان مادی اور حیوانی حصہ میں منحصر نہیں ہے اور نہ ہی اس کی دنیا اس کی دنیاوی زندگی میں منحصر ہے. انسان ایک دائمی مخلوق ہے جو اپنے اختیاری تلاش سے اپنی دائمی سعادت یا بدبختی کے اسباب فراہم کرتی ہے اور وہ سعادت و بدبختی محدود دنیا میں سمانے کی ظرفیت نہیں رکھتی ہے. دنیا ایک مزرعہ کی طرح ہے جس میں انسان جو کچھ بوتا ہے عالم آخرت میں وہی حاصل کرتا ہے. اس فصل میں ہم کوشش کریں گے کہ ان دو عالم کا رابطہ اور دنیا میں انسان کی جستجو کا کردار، آخرت میں اس کی سعادت و بدبختی کی نسبت کو واضح کریں، ہم قرآن مجید کی آیتوں کی روشنی میں اس رابطہ کے غلط مفہوم و مصادیق کو مشخص اور جدا کرتے ہوئے اس کی صحیح و واضح تصویر آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

قرآن مجید میں کلمۂ دُنیا کے مختلف استعمالات

چونکہ قرآن مجید میں لفظ دنیا و آخرت کا مختلف و متعدد استعمال ہوا ہے. لہٰذا ہم دنیا و آخرت کے رابطے کو بیان کرنے سے پہلے ان لفظوں کے مراد کو واضح کرنا چاہتے ہیں. قرآن میں دنیا و آخرت سے مراد کبھی انسان کی زندگی کا ظرف ہے جیسے ﴿فَأُولٰئِکَ حَبِطَت أَعمَالُهُم فِی الدُّنیَا وَ الآخِرَةِ﴾ (۱) ان لوگوں (مرتد افراد) کا انجام دیا ہوا سب کچھ دنیا و آخرت میں اکارت ہے۔

.....

(۱) بقرہ ۲۱۷۔

ان دولفظوں کے دوسرے استعمال میں دنیاوآخرت کی نعمتوں کاارادہ ہوا ہے. جیسے﴿بَل تُؤثِرُونَ الحَيَاةَ الدُّنيَا ☆ وَ الآخِرَةُ خَيرٌ وَ أَبقَىٰ﴾(۱) مگرتم لوگ تو دنیاوی زندگی کوترجیح دیتے ہوحالانکہ آخرت کہیں بہتراوردیرپاہے۔

ان دولفظوں کا تیسرااستعمال کہ جس سے مرادد نیاوآخرت میں انسان کاطریقۂ زندگی ہے، اور جو چیز اس بحث میں ملحوظ ہے وہ ان دولفظوں کا دوسرااور تیسرااستعمال ہے یعنی اس بحث میں ہم یہ مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں کہ طریقۂ رفتاروکردار نیز اس دنیا میں زندگی گذارنے کی کیفیت کا آخرت کی زندگی اور کیفیت سے کیارابطہ ہے۔؟

اس سلسلہ میں تجزیہ وتحلیل کرنا اس جہت سے ضروری ہے کہ موت کے بعد کے عالم پرصرف اعتقادرکھنا ہمارے اس دنیا میں اختیاری کرداورفتار پراثر اندازنہیں ہوتا ہے بلکہ یہ اسی وقت فائدہ مند ہے جب دنیا میں انسان کی رفتاروکرداراوراس کے طریقۂ زندگی اورآخرت میں اس کی زندگی کی کیفیت کے درمیان ایک مخصوص رابطہ کے معتقد ہوں. مثال کے طور پراگرکوئی معتقد ہو کہ انسان کی زندگی کاایک مرحلہ دنیا میں ہے جوموت کے آجانے کے بعدختم ہوجاتا ہےاورآخرت میں زندگی کا دوسرامرحلہ ہے جواس کی دنیاوی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا ہےتو صرف اس جدیدحیات کاعقیدہ اس کے رفتاروکردار پرکوئی اثرنہیں ڈالے گا. اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ان مراحل کے درمیان کوئی رابطہ ہے یانہیں ہے؟ اوراگر ہےتو کس طرح کارابطہ ہے؟

دنیاوآخرت کےروابط کے بارے میں پائے جانے والےنظریات کا تجزیہ

ان لوگوں کے نظریہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے جوآخرت کی زندگی کو مادی زندگی کا دوسرا حصہ سمجھتے ہیں اسی لئے وہ اپنے مرنے والوں کے قبروں میں مادی امکانات مثال کے طور پرکھانا

.....

(۱)سورہ اعلی ۱۶و۱۷۔

اور دوسرے اسباب زینت رکھنے کے قائل ہیں، تاریخ انسانیت میں دنیا وآخرت کے درمیان تین طرح کے رابطے انسانوں کی طرف سے بیان ہوئے ہیں.

پہلا نظریہ یہ ہے کہ انسان اور دنیا وآخرت کے درمیان ایک مثبت اور مستقیم رابطہ ہے جو لوگ دنیا میں اچھی زندگی سے آراستہ ہیں وہ آخرت میں بھی اچھی زندگی سے ہم کنار ہوں گے۔قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

﴿وَ دَخَلَ جَنَّتَهُ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنفسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هٰذِهِ أَبَداً☆وَ مَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَ لَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّی لَأَجِدَنَّ خَيراً مِنهَا مُنقَلَباً﴾

وہ کہ جس نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا تھا جب اپنے باغ میں داخل ہوا تو یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے تو اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ کبھی یہ باغ اجڑ جائے گا اور میں تو یہ بھی خیال نہیں کرتا تھا کہ قیامت برپا ہوگی اور جب میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جاؤں گا تو یقیناً اس سے کہیں اچھی جگہ پاؤں گا۔(۱)

سورہ فصلت کی ۵۰ویں آیہ میں بھی ہم پڑھتے ہیں:

﴿وَ لَئِن أَذَقنَاهُ رَحمَةً مِنَّا مِن بَعدِ ضَرَّاءَ مَسَّتهُ لَيَقُولَنَّ هٰذَا لِی وَ مَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَ لَئِن رُّجِعتُ إِلَىٰ رَبِّی إِنَّ لِی عِندَهُ لَلحُسنَىٰ﴾

اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہونچ جانے کے بعد ہم اس کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو یقینی کہنے لگتا ہے کہ یہ تو میرے لئے ہی ہے اور میں نہیں خیال کرتا کہ کبھی قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف پلٹایا بھی جاؤں تو بھی میرے لئے یقیناً اس کے یہاں بھلائی ہے۔

.....

(۱) سورہ کہف ۳۵و۳۶۔

بعض لوگوں نے بھی اس آیہ شریفہ ﴿وَمَن كَانَ فِي هٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَ أَضَلُّ سَبِيلاً﴾ ''اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا اور راہ راست سے بھٹکا ہوا ہوگا'' (۱) کو دلیل بنا کر کہا ہے کہ: قرآن نے بھی اس مستقیم ومثبت رابطہ کو صحیح قرار دیا ہے کہ جو انسان اس دنیا میں اپنی دنیاوی زندگی کے لئے تلاش نہیں کرتا ہے اور مادی نعمتوں کو حاصل نہیں کر پاتا ہے وہ آخرت میں بھی آخرت کی نعمتوں سے محروم رہے گا.

بعض لوگوں نے اس رابطے کے برعکس نظریہ ذکر کیا ہے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر قسم کی اس دنیا میں لطف اندوزی اور عیش پرستی، آخرت میں غم واندوہ کا باعث ہے اور اس دنیا میں ہر طرح کی محرومیت، آخرت میں آسودگی اور خوشبختی کا پیش خیمہ ہے، یہ لوگ شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم دو زندگی اور ایک روزی ونعمت کے مالک ہیں اور اگر اس دنیا میں اس سے بہرہ مند ہوئے تو آخرت میں محروم ہوں گے اور اگر یہاں محروم رہے تو اس دنیا میں حاصل کر لیں گے۔

یہ نظریہ بعض معاد کا اعتقاد رکھنے والوں کی طرف سے مورد تائید ہے اور وہ اس آیہ سے استدلال کرتے ہیں:

﴿أَذهَبتُم طَيِّبَاتِكُم فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنيَا وَ استَمتَعتُم بِهَا فَاليَومَ تُجزَونَ عَذَابَ الهُونِ ...﴾ (۲)

تم تو اپنی دنیا کی زندگی میں خوب مزے اڑا چکے اور اس میں خوب چین کر چکے تو آج (قیامت کے روز) تم پر ذلت کا عذاب کیا جائے گا۔

دونوں مذکورہ نظریہ قرآن سے سازگار نہیں ہے اسی لئے قرآن مجید نے سینکڑوں آیات میں اس مسئلہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

.....

(۱) سورہ اسراء ۷۲۔ (۲) سورہ احقاق/۲۰۔

پہلے نظریہ کے غلط اور باطل ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ قرآن نے ایسے لوگوں کو یاد کیا ہے جو دنیا میں فراوانی نعمت سے ہمکنار تھے لیکن کافر ہونے کی وجہ سے اہل جہنم اور عذاب الٰہی سے دوچار ہیں. جیسے ولید بن مغیرہ، ثروت منداور عرب کا چالاک نیز پیغمبر اکرم کے سب سے بڑے دشمنون میں سے تھا اور یہ آیہ اس کے لئے نازل ہوئی ہے.

﴿ذَرنِی وَ مَن خَلَقتُ وَحِیداً☆وَ جَعَلتُ لَهُ مَالاً مَمدُوداً☆وَ بَنِینَ شُهُوداً☆وَ مَهَّدتُّ لَهُ تَمهِیداً☆ثُمَّ یَطمَعُ أَن أَزِیدَ ☆ کَلاّ إِنَّهُ کَانَ لِآیَاتِنَا عَنِیداً☆ سَأُرهِقُهُ صَعُوداً﴾(۱)

مجھے اس شخص کے ساتھ چھوڑ دو کہ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا اور اسے بہت سا مال دیا اور نظر کے سامنے رہنے والے بیٹے اور اسے ہر طرح کے سامان میں وسعت دی پھر اس پر بھی وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اور بڑھاؤں یہ ہرگز نہ ہوگا یہ تو میری آیتوں کا دشمن تھا تو میں عنقریب اسے سخت عذاب میں مبتلا کروں گا۔

قارون کی دولت اور اس کی بے انتہا ثروت، دنیاوی سزا میں گرفتار ہونا اور اس کی آخرت کی بدبختی بھی ایک دوسرا واضح نمونہ ہے جو سورہ قصص کی ۷۶ ویں آیہ اور سورہ عنکبوت کی ۳۹ ویں آیہ میں مذکور ہے. دوسری طرف قرآن مجید صالح لوگوں کے بارے گفتگو کرتا ہے جو دنیا میں وقار و عزت اور نعمتوں سے محروم تھے لیکن عالم آخرت میں، جنت میں ہیں جیسے صدر اسلام کے مسلمین جن کی توصیف میں فرماتا ہے:

﴿لِلفُقَرَاءِ المُهَاجِرِینَ الَّذِینَ أُخرِجُوا مِن دِیَارِهِم وَ أَموَالِهِم یَبتَغُونَ فَضلاً مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضوَاناً وَ یَنصُرُونَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ أُولٰئِکَ هُمُ

.....

(۱) سورہ مدثر ۱۱ تا ۱۷۔

الصَّادِقُونَ☆...فَأُولٰئِکَ هُمُ المُفلِحُونَ﴾(۱)

ان مفلس مہاجروں کا حصہ ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے خدا کے فضل وخوشنودی کے طلبگار ہیں اور خدا کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ایماندار ہیں...تو ایسے ہی لوگ اپنی دلی مرادیں پائیں گے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ آخرت میں شقاوت وسعادت کا معیار ایمان اور عمل صالح نیز کفر اور غیر شائستہ اعمال ہیں، دنیاوی شان وشوکت اور اموال سے مزین ہونا اور نہ ہونا نہیں ہے۔

﴿وَ مَن أَعرَضَ عَن ذِکرِی فَإِنَّ لَهُ مَعِیشَةً ضَنکاً وَ نَحشُرُهُ یَومَ القِیَامَةِ أعمَیٰ ☆ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرتَنِی أَعمَیٰ وَ قَد کُنتُ بَصِیراً ☆ قَالَ کَذٰلِکَ أَتَتکَ آیاتُنَا فَنَسِیتَهَا وَ کَذٰلِکَ الیَومَ تُنسَیٰ﴾(۲)

جو بھی میری یاد سے روگردانی کرے گا اس کے لئے سخت وناگوار زندگی کا سامنا ہے اور اس کو ہم قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے، تب وہ کہے گا الٰہی میں تو آنکھ والا تھا تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا خدا فرمائے گا جس طرح سے ہماری آیتیں تمہارے پاس پہونچیں تو تم نے انھیں بھلا دیا اور اسی طرح آج ہم نے تمہیں بھلا دیا ہے۔

یہ آیہ دلالت کرتی ہے کہ نامطلوب دنیاوی زندگی اگر کفر وگناہ کے زیر اثر ہو تو ہوسکتا ہے کہ آخرت کی بدبختی کے ہمراہ ہو. لیکن بری زندگی خود معلول ہے علت نہیں ہے جو گناہ وکفر اور مطلوبہ نتائج (ایک دنیاوی امر دوسرا اخروی) کا حامل ہے، دوسرے نظریہ کے بطلان پر بھی بہت سی آیتیں دلالت کرتی ہیں جیسے:

﴿قُل مَن حَرَّمَ زِینَةَ اللّٰهِ الَّتِی أَخرَجَ لِعِبَادِهِ وَ الطَّیِّبَاتِ مِنَ الرِّزقِ قُل هِیَ لِلَّذِینَ آمَنُوا فِی الحَیَاةِ الدُّنیَا خَالِصَةً یَومَ القِیَامَةِ﴾

---

(۱) سورہ حشر ۸و۹۔(۲) طہٰ ۱۲۴تا۱۲۶۔

(اے پیامبر کہدو) کہ جو زینت اور کھانے کی صاف ستھری چیزیں خدا نے اپنے بندوں کے واسطہ پیدا کی ہیں کس نے حرام قرار دیں تم خود کہدو کہ سب پاکیزہ چیزیں قیامت کے دن ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگی میں ایمان لائے۔(۱)

حضرت سلیمانؑ جن کو قرآن مجید نے صالح اور خدا کے مقرب بندوں میں شمار کیا ہے اور جو دنیاوی عظیم امکانات کے حامل تھے اس کے باوجود ان امکانات نے ان کی اخروی سعادت کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا ہے۔

آیہ ﴿أَذهَبتُم طَيِّبَاتِكُم﴾ بھی ان کافروں سے مربوط ہے جنہوں نے دنیاوی عیش و آرام کو کفر اور انکار خدا نیز سرکشی اور عصیان کے بدلے میں خریدا ہے جیسا کہ ابتداء آیہ میں وارد ہوا ہے: ﴿وَقِيلَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا...﴾ جن آیات میں ایمان اور عمل صالح اور اخروی سعادت کے درمیان نیز کفر و گناہ اور اخروی بدبختی کے درمیان رابطہ اتنا زیادہ ہے کہ جس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے اور یہ مطلب مسلم بھی ہے بلکہ اسلام و قرآن کی ضروریات میں سے ہے۔

رابطۂ دنیا و آخرت کی حقیقت

ایمان اور عمل صالح کا اخروی سعادت سے رابطہ اور کفر و گناہ کا اخروی شقاوت سے لگاؤ ایک طرح سے صرف اعتباری رابطہ نہیں ہے جسے دوسرے اعتبارات کے ذریعہ تبدیل کیا جا سکتا ہو اور ان کے درمیان کوئی تکوینی و حقیقی رابطہ نہ ہو اور ان آیات میں وضعی و اعتباری روابط پر دلالت کرنے والی تعبیروں سے مراد، رابطہ کا وضعی و اعتباری ہونا نہیں ہے بلکہ یہ تعبیریں انسانوں کی تفہیم اور تقریب ذہن کے لئے استعمال ہوئی ہیں. جیسے تجارت (۲)، خرید و فروش (۳) سزا (۴) جزا (۵) اور اس کے مثل، بہت سی آیات کے قرائن سے معلوم ہوتا ہے جو بیان کرتی ہیں کہ انسان نے جو کچھ

---

(۱) سورہ اعراف ۳۲۔ (۲) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَل أَدُلُّكُم عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّن عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (صف/۱۰) (اے صاحبان ایمان! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتادوں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے) (۳) ﴿إِنَّ اللَّهَ ...

بھی انجام دیاہے وہ دیکھے گااوراس کی جزاوہی عمل ہے.

اچھے لوگوں کی جزا کاان کے اچھے کاموں سے رابطہ بھی صرف فضل ورحمت کی بناپرنہیں ہے کہ جس میں ان کے نیک عمل کی شائستگی اوراستحقاق ثواب کالحاظ نہ کیا گیاہو کیونکہ اگرایساہوگا تو عدل وانصاف، اپنے اعمال کے مشاہدہ اوریہ کہ عمل کے مطابق ہی ہرانسان کی جزاہے جیسی آیات سے قطعاً سازگارنہیں ہے۔

مذکورہ رابطہ کوایک انرجی کا مادہ میں تبدیل ہونے کی طرح سمجھنا صحیح نہیں ہے اورموجودہ انرجی اورآخرت کی نعمتوں کے درمیان مناسبت کانہ ہونااورایک انرجی کا اچھے اور برے فعل میں استعمال کاامکان نیزوہ بنیادی کردارجوآیات میں عمل ونیت کے اچھےاور برے ہونے سے دیا گیاہے اس نظریہ کے باطل ہونے کی دلیل ہے.

گذشتہ مطالب کی روشنی میں ایمان وعمل صالح کاسعادت اورکفروگناہ کااخروی بدبختی سے ایک حقیقی رابطہ ہےاس طرح کہ آخرت میں انسان کے اعمال ملکوتی شکل میں ظاہرہوں گےاوروہی ملکوتی وجود، آخرت کی جزااورسزانیزعین عمل قرارپائے گا۔

منجملہ وہ آیات جواس حقیقت پردلالت کرتی ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

﴿وَ مَا تُقَدِّمُوا لِأنفُسِكُم مِن خَيرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ﴾(۱)

اورجوکچھ بھلائی اپنے لئے پہلے سے بھیج دوگےاس کوموجودپاؤگے۔

﴿يَومَ تَجِدُ كُلُّ نَفسٍ مَّا عَمِلَت مِن خَيرٍ مُّحضَراً وَ مَا عَمِلَت مِنٍ

... اشتَرَىٰ مِنَ المُؤمِنِينَ أَنفُسَهُم وَ أَموَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ﴾(توبہ/۱۱۱)(اس میں توشک ہی نہیں کہ خدانے مومنین سےان کی جانیں اوران کے مال اس بات پرخریدلئے ہیں کہ ان کے لئے بہشت ہے...)(۴)﴿وَ ذٰلِكَ جَزَاءُ مَن تَزَكّٰى﴾(طہ/۷۶)(اورجس نے اپنے آپ کوپاک وپاکیزہ رکھااس کا یہی (جنت) صلہ ہے)(۵)﴿فَنِعمَ أَجرُ العَامِلِينَ﴾(زمر/۷۴)(جنہوں نے راہ خدامیں سعی وکوشش کی ان کے لئے کیاخوب مزدوری ہے)(۱) سورہ بقرہ ۱۱۰۔

سُوء تَوَدُّ لَو أَنَّ بَينَهَا وَ بَينَهُ أَمَداً بَعِيداً﴾(۱)

اس دن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے اور جو کچھ برائی کی ہے اس کو موجود پائے گا آرزو کرے گا کہ کاش اس کی بدی اور اس کے درمیان میں زمانہ دراز ہو جاتا

﴿فَمَن يَعمَل مِثقَالَ ذَرَّةٍ خَيراً يَرَهُ☆وَ مَن يَعمَل مِثقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ﴾

جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے اسے بھی دیکھ لے گا۔(۲)

﴿إِنَّمَا تُجزَونَ مَا كُنتُم تَعمَلُونَ﴾(۳)

بس تم کو انھیں کاموں کا بدلہ ملے گا جو تم کیا کرتے تھے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأكُلُونَ أَموَالَ اليَتَامَىٰ ظُلماً إِنَّمَا يَأكُلُونَ فِي بُطُونِهِم نَاراً﴾

بے شک جو لوگ یتیم کے اموال کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے شکم میں آگ کھا رہے ہیں۔(۴)

دنیا اور آخرت کے رابطہ میں دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آخرت کی زندگی میں لوگ فقط اپنا نتیجۂ اعمال دیکھیں گے اور کوئی کسی کے نتائج اعمال سے سوء استفادہ نہیں کر سکے گا اور نہ ہی کسی کے برے اعمال کی سزا قبول کر سکے گا۔

﴿أَلا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزرَ أُخرَىٰ وَ أَن لَّيسَ لِلإِنسَانِ إِلا مَا سَعَىٰ﴾

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔(۵)

دوسرا نکتہ یہ ہے کے آخرت میں لوگ اپنی دنیاوی حالت کے اعتبار سے چار گروہ میں تقسیم ہونگے

---

(۱) سورہ آل عمران ۳۰۔(۲) سورہ زلزال ۷، ۸۔

(۳) طور ۱۶۔(۴) سورہ نساء ۱۰۔(۵) سورہ نجم/ ۳۸، ۳۹۔

الف)وہ لوگ جو دنیاوآخرت کی نعمتوں سے فیض یاب ہیں۔

﴿و آتَینَاہُ أَجرَہُ فِی الدُّنیَا وَ إِنَّہُ فِی الآخِرَۃِ لَمِنَ الصَّالِحِینَ﴾

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں بھی اچھا بدلہ عطا کیا اور وہ تو آخرت میں بھی یقینی نیکو کاروں میں سے ہیں۔(۱)

ب)وہ لوگ جو دنیاوآخرت میں محروم ہیں۔

﴿خَسِرَ الدُّنیَا وَ الآخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الخُسرَانُ المُبِینُ﴾

اس نے دنیاوآخرت میں گھاٹا اٹھایا صریحی گھاٹا۔(۲)

ج)وہ لوگ جو دنیا میں محروم اور آخرت میں بہرہ مند ہیں.

د)وہ لوگ جو آخرت میں محروم اور دنیا میں بہرہ مند ہیں.

آخری دو گروہ کے نمونے بحث کے دوران گذر چکے ہیں۔دنیاوآخرت کے رابطے (ایمان وعمل صالح ہمراہ سعادت اور کفر وگناہ ہمراہ شقاوت) میں آخری نکتہ یہ ہے کہ قرآنی نظریہ کے مطابق انسان کا ایمان اور عمل صالح اس کے گذشتہ آثار کفر کو ختم کر دیتا ہے اور عمر کے آخری حصہ میں کفر اختیار کرنا گذشتہ ایمان وعمل صالح کو برباد کر دیتا ہے۔(کہ جس کو حبط عمل سے تعبیر کیا گیا ہے)

﴿وَ مَن یُؤمِن بِاللّٰہِ وَ یَعمَل صَالِحاً یُکَفِّر عَنہُ سَیِّئَاتِہِ﴾. (۳)

اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے اور عمل صالح انجام دیتا ہے وہ اپنی برائیوں کو محو کر دیتا ہے

﴿وَ مَن یَرتَدِد مِنکُم عَن دِینِہِ فَیَمُت وَ ھُوَ کَافِرٌ فَأُولٰئِکَ حَبِطَت أَعمَالُھُم فِی الدُّنیَا وَ الآخِرَۃِ ...﴾(۴)

.....

(۱)سورہ عنکبوت ۲۷۔(۲)سورہ حج ۱۱۔

(۳)سورہ تغابن ۹۔

(۴)سورہ بقرہ ۲۱۷۔

اورتم میں سے جوشخص اپنے دین سے پھر گیا اور کفر کی حالت میں دنیا سے گیا،
اس نے اپنے دنیا وآخرت کے تمام اعمال برباد کردیئے ۔

دوسری طرف اگر چہ اچھا یا برا کام دوسرے اچھے یا برے فعل کے اثر کو ختم نہیں کرتا ہے لیکن بعض اچھے افعال، بعض برے افعال کے اثر کو ختم کردیتے ہیں اور بعض برے افعال بعض اچھے افعال کے آثار کو ختم کردیتے ہیں مثال کے طور پر احسان جتانا، نقصان پہونچانا، مالی انفاق (صدقات) کے اثر کو ختم کردیتا ہے.

﴿لا تُبطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالمَنِّ وَ الأذَىٰ﴾(۱)

اپنی خیرات کو احسان جتانے اور ایذا دینے کی وجہ سے اکارت نہ کرو۔

اور صبح وشام اور کچھ رات گئے نماز قائم کرنا بعض برے افعال کے آثار کو ختم کردیتا ہے قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَ أَقِمِ الصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفاً مِّنَ اللَّيلِ إِنَّ الحَسَنَاتِ يُذهِبنَ السَّيِّئَاتِ﴾

دن کے دونوں طرف اور کچھ رات گئے نماز پڑھا کرو کیونکہ نیکیاں بیشک گناہوں کو دور کرتی ہیں۔(۲)

شفاعت بھی ایک علت وسبب ہے جو انسان کے حقیقی کمال وسعادت کے حصول میں موثر ہے.(۴)

---

(۱) سورہ بقرہ ۲۶۴۔(۲) ھود/۱۱۴۔

(۳) قرآن مجید کی آیات میں ایمان اور عمل صالح، ایمان اور تقویٰ، ہجرت اور اذیتوں کا برداشت کرنا، جہاد نیز کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنا، پوشیدہ طور پر صدقہ دینا، احسان کرنا، توبۂ نصوح اور نماز کے لئے دن کے ابتدا اور آخر میں نیز رات گئے قیام کرنا منجملہ ان امور میں سے ہیں جن کو بعض گناہوں کے آثار کو محو کرنے کی علت کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ملاحظہ ہو: محمد/۲؛ مائدہ/۱۲؛ عنکبوت/۷؛ مائدہ/۶۵؛ آل عمران/۱۹۵؛ نساء/۳۱؛ بقرہ/۲۷۱؛ انفال/۲۹؛ زمر/۳۵؛ تحریم/۸؛ ھود/۱۱۴۔اچھے اور برے اعمال کا ایک دوسرے میں اثر انداز ہونے کی...

خلاصہ فصل

۱۔دنیا میں انسان کی تلاش وکوشش آخرت میں اس کی بدبختی وخوشبختی میں بہت ہی اہم رول ادا کرتی ہے.

۲۔دنیاوآخرت کے رابطے کے سلسلہ میں گفتگو کرنا اس جہت سے ضروری ہے کہ موت کے بعد کی دنیا پر عقیدہ رکھنا صرف اس دنیا ہی میں ہمارے اختیاری اعمال ورفتار پر موثر نہیں ہے بلکہ اس وقت یہ عقیدہ ثمر بخش ہے جب انسان کے اعمال ورفتار اور دنیا میں اس کے طریقۂ زندگی اور آخرت میں اس کی کیفیت زندگی کے درمیان رابطہ کا یقین رکھتے ہوں.

۳۔ایمان وعمل صالح کی سعادت اور کفر وگناہ کا اخروی بدبختی کے درمیان ایک حقیقی رابطہ ہے.اس طرح کہ آخرت میں انسان کے اعمال ملکوتی صورت میں ظاہری ہوتے ہیں اور اس کا وجود ملکوتی ہی آخرت میں حقیقی عمل نیز سزا اور جزا ہے۔

۴۔آخرت کی زندگی میں لوگ فقط اپنے اعمال کے نتائج دیکھتے ہیں اور کوئی کسی کے نتائج

...مقدار اور اقسام کی تعیین کو وحی اور ائمہ معصومینؑ کی گفتگو کے ذریعہ حاصل کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں کوئی عام قاعدہ بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اچھے اور برے اعمال، حبط وتکفیر ہونے کے علاوہ اس دنیا میں انسان کی توفیقات اور سلب توفیقات، خوشی اور ناخوشی میں موثر ہیں، مثال کے طور پر دوسروں پر احسان کرنا خصوصاً والدین اور عزیز واقربا پر احسان کرنا آفتوں اور بلاؤں کے دفع اور طول عمر کا سبب ہوتا ہے اور بزرگوں کی بے احترامی کرنا توفیقات کے سلب ہونے کا موجب ہوتا ہے۔لیکن ان آثار کا مرتب ہونا اعمال کے پوری طرح سے جزا وسزا کے دریافت ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ حقیقی جزا وسزا کا مقام جہان اخروی ہے۔

(۴) شفاعت کے کردار اور اس کے شرائط کے حامل ہونے کی آگاہی اور اس سلسلہ میں بیان کئے گئے شبہات اور ان کے جوابات سے مطلع ہونے کے لئے ملحقات کی طرف مراجعہ کریں۔

اعمال سے سوءاستفادہ نہیں کرسکتا ہےاور کسی کے برے اعمال کی سزا بھی نہیں قبول کرسکتا ہے.﴿و ان لیس للانسان الا ماسعی﴾۔

۵۔آخرت میں لوگ اپنی دنیاوی حالت کے اعتبار سے چار گروہ میں تقسیم ہیں:

الف)وہ لوگ جو دنیا و آخرت کی نعمتوں سے مستفیض ہیں.

ب)وہ لوگ جو دنیا و آخرت میں محروم ہیں.

ج)وہ لوگ جو دنیا میں محروم اور آخرت میں بہرہ مند ہیں.

د)وہ لوگ جو آخرت میں محروم اور دنیا میں بہرہ مند ہیں.

۶۔ایمان وعمل صالح اس وقت فائدہ مند ہیں جب انسان، آخری عمر تک اپنے ایمان کی حفاظت کرے۔

تمرین

۱۔عمر کے آخری حصہ میں کافر ہوجانے کی وجہ سے کیا کسی انسان کے تمام اعمال صالحہ کے تباہ و برباد ہوجانے کی کوئی عقلی توجیہ پیش کی جاسکتی ہے؟اور کس طرح؟

۲۔انسان کا حقیقی کمال نیز بدبختی اور خوشبختی کے مسئلہ میں معاد کو تسلیم کرنے والوں کے نظریات اور منکرین معاد کے نظریات کا اختلاف کس چیز میں ہے؟مفہوم ومصداق میں یا دونوں میں یا کسی اور چیز میں ہے وضاحت کریں؟

۳۔اگر ہر انسان عالم آخرت میں فقط اپنے اعمال کا نتیجہ پاتا ہے تو سورہ نحل کی ۲۵ ویں آیہ سے مراد کیا ہے؟

۴۔دنیاوی زندگی میں مندرجہ ذیل اقسامِ رابطہ میں سے کون سا رابطہ مفید ہے؟اور کون سا

آخرت میں مفید نہیں ہے؟

۔الف ۔خاندانی رابطہ.ب ۔دوستی کا رابطہ.ج ۔اعتباری اور وضعی رابطہ (اعتباری اور وضعی قوانین) (تکوینی رابطہ) (علّی قوانین)۔

۵۔مرے ہوے لوگوں کی اخروی زندگی میں، زندہ لوگوں کی دعاؤں کا کیا اثر ہے اور کس طرح اس حقیقت (کہ ہر انسان فقط اپنے نتیجہ اعمال کو پاتا ہے) سے سازگار ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے:

۔حسینی طہرانی، محمد حسین؛ (۱۴۰۷) معاد شناسی؛ ج۹، تہران: حکمت۔

۔جوادی آملی، عبداللہ؛ (۱۳۶۳) دہ مقالہ پیرامون مبدأ ومعاد؛ تہران: الزہراء

۔محمد حسین طباطبائی؛ (۱۳۵۹) فرازھای از اسلام؛ تہران: جہان آراء

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۰) آموزش عقاید؛ ج۳، تہران: سازمان تبلیغات اسلامی.

۔.....(۱۳۶۷) معارف قرآن (جہان شناسی، کیھان شناسی، انسان شناسی)؛ قم: موسسہ درراہ حق۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۶۸) مجموعہ آثار؛ ج۱، تہران: صدرا۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۶۹) مجموعہ آثار؛ ج۲ تہران: صدرا۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۵۴) سیری در نہج البلاغہ؛ قم: دارالتبلیغ اسلامی۔

ملحقات

ا۔شفاعت

شفاعت، شفع (جفت، زوج) سے لیا گیا ہے.اور عرف میں یہ معنی ہے کہ کوئی عزت دار شخص کسی بزرگ سے خواہش کرے کہ وہ اس کے (جس کی شفاعت کر رہا ہے) جرم کی سزا معاف کردے. یا خدمت گذار فرد کی جزا میں اضافہ کردے۔

شفاعت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان، شفیع کی مدد کے بغیر سزا سے بچنے یا جزا کے ملنے کے لائق نہیں ہے لیکن شفیع کی درخواست سے اس کے لئے یہ حق حاصل ہو جائے گا۔

شفاعت ، برائیوں سے توبہ و تکفیر کے علاوہ ہے گنہگاروں کی امید کی آخری کرن اور خداوند عالم کی رحمت کا سب سے عظیم مظہر ہے.شفاعت کا معنی شفیع کی طرف سے خداوند عالم پر اثر انداز ہونا نہیں ہے.شفاعت کا انکار کرنے والی آیات سے مراد جیسے ﴿لا یُقبَلُ مِنهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''سورہ بقرہ/۴۸و۱۲۳'' کی آیہ کے یہی معنی ہے.لفظ شفاعت کبھی وسیع تر معنی یعنی دوسرے انسان کے ذریعہ کسی انسان کے لئے کسی طرح سے اثر خیر ظاہر ہونے میں استعمال ہوتا ہے.جیسے فرزندوں کے لئے والدین کا موثر ہونا اور اس کے برعکس یعنی والدین کے لئے بچوں کا موثر ہونا یا اساتید اور رہنما حضرات کا شاگردوں اور ہدایت پانے والوں کے حوالے سے حتی مؤذن کی آواز ان لوگوں کے لئے جو اس کی آواز سے نماز کو یاد کرتے ہیں اور مسجد جاتے ہیں.شفاعت کہا جاتا ہے.وہی اثر خیر جو دنیا میں تھا آخرت میں شفاعت کی صورت میں ظاہر ہوگا جس طرح گناہوں کے لئے استغفار نیز دوسرے دنیاوی حاجات کے پورا ہونے کے لئے دعا کرنے کو شفاعت کہا جاتا ہے۔

شفاعت کے مندرجہ ذیل قوانین ہیں:

الف) خداوند عالم کی طرف سے شفیع کو اجازت.

ب) شفاعت پانے والوں کے اعمال نیز اس کی اہمیت وعظمت سے شفاعت کرنے والوں کا آگاہ ہونا۔

ج) دین وایمان کے حوالے سے شفاعت پانے والوں کا ممدوح اور پسندیدہ ہونا.

حقیقی شفاعت کرنے والے خداوند عالم کی طرف سے ماذون ہونے کے علاوہ معصیت کار اور گنہگار نہ ہوں .اہل اطاعت ومعصیت کے مراتب کو پرکھنے کی ان کے اندر صلاحیت ہو نیز شفاعت کرنے والوں کے ماننے والے بھی کم ترین درجہ کے شفیع ہوں، دوسری طرف وہی شفاعت پانے کے قابل ہیں جو خداوند کریم کی اجازت کے علاوہ خدا، انبیاء حشر اور وہ تمام چیزیں جو خداوند عالم نے اپنے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں منجملہ ''شفاعت'' پر حقیقی ایمان رکھتے ہوں اور زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے ایمان کو محفوظ رکھے ہوں اور جو لوگ نماز کو ترک کریں اور فقرا کی مدد نہ کریں نیز روز قیامت کی تکذیب کریں اور خود شفاعت سے انکار کریں یا اس کو ہلکا سمجھیں تو ایسے لوگ شفاعت سے محروم ہیں.

اس دنیا میں شفیع کی شفاعت کا قبول کرنا شفیع کی ہمنشینی اور محبت کی لذت کے ختم ہو جانے کا خوف یا شفیع کی طرف سے ضرر پہونچنے کا اندیشہ یا شفیع سے شفاعت کے قبول کرنے کی ضرورت کی وجہ سے شفاعت انجام پاتی ہے لیکن خداوند عالم کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے قبول ہونے کی دلیل مذکورہ امور نہیں ہیں بلکہ خداوند عالم کی وسیع رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ دائمی رحمت کے حاصل کرنے کی بہت کم صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لئے شرائط وضوابط کے ساتھ کوئی راستہ فراہم کرنے کا نام شفاعت ہے۔

۲۔شفاعت کے بارے میں اعتراضات وشبہات

شفاعت کے بارے میں بہت سے اعتراضات وشبہات بیان کئے گئے، یہاں پر ہم ان میں سے بعض اہم اعتراضات وشبہات کا تجزیہ کریں گے۔

پہلا شبہہ : پہلا شبہہ یہ ہے کہ بعض آیات قرآنی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ روز قیامت کسی کی بھی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی جیسا کہ سورہ بقرہ کی ۴۸ ویں آیہ میں فرماتا ہے:

﴿وَ اتَّقُوا یَوماً لا تَجزِی نَفسٌ عَن نَّفسٍ شَیئاً وَ لا یُقبَلُ مِنهَا شَفَاعَةٌ وَ لا یُؤخَذُ مِنهَا عَدلٌ وَ لا هُم یُنصَرُونَ﴾

جواب: اس طرح کی آیات بغیر قاعدہ وقانون کے مطلقاً اور مستقل شفاعت کی نفی کرتی ہیں بلکہ جو لوگ شفاعت کے معتقد ہیں وہ مزید اس بات کے قائل ہیں کہ مذکورہ آیات عام ہیں جو ان آیات کے ذریعہ جو خدا کی اجازت اور مخصوص قواعد وضوابط کے تحت شفاعت کے قبول کرنے پر دلالت کرتی ہیں تخصیص دی جاتی ہیں جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے۔

دوسرا شبہہ : شفاعت کے صحیح ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ خداوند عالم شفاعت کرنے والوں کے زیر اثر قرار پائے یعنی ان لوگوں کی شفاعت فعل الٰہی یعنی مغفرت کا سبب ہوگی.

جواب : شفاعت کا قبول کرنا زیر اثر ہونے کی معنی میں نہیں ہے جس طرح توبہ اور دعا کا قبول ہونا بھی مذکورہ غلط لازمہ نہیں رکھتا ہے. اس لئے کہ ان تمام موارد میں بندوں کے افعال کا اس طرح شائستہ وسزاوار ہونا ہے کہ وہ رحمت الٰہی کو جذب کرنے کا باعث بن سکیں، اصطلاحاً قابل کی شرط قابلیت اور فاعل کی شرط فاعلیت نہیں ہے۔

تیسرا شبہہ : شفاعت کا لازمہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے خدا سے زیادہ مہربان ہوں، اس لئے کہ فرض یہ ہے کہ اگر ان کی شفاعت نہ ہوتی تو یہ گنہگار لوگ عذاب میں مبتلا ہو جاتے، یا ہمیشہ معذّب رہتے.

جواب: شفاعت کرنے والوں کی مہربانی اور ہمدردی بھی خداوند عالم کی بے انتہا رحمت کی جھلک ہے. دوسرے لفظوں میں، شفاعت وہ وسیلہ اور راہ ہے جسے خداوند عالم نے خود اپنے بندوں

کے گناہوں کو بخشنے کے لئے قرار دیا ہے اور جیسا کہ اشارہ ہوا کہ اسکی عظیم رحمتوں کا جلوہ اور کرشمہ اس کے منتخب بندوں میں ظاہر ہوتا ہے اسی طرح دعا اور توبہ بھی وہ ذرائع ہیں جنہیں خداوند عالم نے گناہوں کی بخشش اور ضروتوں کو پورا کرنے کے لئے قرار دیا ہے.

چوتھا شبہہ: اگر خداوند عالم کا گنہگاروں پر عذاب نازل کرنے کا حکم مقتضاء عدالت ہے تو ان کے لئے شفاعت کا قبول کرنا خلاف عدل ہوگا اور اگر شفاعت کو قبول کرنے کے نتیجہ میں عذاب الٰہی سے نجات پانا عادلانہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ شفاعت کے انجام پانے سے پہلے عذاب کا حکم، غیر عادلانہ تھا۔

جواب: ہر حکم الٰہی (چاہے شفاعت سے پہلے عذاب کا حکم ہو یا شفاعت کے بعد نجات کا حکم ہو) عدل وحکمت کے مطابق ہے ایک حکم کا عادلانہ اور حکیمانہ ہونا دوسرے حکم کے عادلانہ اور حکیمانہ ہونے سے ناسازگار نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا موضوع جدا ہے۔

وضاحت: عذاب کا حکم ارتکاب گناہ کا تقاضا ہے. ان تقاضوں سے چشم پوشی کرنا ہی گنہگار کے حق میں شفاعت اور قبول شفاعت کے تحقق کا سبب ہوتا ہے. اور عذاب سے نجات کا حکم شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کی وجہ سے ہے، یہ موضوع اس طرح ہے کہ بلا کا دعا یا صدقہ دینے سے پہلے مقدر ہونا یا دعا اور صدقہ کے بعد بلا کا ٹل جانا ہی حکیمانہ فعل ہے۔

پانچواں شبہہ: خداوند متعال نے شیطان کی پیروی کو عذاب دوزخ میں گرفتار ہونے کا سبب بتایا ہے جیسا کہ سورہ حجر کی ۴۲ و ۴۳ ویں آیہ میں فرماتا ہے:

﴿إِنَّ عِبَادِی لَیسَ لَکَ عَلَیهِم سُلطَانٌ إِلا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الغَاوِینَ ☆ وَ إِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوعِدُهُم أَجمَعِینَ﴾

جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تجھے کسی طرح کی حکومت نہ ہوگی مگر صرف گمراہوں

میں سے جو تیری پیروی کرے اور ہاں ان سب کے واسطے وعدہ بس جہنم ہے۔

آخرت میں گنہگاروں پر عذاب نازل کرنا ایک سنت الٰہی ہے اور سنت الٰہی غیر قابل تغیر ہے جیسا کہ سورہ فاطر کی ۴۳ ویں آیہ میں فرماتا ہے کہ:

﴿فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبدِيلاً وَ لَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحوِيلاً﴾

ہرگز خدا کی سنت میں تبدیلی نہیں آئیگی اور ہرگز خدا کی سنت میں تغیر نہیں پیدا ہوگا جب یہ بات طے ہے تو کیسے ممکن ہے کہ شفاعت کے ذریعہ خدا کی سنت نقض ہو جائے اور اس میں تغیر پیدا ہو جائے۔

جواب: جس طرح گنہگاروں پر عذاب نازل کرنا ایک سنت ہے اسی طرح واجد شرائط گنہگاروں کے لئے شفاعت قبول کرنا بھی ایک غیر قابل تغیر الٰہی سنت ہے لہٰذا دونوں پر ایک ساتھ توجہ کرنا چاہئیے، خداوند عالم کی مختلف سنتیں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں ان میں جس کا معیار و اعتبار زیادہ قوی ہوگا وہ دوسرے پر حاکم ہو جاتی ہے۔

چھٹا شبہہ: وعدۂ شفاعت، غلط راہوں اور گناہوں کے ارتکاب میں لوگوں کی جرأت کا سبب ہوتا ہے۔

جواب: شفاعت و مغفرت ہونا مشروط ہے بعض ایسی شرطوں سے کہ گنہگار اس کے حصول کا یقین پیدا نہیں کر سکتا ہے. شفاعت کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اپنے ایمان کو اپنی زندگی کے آخری لمحات تک محفوظ رکھے اور ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی ایسی شرط کے تحقق پر یقین (کہ ہمارا ایمان آخری لمحہ تک محفوظ رہے گا) نہیں رکھ سکتا ہے. دوسری طرف جو مرتکب گناہ ہوتا ہے اگر اس کے لئے بخشش کی کوئی امید اور توقع نہ ہو تو وہ مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو جائے گا اور یہی ناامیدی اس میں ترک گناہ کے انگیزے کو ضعیف کر دے گی اور آخر کار خطا و انحراف کی طرف مائل ہو جائے گا اسی لئے خدائی مربیوں کا طریقۂ تربیت یہ رہا ہے کہ وہ ہمیشہ لوگوں کو خوف و امید کے درمیان باقی رکھتے ہیں. نہ

ہی رحمت خدا سے اتنا امیدوار کرتے ہیں کہ خداوند عالم کے عذاب سے محفوظ ہو جائیں اور نہ ہی ان کو عذاب سے اتنا ڈراتے ہیں کہ وہ رحمت الٰہی سے مایوس ہو جائیں. اور ہمیں معلوم ہے کہ رحمت الٰہی سے مایوس اور محفوظ ہونا گناہ کبیرہ شمار ہوتا ہے.

ساتواں شبہہ: عذاب سے بچنے میں شفاعت کی تاثیر یعنی گنہگار شخص کو بدبختی سے بچانے اور سعادت میں دوسروں (شفاعت کرنے والے) کے فعل کا موثر ہونا ہے. جبکہ سورہ نجم ۳۹ ویں آیہ کا تقاضا یہ ہے کہ فقط یہ انسان کی اپنی کوشش ہے جو اسے خوشبخت بناتی ہے۔

جواب: منزل مقصود کو پانے کے لئے کبھی خود انسان کی کوشش ہوتی ہے جو آخری منزل تک جاری رہتی ہے اور کبھی مقدمات اور واسطوں کے فراہم کرنے سے انجام پاتی ہے. جو شخص مورد شفاعت قرار پاتا ہے وہ بھی مقدمات سعادت کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے. اس لئے کہ ایمان لانا اور استحقاق شفاعت کے شرائط کا حاصل کرنا حصول سعادت کی راہ میں ایک طرح کی کوشش شمار ہوتی ہے. چاہے وہ تلاش ایک ناقص و بے فائدہ کیوں نہ ہو. اسی وجہ سے مدتوں برزخ کی سختیوں اور غموں میں گرفتار ہونے کے بعد انسان میدان محشر میں وارد ہوگا لیکن بہر حال خود ہی سعادت کے بیج (یعنی ایمان) کو اپنے زمین دل میں بوئے اور اس کو اپنے اچھے اعمال سے آبیاری کرے اس طرح کہ اپنی عمر کے آخری لمحات تک خشک نہ ہونے دے تو یہ اس کی انتہائی سعادت وخوشبختی ہے جو خود اسی کی تلاش وکوشش کا نتیجہ ہے. اگر چہ شفاعت کرنے والے بھی ایک طرح سے اس درخت کے ثمر بخش ہونے میں موثر ہیں جس طرح اس دنیا میں بھی بعض لوگ بعض دوسرے افراد کی تربیت و ہدایت میں موثر واقع ہوتے ہیں لیکن ان کی یہ تاثیر اس شخص کے تلاش وجستجو کی نفی کا معنی نہیں دیتی ہے. (۱)

.....

(۱) ملاحظہ ہو: محمد تقی مصباح؛ آموزش عقاید؛ ج ۳ سازمان تبلیغات، تہران ۱۳۷۰۔

فہرست منابع

۱۔قرآن کریم۔

۲۔آرن، ریمن (۱۳۷۰) مراحل اساسی اندیشہ در جامعہ شناسی، ترجمہ باقر پرھام، تہران: انتشارات آموزش انقلاب اسلامی۔

۳۔آلوسی، سید محمود (۱۴۰۸) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، بیروت: دار الفکر۔

۴۔ابوزید، منیٰ احمد (۱۴۱۴) الانسان فی الفلسفۃ الاسلامیۃ، بیروت: مؤسسۃ الجامعیۃ للدراسات۔

۵۔احمدی، بابک (۱۳۷۳) مدرنیتہ واندیشہ انتقادی، تہران: مرکز۔

۶۔احمدی بابک (۱۳۷۷) معمای مدرنیتہ، تہران: مرکز۔

۷۔اسٹیونسن، لسلی (۱۳۶۸) ہفت نظریہ درباره طبیعت انسان، تہران: رشد

۸۔ایزوتسو، ٹوشی ہیکو (۱۳۶۸) خداوانسان در قرآن، ترجمہ احمد آرام، تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی۔

۹۔باربور، ایان (۱۳۶۲) علم ودین، ترجمہ بہاء الدین خرمشاہی، تہران: مرکز نشر دانشگاہی۔

۱۰۔بارس، بولک، ودیگران (۱۳۶۹) فرہنگ اندیشہ تو، ترجمۂ ع، پاشایی، تہران: مازیار۔

۱۱۔بدوی، عبدالرحمٰن (۱۹۸۴) موسوعۃ الفسلفۃ، بیروت: الموسسۃ العربیۃ للدراسات والنشر۔

۱۲۔بوکای، موریس (۱۳۶۸) مقایسہ ای تطبیقی میان تورات، انجیل، قرآن وعلم، ترجمہ ذبیح اللہ دبیر، تہران: نشر فرہنگ اسلامی۔

۱۳۔پاکر، ڈوینس (۱۳۷۰) آدم سازان، ترجمہ حسن افشار، تہران: بہبہارنی۔

۱۴۔پاپر، کارل (۱۳۶۹) جستجوی ناتمام، ترجمہ ایرج علی آبادی، تہران۔

۱۵۔تہانوی، محمد علی (۱۹۹۶) کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، بیروت: مکتبۃ لبنان ناشرون۔

۱۶۔ڈیوس ٹونی (۱۳۷۸) ہیومنزم، ترجمہ عباس مخبر، تہران: مرکز۔
۱۷۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۶) تفسیر موضوعی قرآن کریم: توحید و شرک، قم: نہاد نمایندگی رہبری در دانشگاہ ھا۔
۱۸۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۸) تفسیر موضوعی قرآن کریم، قم: اسراء۔
۱۹۔الحر العاملی، محمد بن الحسن (۱۴۰۳) وسایل الشیعہ ج۱۹، تہران: المکتبۃ الاسلامیۃ۔
۲۰۔دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ (۱۳۷۲) درآمدی بہ تعلیم و تربیت اسلامی: فلسفہ تعلیم و تربیت، تہران: سمت۔
۲۱۔حسن زادہ، صادق (۱۳۷۸) اسوۂ عارفان، قم: انتشارات امیر المومنین۔
۲۲۔دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ (۱۳۶۹) مکتبھای روان شناسی و نقد آن، ج۱، تہران: سمت۔
۲۳۔دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ (۱۳۷۲) مکتبھای روان شناسی و نقد آن، ج۲، تہران: سمت۔
۲۴۔ڈورانٹ، ویل (۱۳۷۱) تاریخ تمدن، ترجمہ صفدر تقی زادہ و ابو طالب صارمی، ج۵، تہران، انتشارات و آموزش انقلاب اسلامی، ایران۔
۲۵۔ڈورکھیم، امیل (۱۳۵۹) قواعد روش جامعہ شناسی، ترجمہ علی محمد کاردان، تہران: دانشگاہ تہران۔
۲۶۔رشید رضا، محمد، المنار فی تفسیر القرآن، بیروت: دار المعرفۃ۔
۲۷۔رضی موسوی، شریف محمد (۱۴۰۷) نہج البلاغہ، مصحح صبحی صالحی، قم: دار الہجرۃ۔
۲۸۔رنڈل، جان ہرمان (۱۳۷۶) سیر تکامل عقل نوین، ترجمہ ابو القاسم پاینده، تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، ایران۔
۲۹۔روزنثال، یودین، و دوسرے افراد (۱۹۷۸) الموسوعۃ الفلسفیۃ، ترجمہ سمیر کرم، بیروت: دار الطبیعۃ۔
۳۰۔زیادہ، معن (۱۹۸۶) الموسوعۃ الفلسفیۃ العربیۃ، بیروت: معہد الانماء العربی۔
۳۱۔سبحانی، جعفر (۱۴۱۱) الالہیات علی ضوء الکتاب والسنۃ والعقل، قم: المرکز العالمی للدراسات الاسلامیۃ

۳۲۔شفلر، ایزرائل (۱۳۷۷) در باب استعدادهای آدمی (گفتاری در فلسفہ تعلیم وتربیت) تہران: جہاد دانشگاہی۔
۳۳۔سلطانی نسب، رضا، وفرہادگرجی (۱۳۶۸) جنین شناسی انسان (بررسی تکامل طبیعی وغیر طبیعی انسان، تہران: جہاد دانشگاہی۔
۳۴۔شاکرین، حمیدرضا ''قرآن ورویان شناسی'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ، شمارہ ۸، ص ۲۲، ۲۵۔
۳۵۔صانع پور، مریم (۱۳۷۸) نقدی برمبانی معرفت شناسی ہیومنیستی، تہران: دانش واندیشہ معاصر۔
۳۶۔صدوق، ابوجعفر حسین (۱۳۷۸) التوحید، تہران: مکتبۃ الصدوق۔
۳۷۔طبارہ، عبدالفتاح، خلق الانسان، دراسۃ علمیۃ قرآنیۃ، ج ۲ بیروت۔
۳۸۔طباطبایی، محمد حسین (۱۳۸۸) المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ۲، ۷، ۱۵، تہران: دارالکتب الاسلامیۃ۔
۳۹۔طوسی، خواجہ نصیرالدین (۱۳۴۴) اوصاف الاشراف، تہران: وزارت فرہنگ وہنر۔
۴۰۔طبرسی، ابوعلی فضل (۱۳۷۹) مجمع البیان لعلوم القرآن، تہران: مکتبۃ العلمیۃ الاسلامیۃ۔
۴۱۔طہ، فرج عبدالقادر (۱۹۹۳) موسوعۃ علم النفس والتحلیل النفسی، کویت: دارالسعادۃ الصباح۔
۴۲۔عبودیت، عبدالرسول (۱۳۷۸) ہستی شناسی، ج ۱، قم: موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔
۴۳۔العطاس، محمد نقیب (۱۳۷۴) اسلام ودنیوی گروی، ترجمہ احمد آرام، تہران: موسسہ مطالعاتی اسلامی دانشگاہ تہران۔
۴۴۔فرینکل، ویکٹور امیل (۱۳۷۵) انسان درجستجوی معنی، ترجمہ اکبر معارفی، تہران: دانشگاہ تہران
۴۵۔فرینکل، ویکٹور امیل (۱۳۷۲) پزشک روح، ترجمہ فرخ سیف بہزاد، تہران: درسا۔
۴۶۔فرینکل، ویکٹور امیل (۱۳۷۱) ریادناشنیدہ معنی، ترجمہ علی علوی نیا ومصطفیٰ تبریزی، (بی جا) یادآوران۔
۴۷۔فولادوند، عزت اللہ ''سیر انسان شناسی درفلسفہ غرب از یونان تاکنون'' نگاہ حوزہ، شمارہ ۵۳، ۵۴۔

۴۸۔قاسم لو، یعقوب (۱۳۷۹) طبیب عاشقان، قم: نسیم حیات۔
۴۹۔کیسیر ر، ارنست (۱۳۶۰) فلسفہ و فرہنگ، ترجمہ بزرگ نادرزادہ، تہران: موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی۔
۵۰۔کیسیر ر، ارنست (۱۳۷۰) فلسفہ روشنگری، ترجمہ یداللہ موقن، تہران: نیلوفر۔
۵۱۔کلینی، محمد بن یعقوب (۱۳۸۸) اصول کافی، ج ۱و۲، تہران: دارالکتب الاسلامیہ۔
۵۲۔کوزر، لوئیس (۱۳۶۸) زندگی واندیشہ بزرگان جامعہ شناسی، ترجمہ محسن ثلاثی، تہران: علمی۔
۵۳۔لالانڈ، اینڈریو (۱۹۹۶) موسوعۃ لالاندالفلسفیہ، ترجمہ خلیل احمد خلیل بیروت: منشورات عویدات
۵۴۔لالانڈ، اینڈریو (۱۳۷۷) فرہنگ علمی انتقادی فلسفہ، ترجمہ غلام رضا وثیق، تہران: فردوسی ایران۔
۵۵۔مان، مائکل (۱۴۱۴) موسوعۃ العلوم الاجتماعیۃ، ترجمہ عادل مختار الھواری، مکتبۃ الفلاح الامارات العربیۃ المتحدۃ۔
۵۶۔مجلسی، محمد باقر (۱۳۶۳) بحارالانوار ج ۱، ۵، ۱۱، ۲۱، ۶۷، تہران: دارالکتب الاسلامیہ۔
۵۷۔محمد تقی مصباح (۱۳۶۵) آموزش فلسفہ ج ۲، تہران: سازمان تبلیغات۔
۵۸۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۵) اخلاق درقرآن، ج ۱قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔
۵۹۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خداشناسی، کیھان شناسی، انسان شناسی) قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔
۶۰۔محمد تقی مصباح، خودشناسی برای خودسازی، قم: موسسہ درراہ حق۔
۶۱۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۰) آموزش عقاید، ج ۳ تہران: سازمان تبلیغات اسلامی۔
۶۲۔محمد تقی مصباح (۱۳۶۸) جامعہ وتاریخ از دیدگاہ قرآن، تہران: سازمان تبلیغات اسلامی۔
۶۳۔محمد تقی مصباح، راہنماشناسی، قم: حوزہ علمیہ قم۔
۶۴۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۰) مجموعہ آثار، ج ۳، تہران: صدرا۔

۶۵۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۱) مجموعہ آثار، ج۶، تہران: صدرا۔

۶۶۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۱) انسان کامل، تہران: صدرا۔

۶۷۔مطہری، مرتضی (۱۳۴۵) سیری در نہج البلاغہ، قم: دارالتبلیغ اسلامی۔

۶۸۔ملکیان، مصطفیٰ (۱۳۷۵) اگزیستانسیالیزم، فلسفہ عصیان وشورش، محمد غیاثی، قم۔

۶۹۔نوذری، حسین علی، صورتبندی مدرنیتہ وپست مدرنیتہ، تہران: چاپخانہ علمی وفرہنگی، ایران۔

۷۰۔نوری، میرزا حسین (۱۴۰۸) مستدرک الوسائل، ج۶، بیروت: موسسہ آل البیت لاحیاء التراث

۷۱۔واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان در اسلام، سمت (دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ)۔

(72) Webster Mariam,(1988)Webster's Ninth collegiate Dictionary,U.S.A.

(73)Kupet Adam,(1958)the social sciences Encyclopedia, Rotlage and Kogan paul

(74)Theodorson,George,(1969)and Acilles,G;A modern Dictionary of sociology,NEW YORK,Thomas. Y.Prowerl.

(75)Lw,R,I,Z Encyclopedia of Religion,(1974)the NEW(15th).

(76)Paul,Edward,(1976)Encyclopedia of Philosophy,NEW YORK,Macmillan.

قابل ذکر بات یہ کہ بہت سے مذکورہ منابع، ''مزید مطالعہ'' کے عنوان سے اس کتاب کے ہر فصل کی تالیف میں مورد استفادہ واقع ہوئے ہیں۔لیکن چونکہ ان کی معلومات اسی موضوع فصل کے تحت تھیں اور اس منابع سے ان کے استفادہ کی مقدار بھی کم ہونے کی بناپر دوبارہ ذکر کرنے سے پرہیز کیا جارہا ہے۔

خودآزمائی

۱.انسان شناسی سے خداشناسی، نبوت ومعاد کے رابطہ کی وضاحت کیجئے؟

۲.دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران کی چار مرکزی بحثوں کو بیان کیجئے؟

۳.ہیومنزم کے چار نتائج وپیغامات کو بیان کرتے ہوئے ہر ایک کی اختصار کے ساتھ وضاحت کیجئے؟

۴.ہیومنزم کے تفکرات کو بیان کرتے ہوئے تبصرہ وتنقید کیجئے؟

۵.خودفراموش انسان کی خصوصیات اور خودفراموشی کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے کم از کم پانچ موارد کی طرف اشارہ کیجئے؟

۶.خودفراموشی کے علاج کے عملی طریقوں کی تحلیل کیجئے؟

۷.قرآن مجید کی تین آیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے خلقت انسان کی وضاحت کیجئے؟

۸.انسان کے دو بعدی ہونے کی دلیلیں پیش کیجئے؟

۹.دینی اعتبار سے انسان کی مشترکہ فطرت کا سب سے مرکزی عنصر کیا ہے؟

۱۰.فطرت کے لازوال ہونے کی سورۂ روم کی تیسویں آیہ سے وضاحت کیجئے اور مذکورہ آیہ میں ﴿لا تبديل لخلق الله﴾ سے مراد کیا ہے وضاحت کیجئے؟

۱۱.قرآنی اصطلاح میں ان کلمات، روح، نفس، عقل وقلب کا آپس میں کیا رابطہ ہے وضاحت کیجئے؟

۱۲.کرامت انسان سے کیا مراد ہے وضاحت کرتے ہوئے قرآن کی روشنی میں اس کے اقسام کو ذکر کیجئے؟

۱۳.کیا آیۂ شریفہ﴿و ما رمیت اذ رمیت و لکن الله رمی ﴾عقیدۂ جبر کی تائید نہیں کرتی ہے؟اور کیوں؟

۱۴.جبر الٰہی کے سلسلہ میں جو شبہات پیدا ہوئے ہیں اس کا جواب دیجئے؟

۱۵.ان تین عناصر کو بیان کیجئے جن کا انسان ہر اختیاری عمل کے انجام دینے میں محتاج ہے؟

۱۶.افعال انسان کے انتخاب کے معیار کی وضاحت کیجئے؟

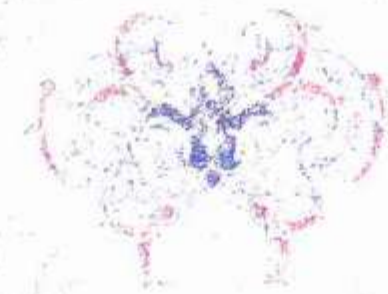
۱۷.قرآن وروایات کی زبان میں کیوں اچھے اعمال کو''عمل صالح'' کہا گیا ہے؟

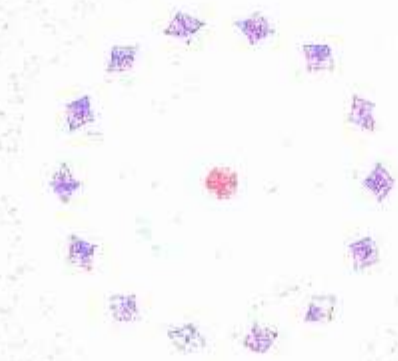
۱۸.اسلام کی نظر میں انسان کامل کی خصوصیات کیا ہیں؟

۱۹.قرآن میں ذکر کئے گئے کلماتِ دنیا اور آخرت کے تین موارد استعمال کو بیان کیجئے؟

۲۰.اواخر عمر میں کفر کی وجہ سے کسی شخص کے تمام اچھے اعمال برباد ہو جانے کے بارے میں مناسب توجیہ پیش کیجئے؟

RETURN BOX 17B/VER





مجمع جهانی اهل بیت علیهم السلام
www.ahl-ul-bayt.org

ISBN 964-529-071-6